Venerable Archdeacon Allama Barakat Ullha M.A.F.R.A.S

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰـــنِ الرَّحِيمِ

The grass withers and the flowers fall,
but the word of our God stands forever."
Isaiah 40:8

Authenticity of the Books of the Bible

BY
Allama Barakat Ullha

صحت کُتبِ مقدسہ

ہاں گھاس مرجھاتی ہے ۔ پھول کملاتا ہے پر ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے۔
بائبل مقدس صحیفہ حضرت یسعیاہ ۴۰ : ۸

مولفہ

قسیس معظم آرچڈیکن علامہ برکت اللہ صاحب

1969

فہرست مضامین

دیباچہ
ایڈیشن اوّل دوم

دورَ حاضرہ میں بائبل شریف کی صحت کے ثبوت میں مسیحی علماء بالعموم قرآنی آیات کو پیش کرنے پرہی اکتفا کیا کرتے ہیں ۔ لیکن کتاب مقُدس کی صداقت ایک نہات وسیع بحث ہے جو شہادتِ قرآنی سے بالکل مستغنی ہے۔ یہ ایک علمی بحث ہے جس کا تعلق صحیح تاریخ کے ثابت شدہ واقعات سے ہے اور جس اصول پراصولِ علم تنقید کا اطلاق ہوتاہے۔اس بحث میں قرآن مجید کو صرف اتناہی دخل ہے۔ جتنا دیگر تواریخی شواہد کو دخل ہے۔ ہم نے اس کتاب میں معروضی نقطہ نگاہ کو مدِ نظر رکھ کر تاریخی حقائق کو اپنے مذہبی عقائد کے مطابق نہیں ڈھالا بلکہ مذہبی عقائد کو تواریخی اور خارجی شواہد کی روشنی میں پرکھا ہے اوران کے ماتحت کیا ہے تاکہ حق الامر معلوم ہو۔ اس کتاب میں بائبل اور قرآن دونوں کی شہادت اصولِ تنقید کے مطابق انشاءاللہ اسی طرح پرکھی جائے گی جس طرح دیگر شہادتوں کو پرکھا جاتا ہے ۔ قرآن ایک گواہ ہے جو ان کتابوں کے وجود اوران کی اشاعت کے سینکڑوں برس بعد وجود میں آیا۔ پس اس کی شہادت محض سماعی شہادت کا درجہ رکھتی ہے اور بائبل کادرجہ اس شخص کا سا ہے جو اپنے دعووٗں کے ثبوت میں شہادت پیش کرتا ہے۔ اصوُلِ تنقید عام ہیں جو کسی کی طرفداری نہیں کرتے، خواہ وہ کتاب قرآن ہو یا انجیل ،ژنداوستا ہو یا وید تورات ہو یا بھگوت گیتا ۔ ہر ایک کتاب کی صحت ایک ہی قسم کےان عام تنقیدی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے۔ پس بائبل مقُدس اپنی نیت اور ہستی کے لئے ایسے کسی گواہ کی محتاج نہیں ہوسکتی جوآخری کتاب لکھے جانے کے سات سوسال بعد آیا۔ تنقید و تحقیق

کی نظر سے اس قسم کی ایک نہیں بلکہ ہزار شہادتیں بھی صفر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں کیونکہ اگر مسیحی کُتب مقدسہ کی صحت میں کچھ فرق نہیں آیا تو اگر ایک گواہ سات سو سال بعد پیدا ہو کر کہے کہ یہ کُتب صحیح اور معتبر ہیں تو اس کی گواہی بذاتِ خود کچھ وقعت نہیں رکھ سکتی۔ اور اگر عیسائی اپنی کتابوں کی اصلیت اور حقیقت کے بارے میں چھ سو برس کے اندر کوئی بڑا دھوکا کھا چکے تھے اور ان کی صحت کے متعلق ان کا عقیدہ محض ایک حسنِ ظن کا رتبہ رکھتا تھا تو قرآن کا ان کتابوں کی تصدیق کرنا زیادہ سے زیادہ ایک آواز بازگشت قرار دیا جائے گا۔ پس کُتب سابقہ کے اعتبار یا بے اعتباری کے بارے میں اکیلے قرآن مجید کی شہادت قابل قبول نہیں۔

(۲)

پس لازم ہے کہ ہم از سر نو اُن کتابوں کی تاریخوں کے واقعات پر تنقیدی نظر ڈالیں اور خالص اصولِ روایت وتنقید کے مطابق ان شہادتوں کی جانچ پڑتال کریں جو کُتب مقدسہ اپنی صحت کے ثبوت میں پیش کرتی ہیں۔

اس رسالہ میں ہم نے مختصر طور پر ان ہی تنقیدی اصولوں کے مطابق بائبل شریف کے مجموعہ کو پرکھا ہے اور علمی اصُول کے مطابق ہم نے ان کُتب کی جانچ پڑتال کرکے ان کی صحت کو ثابت کیا ہے۔ چونکہ ہماری صحف سماوی قدیم کتب ہیں جو ہزاروں سالوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ لہذا اس رسالہ میں ہم تفصیل کے ساتھ ان تمام امور پر بحث نہیں کرسکتے جن کی جانچ پڑتال میں نقادوں نے اپنے گرانما عمریں صرف کردیں بلکہ مختصر طور پر ہی ہم تنقیدی اور تاریخی امور پر نظر ڈالیں گے۔ جن کو تحقیق کا شوق ہو وہ ان مستند انگریزی کُتب کا مطالعہ کرلیں جن کی فہرست اس کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔

ہمارا یہ ایمان ہے کہ کتاب مقدس میں خدا کا کلام محفوظ ہے۔ انجیل جلیل میں صاف الفاظ میں ہم کو حکم دیا گیا ہے " جو کوئی تم سے تمہاری امید کی وجہ دریافت کرے اس کو جواب دینے کے لئے ہر وقت مستعد رہو۔(۱۔پطرس ۳: ۱۵)۔ اور ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم کلام کرو تو محبت آمیز الفاظ استعمال کرو(افسیوں ۴: ۱۵)۔ پس اس ارشاد کی تعمیل میں ہم پر یہ فرض ہوجاتاہے کہ اپنے اس ایمان کے مدلل ثبوت محبت آمیز الفاظ میں پیش کریں تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ ہم اپنے اندھا، دھند ایمان کو دریدہ دہنی سے پیش کرتے ہیں۔

ہاں اہلِ اسلام کے نزدیک اس قسم کی تحقیق غیر ضروری ہے کیونکہ وہاں تمام مقدمات کا فیصلہ قال اللہ اور قال الرسول پر ہوتاہے۔ جو لوگ قرآن مجید کو بطور عقیدہ ایمانیہ کے خدا کا کلام مان چکے ہیں جس میں انسانی ذہن اور فکر کو دخل نہیں ان کے نزدیک کوئی بات جو اسکے خلاف ہو قابل قبول نہیں، اس لئے ہم نے ان کی خاطر اس کتاب کے آخر میں رئیس المتکلمین حضرت اکبر مسیح صاحب مرحوم کے مضامین کو جو آپ نے اخبار تجلی میں لکھے تھے بطور ضمیمہ درج کردئیے ہیں تاکہ ان کی تشفی ہوجائے۔

(۳)

واجب تو یہ تھا کہ جس طرح مسیحی کُتب مقدسہ کے مجموعہ میں یہودی انبیائے سلف کے صحیفے موجود ہیں اور مسیحی ان صحائف انبیاء کی تلاوت کرتے ہیں ویسا ہی اسلامی صحف سماوی کے مجموعہ میں یہودی اور مسیحی کُتب مقدسہ کو جگہ ملتی اور اہل اسلام ان کُتب مقدسہ مشتمبلر کُتب عہدِ عتیق وجدید کی بھی اسی طرح تلاوت کرتے جس طرح وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، کیونکہ قرآن نے مسلمانوں کی یہ تعریف بتلائی" یومنون بالکتب کلہ"(آل عمران ع ۱۲) جو ساری کی ساری الکتاب (بائبل) پر ایمان لاتے ہیں۔پھر فرمایا " امنا بالذی انزل علینا وانزل الیکمہ والہنا والھکمہ واحد۔ یعنی " اے مسلمانو۔ تم یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو ہماری طرف نازل ہوا اور اس پر جو تمہاری طرف نازل ہوا۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ پس اہلِ اسلام کا صحفِ سماوی کا مجموعہ

کتُب عہد عتیق وعہد جدید اور قرآن پر مشتمل ہونا چاہیے تھا۔ اگروہ ایسا کرتے تو وہ ان قرآن احکام پر عمل کرتے جو خود حضرت رسولِ عربی کو اور مومنین کو دیئے گئے تھے۔ چنانچہ قرآن میں آنحضرت کو حکم ہوتاہے۔ فان کنت فی شکٍ بما انزلنا الیک فسئل الذین یقرون الکتاب من قبلک ۔ یعنی (اے محمد) اگر تجھ کو اس چیز میں جو ہم نے تیری طرف اتاری کچھ شک ہو توان لوگوں سے پوچھ لیا کر جو بائبل (الکتاب) کو تجھ سے پہلے پڑھتے آئے ہیں (سورہ یونس ع ۱۰)۔ پھر تمام مسلمانوں کو بھی حکم ہوتا ہے۔ فسئلوا ھل الذکران کنتمہ لاتعلمون (اے مسلمانو) اگر تم کو کسی شے کا علم نہ ہو تو بائبل والوں سے دریافت کرلیا کرو۔(سورہ نحل ۴۵)۔ پس واجب تو یہ تھا کہ جس طرح آنحضرت الہیٰ حکم کے مطابق ان لوگوں سے پوچھ لیا کرتے تھے جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تھی اوران کی ہدایت کی پیروی بھی کرتے تھے۔ بحکم ھدی اللہ فبھد اھمہ اقتدہ (سورہ انعام ع ۱۰ وسورہ قصص آیت ۴۸)۔ اسی طرح مسلمان الہیٰ احکام پر چلتے، اگروہ ایسا کرتے اور قرآن مجید کے ساتھ ساتھ الکتاب المقدس کی بھی تلاوت کرتے تو (جیسا ہم اپنے رسالہ " توضیح البیان فی اصول القرآن "میں واضح کرچکے ہیں)۔ ان کو مسائل شرعیہ وغیرہ کے لئے کتُب احادیث وفقہ کی ورق گردانی کرنی نہ پڑتی، اور علمائے اسلام الہیٰ احکام اور سنت نبوی کو محکم طور پر پکڑلیتے لیکن انہوں نے صراطِ مستقیم کو چھوڑ دیا اورکہا نومن بما انزل علینا ویکفرون بماوراء۔(بقر آیت ۸۵) ہم صرف قرآن پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا اوراس کے علاوہ جو نازل ہوا اس کو نہیں مانتے اور قرآن مجید کی عین ضد میں کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان ہے کہ بائبل (الکتاب) میں تحریف اور فتور واقع ہوگیا ہے۔ لیکن خدا ان کو اپنے رسول کی معرفت کہتاہے قل بسما مرکمہ ایمانکمہ ان کنتمہ مومنین ۔(اے رسول) توکہہ دے کہ اگر تمہارا یہی ایمان ہے اور تم ہی ایمان دار ہو تو تمہار ایمان تم کو برا سکھاتاہے۔(بقرع ۱۱)۔

ع اوخویشتن گم است کرارہبری کند؟

اہل اسلام نے اپنے علماء کے بے بنیاد الزام کو قرآن کے احکام وارشادات پر ترجیح دے کر سچ مان لیا اور خدا سے ، اس کے فرستادہ رسول سے اوراس کی کتاب سے روگردانی اختیار کرلی اور کتاب اللہ وارء ظھور ھمہ کانھمہ لایعلمون ۔ انہوں نے خدا کی کتاب بائبل اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دی گویا وہ جانتے ہی نہیں (سورہ بقرہ آیت ۱۰۰)۔ ایسا معلوم ہوتاہے کہ اللہ تعالیٰ نے دورہ حاضرہ کے مسلمانوں کی تنبیہ کے لئے فرمایاہے۔ افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض جزاء من یفعل ذالک منکمہ الامری فی الحیواۃ الدنیاویویمہ القیمتہ یردون الیٰ اشد العذاب کہ تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ پس جو کوئی تم میں سے یہ کام کرتا ہے۔ اس کے سوا ان کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کی رسوائی ہو اور قیامت کےروز نہایت سخت عذاب میں ڈالے جائیں۔(سورہ بقرہ آیت ۸۴)۔

اس رسالہ کے پڑھنے سے انشاء اللہ ناظرین پر واضح ہوجائے گا کہ بائبل شریف کی کتابیں تواریخی شواہد کی رو سے اور اصول ورائت وتنقید کے مطابق صحیح ہیں اور جب مسلمانوں کو اپنی کتاب جس کو وہ خدا کی آواز سمجھتے ہیں اس کی صحت پر رطب اللسان ہیں تو ان کو خائف وترساں ہونا چاہیے۔ مبادا کتابِ مقدس کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کرکے اوراس کی تلاوت کو فضول سمجھ کر وہ خدا کے کلام کے مخالف اور شدید عذاب کے سزاوار ہوجائیں۔

اس کتاب کی پہلی ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ عرصہ پندرہ سال سے احباب دوسرے ایڈیشن کے لئے تقاضا کررہے ہیں۔ لیکن مختلف مصروفیات مانع رہیں۔ اس تاخیر میں بھی پروردگار کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ کیونکہ گزشتہ بیس سالوں میں نہایت قدیم اور اہم قسم کے نئے نسخے اور نئے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جنھوں نے کتُبِ مقدسہ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیاہے۔ ان نئی دریافتوں کا ذکر اس دوسری ایڈیشن میں کیا گیاہے۔

آخر میں میری دعا ہے کہ خدا اس ایڈیشن کو استعمال کرے، تاکہ متلاشیانِ حق اس سے فائدہ اٹھا کر ابدی نجات سے بہرہ اندوز ہوں۔ آمین۔

انار کلی، بٹالہ
یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء　　　　برکت اللہ

دیباچہ
ایڈیشن سوم

تمام حمد و تعریف اسی خدائے واحد کو سزاوار ہے جس کی ذات محبت ہے اور جس نے کلمتہ اللہ، مسیح یسوع کے ذریعہ اپنی ازلی ابدی اور بیکراں محبت کا مکاشفہ ہر گنہگار پر کیا ہے تاکہ وہ اپنے گناہوں کی غلامی سے آزاد ہو کر اس کے دامنِ محبت کو پکڑ کر عافیت حاصل کرلے اور اس سے ابدی رفاقت رکھ سکے۔

آج جب میں یہ سطور رلکھ رہا ہوں تو میں خدا کے فضل و کرم سے اپنی زندگی کی چوہترویں (۷۴) منزل میں قدم رکھ رہا ہوں۔ اس کا شکر ہو جس نے مجھ نالائق کو یہ حق عطا کیا کہ اس سے توفیق حاصل کرکے اپنی زبان اور قلم سے اپنے ہم وطنوں کو عموماً اور مسلمان برادران کو خصوصاً اس کی لازوال محبت کا پیغام دے سکوں۔ میری دعا ہے کہ خدا میری ستاون سالہ ناچیز کوششوں کو بارور کرے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں اور دوسرا ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا۔ اس کے لکھے جانے کے بعد گذشتہ چند سالوں میں عبرانی کُتب مقدسہ کے قدیم ترین نسخے (جو خداوند مسیح سے صدیوں پہلے کے ہیں) ارضِ مقدس سے دستیاب ہوئے ہیں اور انجیل جلیل کے بھی چند قدیم ترین پارے دستیاب ہوئے ہیں جو پہلی صدی مسیحی کے اَواخر میں لکھے گئے تھے۔ علما نے ان نسخوں اور پاروں کا تفصیل دار مطالعہ کیاہے۔ ہم نے ان کے تازہ ترین نتائج کو شامل کردیاہے۔

اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد ہم نے ۱۹۵۵ء میں اناجیل اربعہ کی صحت کے موضوع پر کتاب " قدامت واصلیت اناجیل اربعہ " (دو جلد) لکھی جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ کتاب ہذا کے ناظرین سے التماس ہے کہ اس مضمون پر مزید روشنی حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کی دونوں جلدوں کا بھی مطالعہ کرلیں۔

میری دعا ہے کہ طالبانِ حق میری طرح منجئی جہان کے قدموں میں آئیں اور عاشقانِ کلامِ الہیٰ ان تینوں جلدوں کا مطالعہ کرکے کتابِ مقدس کی بیش از بیش قدر کریں اور خدا کے کلام اور کلمتہ اللہ کے کلماتِ طیبات سے مستفیض ہوکر ان کو حرز جان بنائیں اور آرام جان حاصل کریں۔ آمین

کوہ منصوری۔ ہندوستان	احقر العباد
۱۶ اگست ۱۹۶۴ء	برکت اللہ

حصہ اوّل

صحتِ کُتبِ عہدِ عتیق

مقدمہ

عبرانی کُتبِ مقدسہ کی زبان اور رسم الخط کی تاریخ

عبرانی زبان کا رسم الخط

جب ہم اہلِ یہود کی کُتبِ مقدسہ کی زبان اور رسم الخط پر غور کرتے ہیں تو ہم اس کی نشوونما ترقی اور ارتقاء میں خدا کا ہاتھ دیکھتے ہیں جس میں ہم کو اس کی شانِ پروردگاری نظر آتی ہے۔

(۱)

یہ امر قابلِ غور ہے کہ عبرانی زبان حروفِ تہجی پر مشتمل ہے۔ قدیم زمانہ میں بعض ممالک مثلاً چین۔ اسیریا وغیرہ مہذب ممالک تھے لیکن ان مہذب ممالک کے رسم الخط میں حروف تہجی نہیں تھے۔ حروف تہجی کا یہ فائدہ ہے کہ اس کا حرف ایک خاص قسم کی آواز کو ادا کرتا ہے اور مختلف حروف مل کر لفظ یا لفظ کا جز بنتے ہیں لیکن اسیریا کے رسم الخط میں حروف تہجی نہیں تھے۔ بلکہ اس ملک کے لوگوں کا رسم الخط "خطِ تمثال" تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خط مختلف اقسام کی آوازوں کو ایسا ادا نہیں کرسکتا جس طرح حروف تہجی ادا کرسکتے ہیں۔ بلکہ وہ اس خط کے ذریعہ مختلف اشیاء کو صرف ان کی تصویریں یا شکلیں کھینچ کر ہی ظاہر کرسکتے تھے اور اظہارِ مطلب کے لئے ہر لفظ کی بجائے تصویر کھینچنی پڑتی تھی۔ مثلاً اگر یہ لکھنا مقصود ہوتا کہ فلاں برتن نوکر کے ہاتھ بھیج دو تو برتن کی اور نوکر کی اور اس کو لانے کی تصویریں

بنائی جاتیں۔ پس اگر کچھ تھوڑی سی عبارت بھی لکھنی پڑجاتی تو ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں کہ بیچارے کاتب کو کتنی شکلیں کھینچنا پڑتی ہوں گی۔

اگر اہلِ یہود کی کُتبِ عبرانی رسم الخط کی بجائے اسیریا کے رسم الخط میں لکھی جاتیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ کیونکہ بابل کی تہذیب حضرت ابراہیم سے بہت پہلے ملکِ کنعان میں جاری وساری ہوچکی تھی۔ طل الامرنہ کی الواح پر مختلف ممالک کے سفیروں کی خط وکتابت ہم کو دستیاب ہوئی ہے۔ یہ خطوط ملکِ کنعان سے مصر کو سیدنا مسیح سے پندرہ سو سال پہلے روانہ کئے گئے تھے اور بابلی زبان کے خطِ میخی میں لکھے ہوئے ہیں جس کے مختلف حروف پیکان یا میخ کی شکل میں لکھے ہوتے تھے پس اگر اہلِ یہود اپنی کُتب کو خط تمثال یا خطِ میخی میں لکھتے جو ملک کنعان میں مروج تھے تو جائے تعجب نہ ہوتا۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ انہوں نے یہ دونوں رسم الخط اختیار نہ کئے بلکہ عبری رسم الخط اختیار کیا جو حروف تہجی پر مشتمل ہے اور جس میں ہر حرف ایک خاص قسم کی آواز کو ادا کرتا ہے۔ اگر ان قدیم الایام رسم الخطوں میں سے کسی ایک کو بھی یہودی کُتب مقدسہ کے لکھنے کے وقت اختیار کیا جاتا تو ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں کہ دورِ حاضرہ میں ان کُتب کو ان کی اصلی زبان میں پڑھنا کس قدر جان جوکھوں کا کام ہوتا اور ان کے ترجمہ کرنے میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ دنیا کے ہر کونے میں اسی طرح ہر گز نہ پہنچ سکتیں جس طرح وہ اب اطراف واکنافِ عالم میں پہنچ گئی ہیں۔ لیکن خدا کو یہ منظور تھا کہ وہ اہل یہود کے ذریعہ اس عالم میں اپنے علم کا نور پھیلائے لہذا اس کے دستِ حکمت نے ملہم مصنفین کی رہنمائی اور یہودی کُتبِ مقدسہ عبرانی رسم الخط کے حروف میں احاطہ تحریر میں آئیں۔

قدیم ایام ہی سے اہلِ یہود کے آباواجداد کے پاس کسی شے کو معرض تحریر میں لانے کے ذرائع اور وسائل مہیا تھے، کیونکہ شمالی سامی زبان کے حروفِ تہجی حضرت موسیٰ سے مدتوں پہلے رائج تھے جن کا نمونہ سترہ سو سال قبل مسیح کی تحریرات ہیں، جو اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ خود حضرت موسیٰ نہ صرف خواندہ تھے (توریت شریف کتابِ گنتی ۳۳: ۲ تا آخر) بلکہ وہ مصر کی طرز تحریر اور علمِ ادب میں بھی بخوبی دسترس رکھتے تھے۔ (اعمال الرسل ۷: ۲۲)۔ یہ امر جائے غور ہے کہ جب اہل یہود کے آباؤ اجداد کی ہمعصر اقوام جو ان کی سی تہذیب رکھتی تھیں مسیح سے چار ہزار سال پہلے خواندہ تھیں اور نوشت وخواند کیا کرتی تھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم یہود کے آباؤ اجداد نوشت وخواندہ کی نعمت سے محروم رہ گئے[1] ہوں۔ پس جہاں تک عہدِ عتیق کی کُتبِ مقدسہ کا تعلق ہے ان کی صحت کا انحصار صرف سینہ بہ سینہ زبانی روایات پر نہیں ہے۔ اس کا مفصل ذکر ہم انشاء اللہ آگے چل کر باب چہارم کے شروع میں کریں گے۔

ان کُتب مقدسہ سے ظاہر ہے کہ خدا کا ابدی ارادہ یہ تھا کہ اہلِ یہود کے ذریعہ اپنا علم دنیا کے ہر گوشہ میں اور روئے زمین کی اقوام کے ہر فرد تک پہنچائے (یسعیاہ ۴۹: ۶، ۱۹: ۲۳، ۵۶: ۶ وغیرہ) پس اس نے اس مقصد کو انجام دینے کے لئے تمام قدیم زبانوں میں سے عبرانی زبان کو چن لیا تاکہ اس زبان کے ذریعہ اس کا پیغام اس کی مخلوق تک پہنچ جائے۔

عبرانی زبان کی خصوصیات

قدیم زمانہ میں عبرانی زبان دیگر تمام مروجہ زبانوں سے زیادہ سادہ مغلق الفاظ سے پاک، دلکش اور لطیف تھی۔ اس زبان کے فقروں کی ساخت بھی نہایت سادہ، بے تکلف اور تصنع سے خالی تھی۔ اس کے فقرے دیگر زبانوں کی طرح طویل نہیں ایسا کہ اس کے مختلف اور متعدد اجزا ہوں جو مل کر لمبے چوڑے مرکب جملے بنیں۔ اس زبان کے فقرے مختصر، سادہ

[1] The New Bible Dictionary. Art Text and versions of O.T

اور چھوٹے ہیں اور عبارت میں آسانی سے ربط کھا کر منسلک ہوجاتے ہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی ان کو پڑھنے والا اکتاتا نہیں بلکہ دلچسپی سے پڑھتا چلا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں عبرانی زبان منطقیانہ ، اور فلسفیانہ اصطلاحات سے پاک ہے۔ اہلِ یہود نہ منطقی تھے اور نہ فلسفیانہ مسائل کی طرف ان کی طبائع راغب تھیں بقولِ حافظ

حدیث از مطرب دمے گوو راز دہر کمتر جو

کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمہ را

اسرائیلیوں کے لئے " خداوند کا خوف حکمت کا شروع ہے۔"وہ ممالک ہند اور یونان کی طرح دہر کے رازوں اور معموں کی کشود گی اور مافوق الطبیعات مسائل کی جستجو میں حیران وسر گرداں نہیں رہتے تھے ۔ پس عبرانی زبان تمام حکیمانہ ، منطقیانہ اور فلسفیانہ اصطلاحات سے پاک، اور نہایت سادہ دلکش اور لطیف زبان ہے۔

خدا نے اس زبان کو تمام قدیم زبانوں میں سے چن لیا تاکہ اس کے ذریعہ اپنا مکاشفہ اپنی مخلوق پر ظاہر فرمائے ۔ چونکہ یہ زبان سادہ ہے اس کے الفاظ سادہ اور فلسفیانہ اصطلاحات سے پاک ہیں ، اس کے فقرے مرکب ہونے کی بجائے سادہ اور مختصر ہیں اور اس کی عبادت آسان اور لطیف ہے۔ پس خدا کے دست حکمت نے ایسی زبان کو چنا جو نہایت آسانی سے دنیا کی تمام دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اب تک کُتُب مقدسہ کا ترجمہ دنیا کی ایک ہزار دو سو بارہ زبانوں میں ہوچکا ہے۔ خدا کا مکاشفہ ان تراجم کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکا ہے اور دور حاضرہ میں کل دنیا کے چھیانوے فی صد اشخاص کلامِ خدا کو اپنی مادری زبان میں سن اور پڑھ سکتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان ترجموں میں بھی وہی سادگی اور لطافت پائی جاتی ہے جو اصل زبان میں ہے کیونکہ اصل زبان خود سادہ مختصر دلکش اور لطیف ہے۔

عبرانی تحریرات کِن اشیاء پر لکھی جاتی تھیں؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں عہد عتیق کی کتابیں کس شے پر لکھی جاتی تھیں؟آثارِ قدیمہ سے ظاہر ہے کہ قدیم زمانہ میں مصر کے لوگ پے پائرس (یعنی نرسل کی قسم کے درخت جو پانی میں ہوتے تھے) کے بنے ہوئے ورق یعنی قرِطاس (جمع قراطیس) پر لکھا کرتے تھے۔ کنعان میں مٹی کی الواح پر تیز نوکدار لوہے کی قلم سے لکھا جاتا تھا جس کو بعد میں آگ میں پکا کر سخت کرلیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں یہی تختیاں رائج تھیں(خروج) چند سال ہوئے بیت شمس سے قدیم ٹھیکرے دستیاب ہوئے جو ساڑے تین ہزار سال پرُانے ہیں اور جن پر قدیم عبری الفاظ کندہ ہیں۔ انبیائے یہود کے زمانہ میں کُتُب مقدسہ کے لکھنے کے لئے جھلی بھی استعمال کی جاتی تھی جو بچھڑے کے چمڑے سے لکھنے کے لئے تیار کی جاتی تھی۔ پس عبرانی کُتُب مقدسہ مختلف زمانوں میں الواح پر ، چمڑے پر اور پے پائرس کے ورقوں پر لکھی اور نقل کی جاتی تھیں ۔(یرمیاہ ۱۷: ۱ ، یسعیاہ ۸: ۱ ، یرمیاہ ۳۶: ۲ ،۱۸: ۲۳، حزقی ایل ۲: ۹ تا ۱۰ وغیرہ)۔

عبرانی زبان کے مختلف دَور

ہم ذیل میں اہلِ یہود کی زبان اور رسم الخط کی مختصر تاریخ ناظرین کی واقفیت کی خاطر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے مختلف دوَروں کو جن کا ذکر اس رسالہ میں کیا جائے گا بخوبی سمجھ سکیں۔

عبرانی زبان چند دیگر زبانوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے یعنی فینیکی زبان کے ساتھ اور موآبیوں کی زبان کے ساتھ جس کا نمونہ میثا کا کتبہ (۸۰۰ قبل مسیح) ہے (۲ سلاطین ۱: ۱ ، ۳: ۴۔ ، ۲ تواریخ ۲۰ باب) اس کا تعلق اس کنعانی زبان کے ساتھ بھی ہے جو عبرانیوں کے حملہ سے پہلے کنعان میں بولی جاتی تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ فاتح

اسرائیلیوں نے اپنے مادری زبان کو (جو عربی سے تعلق رکھتی تھی) چھوڑ کر مفتوحین کی زبان اختیار کرلی۔ بہر حال جب فاتحین نے سر زمین کنعان میں رہائش اختیار کی تو ان کی کُتبِ ادبیات عبرانی زبان میں ہی لکھی جاتی تھیں اور عبرانی ان کی روزمرہ بول چال کا وسیلہ تھی۔

لیکن عبرانی قوم کی تاریخ میں ایک وقت ایسا آیا جب ان کی روزمرہ بول چال کا وسیلہ عبرانی نہ رہی اور ارامی زبان نے اس کی جگہ غضب کرلی۔ اب عبرانی ادبیات کے لئے ہی مخصوص ہوگئی۔ ہم یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس وقت ارامی زبان نے عبرانی زبان کی جگہ غضب کرلی۔ گمان غالب یہ ہے کہ بتدریج ہی ایسا ہوا ہوگا۔ ۲ سلاطین ۱۸: ۲۶ سے ظاہر ہے کہ حضرت یسعیاہ نبی کے وقت (آٹھویں صدی قبل مسیح) اسرائیل عوام الناس ارامی زبان سے ناآشنا تھے لیکن شامی اور یہودی عمائد وارا کین اس کا استعمال کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نحمیاہ کے زمانہ میں بھی (پانچویں صدی قبل مسیح) کنعانی یہودیوں کی زبان عبرانی تھی (نحمیاہ ۱۳: ۲۴) لیکن پہلی صدی مسیحی میں اسرائیل عوام الناس کی زبان ارامی تھی، کیونکہ عہدِ جدید کی کُتب میں ارامی فقرے ہم کو ملتے ہیں۔ مثلاً "تالیتھا قومی" وغیرہ۔ پس عوام الناس نے پانچویں صدی قبل مسیح اور پہلی صدی مسیح کے درمیان عبرانی چھوڑ کر ارامی زبن کو اپنی روزمرہ کی بول چال کا وسیلہ بنایا۔ یہ امر ہم پر زیادہ واضح ہوجاتا ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ عتیق کی ان کُتب پر ارامی زبان کا اثر موجود ہے جو متاخرین نے لکھی تھیں اور اس سے پیشتر کے زمانہ میں ارامی الفاظ عبرانی زبان میں اس طرح دخل پاتے جاتے تھے جس طرح ہندوستان میں برطانوی زمانہ سے انگریزی الفاظ اردو زبان میں داخل ہوگئے ہیں۔

ارامی زبان کے علاوہ اسیریا کی زبان نے ابتدا ہی سے عبرانی کو متاثر کر رکھا تھا۔ ۵۳۸ قبل مسیح میں جب بابل کے فاتحین اہل یہود کو اسیر کرکے لے گئے تو ایرانی زبان نے ان پر اپنا اثر ڈالا۔ ۳۳۲ قبل مسیح میں سکندر اعظم کے زمانہ کے بعد یونانی زبان نے اہل یہود اوران کی زبان کو متاثر کیا اور مسیح سے قبل ایک سو سال جب یہودیہ روم کے ماتحت ہوگیا تو لاطینی زبان نے اہل یہود کے خیالات اور زبان پر اثر ڈالا۔

عہدِ عتیق کی کتابیں باستثنائے چند اوراق عبرانی زبان میں تحریر کی گئی تھیں اور تاحال اسی زبان میں محفوظ ہیں۔ صرف یرمیاہ ۱: ۱۱ و دانی ایل ۲: ۴تا ۷: ۲۸، عزرا ۴: ۸ تا ۶: ۱۸، ۷: ۱۲: ۲۶، ارامی زبان میں ہیں۔

(۲)

عبرانی کُتبِ مقدسہ کے مجموعہ کی کتابیں سیدنا مسیح سے کئی صدیاں قبل مختلف زمانوں میں لکھی گئیں۔ اب علم آثارِ قدیمہ بھی ان کی تاریخ تصنیف پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کُتب کے عبرانی الفاظ، الفاظ کی ساخت اور توازن نحوی تراکیب، اسلوبِ بیان، طرز ادائیگی، خاص خاص محاورات، مضامین، تخیل، رنگ، تشبیہات اور تلمیحات وغیرہ ہیں اختلاف ہے کیونکہ مختلف کتابیں عبرانی زبان کی ارتقا اور ترقی کی مختلف منازل کے دوران لکھی گئیں۔ اب آثارِ قدیمہ کے مختلف کتبوں اور دریافتوں کی مدد سے بھی پتہ چل سکتا ہے کہ ارضِ مقدس کنعان میں عبرانی کے کون سے الفاظ کس صدی اور کس دوَر میں رائج تھے اور یوں عبرانی زبان کی تاریخ کے مختلف دوَروں کا زمانہ متعین کیا جاسکتا ہے۔

اس بات کو ناظرین ایک چھوٹی سے مثال سے سمجھ جائینگے۔ سیدنا مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال قبل شمال کی سامی زبانوں کے الفاظ کے آخر حرف "م" (میم) کو گرادیا جاتا تھا۔ مثلاً کلیم (بمعنی کتا) کے لفظ کے آخری میم کو حذف کرکے "کلب" لکھا جانے لگا۔ گو عربی کی طرح وہ کلبُ، کلبِ، کلبَ، حسب ضرورت اور معنی لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہام کے زمانہ اور حضرت موسیٰ کے زمانہ کی عبرانی زبان کے دوَروں میں یہ فرق بڑا اہم شمار کیا جاتا ہے۔ پندرہویں اور چودھویں صدی قبل مسیح میں عبرانی لفظوں کے آخر میں حرف میم لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ طل الامرانہ کی تختیاں، یوگرت کی نظمیں اور کنعانیوں کے نام

جن کا ذکر قدیم مصریوں نے کیاہے اس بات کا بدیہی ثبوت ہیں۔ لیکن مصری عبارتیں ثابت کردیتی ہیں کہ تیرھویں صدی قبل از مسیح کے آخر اور بارھویں صدی میں کنعانی زبان سے حرف میم حذف ہونا شروع ہوگیا تھا۔ دبورہ کا گیت (۱۱۳۵ قبل مسیح) ثابت کردیتا ہے کہ بارھویں صدی قبل از مسیح میں حرف میم کا استعمال بالکل متروک ہوگیا تھا۔ اسی زمانہ میں ٹکسالی عبری زبان کی نشوونما بھی ہورہی تھی جو دسویں صدی قبل از مسیح میں اپنے عروج پر پہنچی۔آثارِ قدیمہ کے ماہرین اس زبان کی ترقی کی مختلف منازل بتلاسکتے ہیں۔

اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے ہم اردو زبان کے ارتقا کی مختلف منازل کو مثال کے طور پر لیتے ہیں۔ اس زبان کا ابتدائی زمانہ دھندلاہے اور اس دھندلکے میں پہلا شاعر جو صاف طور پر دکھائی دیتاہے وہ طوطی ہند امیر خسرو ہے۔ اس کے بعد یہ زبان بتدریج پختہ ہوتی ہوگئی اور آہستہ آہستہ نشوونما، مضبوطی قوت۔لوچ اور وسعت حاصل کرتی گئی۔ متقدمین کے دورَ کے بعد متوسطین اور پھر متاخرین کا دورَ اور اب زمانہ جدید کا دور شروع ہواہے۔ ان مختلف دوروں میں اردو کے الفاظ ، ترکیب ، طرز بیان ، بند شِ مضامین وغیرہ میں زمین آسمان کا فرق نمودار ہوگیاہے۔ اردو علم ادب کا نقاد اس زبان کی تاریخ کی روشنی میں بتلاسکتا ہے کہ فلاں کتاب یا نظم کس زمانہ سے متعلق ہے۔ مثلاً امیر خسرو کی شاعری " خدائے سخن" میر انشا کی شاعری ، غالب کی شاعری اوراقبال کی شاعری میں ہم اردو زبان کے مختلف مرحلوں اورمنزلوں کو بآسانی تمام دیکھ سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ امیر خسرو کی شاعری اور اقبال کی شاعری میں صبح کاذب اور آفتاب نصف النہار کاسا فرق نمودار ہوجاتاہے۔

اسی طرح ہم عبرانی کُتُبِ مقدسہ کے نظم ونثر کے حصوں کے الفاظ ، نحوی تراکیب، مضامین کی پختگی ، زبان کی لوچ، صنائع اور بدائع وغیرہ سے معلوم کرسکتے ہیں کہ فلاں عبرانی کتاب عبرانی زبان کی تاریخ کے فلاں دورَ سے متعلق ہے۔ مثلاً دسویں صدی قبل مسیح کے جزیر کی شاہی دستاویزوں (Gezer Calendar) سے ہم کو یہ معلوم ہوجاتاہے کہ حضرت داؤد کی وفات اورسلیمان بادشاہ کی تخت نشینی (۲ سیموئیل) سے پہلے کی عبری نثر کس قسم کی تھی۔ ہم جان سکتے ہیں کہ عبرانی کُتُب مقدسہ کی ٹکسالی عبرانی نثروہ ہے جو یروشلیم میں سیدنا مسیح سے دس اور نو صدیاں پہلے بولی جاتی تھی۔ان دستاویزوں اور فینیکی کتبوں کی مدد سے ہم قدیم نظموں مثلاً ۲ سیموئیل ۲۲ باب (زبور ۱۸) کے زمانہ تحریر کو بھی متعین کرسکتے ہیں۔سامریہ کے "آسترا کا" سے (Ostraca) جن کا تعلق آٹھویں صدی قبل مسیح سے ہے ہم کو یہ پتہ چل سکتا ہے کہ ہوسیع نبی کے زمانہ میں عبری حروف اور املاوغیرہ کس قسم کے تھے۔شیلوخ کا کتبہ (۷۰۰ قبل مسیح) یسعیاہ نبی کے زمانہ کی عبری زبان کےہجا اور طرز تحریروغیرہ پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالتاہے اوراس سے بھی زیادہ واضح طورپر لکیش کا" آسترکا" یرمیاہ نبی کی کتاب کی زبان، ہجا، رسم الخط اور تحریر وغیرہ پرروشنی ڈالتاہے۔

آثارِ قدیمہ کاعلم اس امر کی تصدیق کرتاہے کہ کُتُب تواریخ عزرا، دانی ایل اور نحمیاہ کی زبان وہی ہے جو منجئی سے قبل پانچویں اور چوتھی صدی کے اوائل میں بولی جاتی تھی۔ ہم کو یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں یہود کی اسیری کے بعد عبرانی کی بجائے ارامی زبان حیرت انگیز طور پر ترقی کی گئی۔آثارِ قدیمہ کاعلم ارامی زبانوں کی مختلف منازل کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی قبل مسیح کے مرتبانوں کے دستے یا موٹھ(ہینڈل) ملے ہیں جن پر ارامی حروف کی مہریں ثبت ہیں۔حالانکہ اس سےپہلے ان پر عبرانی حروف ہوا کرتے تھے۔ جس سے ظاہر ہے کہ جیسا ہم سطور بالامیں ذکر کرچکے ہیں اس زمانہ میں ارامی زبان تمام مغربی ایشیا میں رواج پارہی تھی حتیٰ کہ یہ زبان منجئی عالمین کے وقت ارضِ مقدس کے رہنے والے یہودیوں کی مادری زبان بن چکی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں ایک کتبہ دستیاب ہوا جو زیتون کے پہاڑ کے روسی عجائب خانہ میں محفوظ ہے ۔ یہ ارامی زبان کے ان حروف میں لکھا ہے جو سیدنا مسیح کے زمانہ میں پہلی صدی میں رائج تھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اہلِ یہود ارامی زبان میں نوشت وخواند کیا کرتے

تھے۔ظاہر ہے کہ اس سوال کا اناجیل اربعہ کی اصل زبان سے بھی گہرا تعلق ہے۔ لیکن یہ موضوع الگ ہے جس پر ہم نے اپنی کتاب " قدامت و اصلیت اناجیل اربعہ" کی دو جلدوں میں بالتفصیل مبسوط بحث کی ہے۔

آثارِ قدیمہ کی روشنی میں یہ ثابت کردیا ہے کہ متعدد زبور قدیم وقتوں کے ہیں اور مسیح سے دس صدیاں پہلے کی تصنیف ہیں۔ پس کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان میں سے بہت سے مزمور حضرت داؤد کے زمانہ کے نہ ہوں۔ موجودہ دریافتوں نے ہم پر یہ بھی ظاہر کردیا ہے کہ کوئی مزمور چوتھی صدی مسیح کے بعد کا نہیں ہے۔ مصری اور سمیری امثال کے مجموعہ نے (جو مسیح سے تین ہزار سال پہلے کا ہے ثابت کردیا ہے کہ امثال کی کتاب کم ازکم اسیری کے زمانہ سے پہلے کی ہے اور ایواب کی کتاب مسیح سے پانچ یا چھ صدیاں پہلے کی ہے اور واعظ کی کتاب سیدنا مسیح سے تین صدیاں پہلے کی ہے۔ غرضیکہ ہم آثارِ قدیمہ کی مدد سے بھی عبرانی زبان کے مختلف دوروں کی تاریخ کی روشنی میں مختلف کُتبِ مقدسہ کا زمانہ متعین کرسکتے ہیں۔

عبرانی زبان کے مختُلف رسم الخط

عبرانی زبان کا موجودہ رسم الخط وہ نہیں جو پہلے رائج تھا یہ قدیم رسم الخط فینیکی زبان اور سامری زبان کے رسم الخط کی مانند تھا۔ یہ قدیم عبرانی رسم الخط سامری نسخہ، تورات میں محفوظ ہے جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ قدیم عبرانی رسم الخط (جو عبری کہلاتاہے) کے تمام حروف (سوائے چار حروف کے) مکابی زمانہ کے سکوں پر ملتے ہیں۔ عبرانی کے یہ دونو رسم الخط ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر حرف یود (ی) موجودہ عبرانی رسم الخط میں سب سے چھوٹا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا مسیح نے متی ۵: ۱۸ میں (جہاں اردو میں اس کا ترجمہ "شوشہ" کیا گیا ہے) اس کو استعمال کیا تھا۔ لیکن قدیم عبری رسم الخط میں حرف ی تقریباًسب سے بڑا حرف تھا۔

جس طرح ہم یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کنعان میں ارامی زبان نے عبرانی کی جگہ کب غضب کرلی، اسی طرح ہم یقینی طور پر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جدید رسم الخط نے قدیم کی جگہ کب لے لی۔ غالباً یہ تبدیلی بتدریج وقوع میں آئی تھی۔ اگرچہ اہل یہود کا قول ہے کہ یہ تبدیلی حضرت عزرا کے زمانہ میں واقع ہوئی تھی۔ غالباً حقیقت یہ ہے کہ ارامی نے پوری طرح سے عبری حروف کی جگہ سیدنا مسیح سے ڈیڑھ یا دو سو سال پہلے چھین لی تھی اور سیدنا مسیح کے زمانہ میں یہی جدید حروف مروج تھے۔ صرف سامریوں نے ان جدید حروف کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ وہ فخریہ کہتے تھے کہ ان کی تورات انہی قدیم حروف میں تاحال موجود ہے۔

یہ عجب حسن اتفاق ہے کہ یہود کی کُتب مقدسہ کے رسم الخط اور اہلِ اسلام کے قرآن مجید کے رسم الخط میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ چنانچہ مرزا سلطان احمد صاحب دہلوی اپنے رسالہ تصحیفِ کا تبین میں لکھتے ہیں کہ " وفیات الاعیان کی روایت کے بموجب ہجرت کے تین سو برس بعد خطِ نسخ میں قرآن مجید لکھا اور چوتھی صدی ہجری میں علی بن بواب نے خط نسخ میں بہت سے ایجاد کئے مگر اب ہر ملک میں جو خط نسخ میں قرآن پائے جاتے ہیں یہ خلیفہ مستعصم باالله کے کاتب دیوان یا قوت کے خط کی نقول ہیں جس کا زمانہ خلافت ۶۴۰ھ سے ۶۵۶ ہجری تک رہا۔

باب اَوّل

تصحیفِ کاتبین

فصل اوّل

کیا عبرانی رسم الخط کی وجہ سے کُتب مقدسہ میں فتور واقع ہوا ؟

عبرانی رسم الخط کے متعلق چند امور ایسے ہیں جن پر بحث کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

اِعراب کی عدم موجودگی

پہلا قابل غور امر یہ ہے کہ عبرانی الفاظ بغیر اعراب کے یعنی بغیر کسی زیروزبر اور پیش وغیرہ لکھے جاتے تھے اور خصوصیت قدیم اور جدید رسم الخط کی ہے۔ موجودہ کُتب مقدسہ میں یہ علامتیں لگادی گئی ہیں۔ لیکن ان کا وجود چھٹی یا ساتویں صدی مسیحی سے پہلے نہیں ملتا۔ مقدس جیروم کی تحریرات سے صاف ظاہر ہوتاہے کہ اس کے زمانہ میں یہ علامتیں کُتب مقدسہ میں موجود نہیں تھیں۔ لیکن یہ علامتیں نوویں یا دسویں صدی کے تمام عبرانی نسخوں میں پائی جاتی ہیں۔ پس اس امر کا امکان رہ جاتاہے کہ ان علامتوں کے اَدل بَدل سے کُتب کے متن کی صحت پر اثر پڑجائے۔ یونانی ترجمہ سبعینہ یعنی (سیپٹواجنٹ) میں (جس کاذکر آئندہ کیا جائے گا) اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً عبرانی حروف "پ، س، گ، ہ سے لفظ" پسگہ" عبرانی میں پِسگہ لکھاہے ۔ لیکن یونانی میں پسگہ ہے (استثنا ۳۴: ۱) اسی طرح پیدائش ۱۵: ۱۱ میں عبرانی الفاظ جن کا ترجمہ اردومیں" انہیں ہانکا" کیا گیاہے، علامتوں کے اَدل بدَل کی وجہ سے یونانی ترجمہ میں" انہیں ہانکا" کیا گیا ہے، علامتوں کے ادَل بدَل کی وجہ سے یونانی ترجمہ میں" ان کے ساتھ بیٹھ گیا" ہوگیا۔استثنا ۲۸: ۲۲ میں علامتوں کے ادَل بدَل سے ایک ہی عبرانی لفظ کا ترجمہ" تلوار" موجودہ اردو ترجمہ اور "خشک سالی" (پرانا اردو ترجمہ) ہوسکتا ہے ۔پیدائش ۴۹: ۵ میں ایک ہی عبرانی لفظ کا ترجمہ " مکاریاں" (پرانا ترجمہ) اور "تلواریں" (نیا ترجمہ) ہوسکتاہے اور یہ اعراب کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔

۱ سلاطین ۱۰: ۲۸ میں آیاہے " جو گھوڑے سلیمان کے پاس تھے وہ مصر سے منگائے گئے تھے اور بادشاہ کے سوداگر ایک ایک جھنڈ کی قیمت لگا کر ان کے جھنڈ لیا کرتے تھے"۔ جس عبرانی لفظ کا ترجمہ اردو میں"ایک جھنڈ" اور " جھنڈکے جھنڈ" کیا گیا ہے وہ لفظ قھوہے اور حروف" ق، ہ، و" پر مشتمل ہے۔ حرکات کی تبدیلی سے یہ لفظ ایک جگہ کا نام ہوجاتا ہے اورمذکورہ بالاآیت کا ترجمہ یہ ہوجاتاہے " اور جوگھوڑے سلیمان کے پاس تھے وہ مصر اور قھو سے منگائے گئے تھے" اوریہی ترجمہ لاطینی ولگیٹ اور یونانی سیپٹواجنٹ کا ہے۔ اس ترجمہ کوآثارِ قدیمہ کی معلومات سے بھی تقویت ملتی ہے کیونکہ قھو کا مقام ذکر کے کتبہ میں درج ہے جو سلیشیا کے علاقہ میں تھا۔ اس مقام کا پتہ ہم کو اسوری دستاویزوں سے بھی ملتا ہے۔

بادی النظر میں عبرانی الفاظ پر اِعراب کی عدم موجودگی کُتبِ مقدسہ کی صِحت پر بہت اثر ڈال سکتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ خیال ایک بڑی حد تک غلط اور بے بنیاد ثابت ہوجاتا ہے ۔ مثال کے طور پر اردو زبان کے الفاظ کو لے لو۔ اردو کی عبارت بالعموم بغیر اعراب یعنی بغیر زیر، زبر اور پیش کے لکھی جاتی ہے۔ مثلاً سرَ(جسم کے اوپر کا حصہ) سِر (راز)سرُ(گانے کی رات ، ناف،خوشی)لوٹنا (عاشق ہوجانا) لوَٹنا (واپس آنا)لوُٹنا (غارت گری کرنا) اَن (کلمہ نفی) اَنّ(غذا)۔ اُن (اسم اشارہ)اِن (تحقیق۔ علمَ (بمعنی جھنڈاء) علم (بمعنی جاننا) ایسے الفاظ کی علامتوں کے ادَل بدَل سے ان کا مطلب خبط ہوسکتا ہے لیکن کیا کسی اردو خواں کو اردو پڑھتے وقت اِن علامتوں کی عدم موجودگی نے کسی طرح کی

مشکل میں ڈالا ہے ؟ یا اس کو عبارت کے سمجھنے میں کبھی دقت پیش آئی ہے ؟ ہر گز نہیں۔ توپھر کیوں یہ خواہ مخواہ فرض کرلیا جائے کہ عبرانی کُتبِ مقدسہ کے الفاظ پر ان علامتوں کی عدم موجودگی اتنا اثر کردیگی کہ ان کی صحت ایک مشکوک امر ہوجائے گا؟

پس جس طرح ہم وثوق کے ساتھ بغیر کسی علامت کے اردو پڑھ سکتے ہیں اور اردو عبارت کی نقل کرسکتے ہیں اوراس کو سمجھ سکتے ہیں اسی طرح (بلکہ اس سے بھی زیادہ وثوق کےساتھ) اہل یہود اپنی عبرانی کُتب مقدسہ کو پڑھ اور لکھ سکتے تھے اور بغیر کسی علامت کے ان کا مطلب کماحقہ، سمجھ سکتے تھے۔ ہم نے الفاظ " اس سے بھی زیادہ وثوق کے ساتھ" اس واسطے لکھے ہیں کیونکہ اہلِ پنجاب کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن کُتبِ مقدسہ کی زبان اہل یہود کی مادری زبان تھی۔ پس وہ اپنی مادری زبان کو بخوبی پڑھنے لکھنے سمجھنے اور حتی المقدور صحیح نقل کرنے پر قادر تھے۔

علاوہ ازیں جب ہم اردو کی عبارت پڑھتے ہیں تو علامتوں کی عدم موجودگی میں سباق وسیاق کی وجہ سے ہم مختلف حروف کے ساتھ حرکات وسکنات کو معلوم کرلیتے ہیں۔ سباق وسیاق نے ہم کو بتلادیا کہ فلاں جگہ فلاں زبر کے ساتھ پڑھنا چاہیے یا زیر یا پیش کے ساتھ۔ اسی طرح اہل یہود جب اپنی کُتبِ مقدسہ کی تلاوت اور نقل کرتے تھے تو عبارت کا سباق وسیاق ان کا رہنما ہوتا تھا اور وہ حروف کو غلط حرکت دیئے بغیر الفاظ کو صحت اور درستی کے ساتھ پڑھنے اور نقل کرنے پر قادر تھے۔

اس میں شک کچھ نہیں کہ بعض اوقات کسی لفظ کی مختلف حرکات ایک ہی سباق وسیاق کے مطابق کے ہوسکتی ہیں اور یوں وہ لفظ ذومعنی ہوکہ سباق وسیاق کے مطابق ہوجاتا ہے اور یہ معلوم کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ دونوں میں سے کونسا لفظ اس خاص موقع پر چسپاں کرنا چاہیے مثلاً عبرانی حروف" ھ م ت ت ھ" جو پیدائش ۴۷: ۳۱ میں مستعمل ہوئے ہیں دو طرح پڑھے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ ھِمتہ پڑھا جائے تو اس کا مطلب "بستر کا سرہانہ" ہے۔ لیکن اگر ھَمتہ پڑھاجائے تو اس کا مطلب "عصا" ہے۔ چنانچہ سیپٹواجنٹ کا ترجمہ یہی ہے جس کا اقتباس عبرانیوں کے خط ۱۱: ۲۱ میں کیا گیاہے۔ یہاں دومعنی ایک ہی عبارت کے سباق وسیاق کے مطابق ہوسکتے ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ کونسی علامتیں درست ہیں۔ ہر سلیم الطبع شخص اس بات کوقبول کرنے کو تیار ہوگا کہ اس قسم کے مواقع شاذو نادر ہی ہوتے ہیں کہ ایک ہی لفظ مختلف حرکات اور علامات کی وجہ سے ایک ہی عبارت کے سیاق وسباق کے مطابق ہوسکے اوراس کے مختلف مطالب ومعانی ایک ہی سباق وسیاق پر اس طورپر چسپاں ہوسکیں کہ یہ معلوم نہ ہوسکے کہ بیان کا طرز اور سیاق وسباق کس لفظ کے خواہاں ہیں۔ پس کُتبِ عہد عتیق کی صحت پر اس کا اثر کم از کم اتنا نہیں پڑسکتا کہ ان کا مطلب خبط ہوجائے اور وہ پایہ اعتبار سے ساقط ہوجائیں۔

لیکن جب ایسے شاذونادر مواقع رونما ہوتے ہیں تو اس وقت اہلِ یہود کی روائتی قرات (جس کا مفصل ذکر بعد میں کیا جائے گا) ہماری رہنمائی کرتی ہے اور یہ بتلادیتی ہے کہ اہل یہود کے ربی اور مسلم الثبوت استاد فلاں مقام پر فلاں لفظ کوفلاں فلاں حرکات کے ساتھ پڑھتے تھے اور یوں ایسے موقعوں پر بھی غلطی کا احتمال جاتا رہتا ہے۔

(۲)

جیسا ہم بیان کرچکے ہیں، عبرانی زبان چند اور زبانوں کے ساتھ ملتی جلتی ہے اور اس خاصیت کے لحاظ سے دوسری زبانوں کے مشابہ ہے چنانچہ فینیکی زبان، موآبی زبان، شامی زبان میں بھی اعراب نہیں ہوتے۔ یہی حال اس زبان کا ہے جس میں اہل اسلام کی مقدس کتاب لکھی گئی ہے۔ یعنی قدیم عربی زبان جس میں نہ نقطے تھے اور نہ اعراب۔ ناظرین قرآن خوانوں کااور بالخصوص غیر عرب اور عجمی قرآن خوانوں کی مشکلات کا اندازہ لگاسکتے ہیں کہ وہ ایسے قرآن کو کس طرح پڑھتے ہوں گے۔ مثلاً ذیل کی آیت جو بغیر نقطوں اوراعراب

کے نقل کی گئی ہے ملاحظہ ہو؛

احس الحالصیں اللہ ربکمہ ورب اماکہ الالمس فکدلوہ ماسم محصروں اوقال لقومہ الاسعون الدعون لعلاوندروں الاعساداللہ المحصمس ویرکھاعلیہ فی الاحریں۔

بہزار دقت قرآن خوان مذکورہ بالاآیت کو پڑھ کر پہچان سکیں گے کہ یہ سورہ صافات کے رکوع ۴ کی آیت ہے۔ چنانچہ وفیات الاعیان جلد اول صفحہ ۱۲۵ میں ہے " ابواحمد عسکری نے اپنی تصحیف میں یہ روایت لکھی ہے کہ لوگ عثمان کے مصحف میں کچھ اوپر چالیس سال عبدالملک بن مروان کے عہد تک پڑھتے رہے لیکن نقطے نہ ہونے کی وجہ سے عراق میں تصحیف بہت ہونے لگی یعنی متشابہ حروف کو کچھ کا کچھ پڑھنے لگے ۔ اس پر حجاج بن یوسف کے حکم سے نفر بن عاصم (یا یحیٰی بن یعمر) نے نقطے ایجاد کئے۔ کسی حرف کے لئے ایک، کسی کے لئے دو۔ کسی کے لئے تین اور کسی کے اوپر۔ کسی کے نیچے ، کسی کے بیچ میں ۔ پس حروف تو صحیح پڑھے جانے لگے مگر زیر، زبر، پیش کی غلطیاں ہونے لگیں۔ پس اس کے دفعیہ کے لئے اعراب کو ایجاد کیا گیا" (ماخوذ از تصحیف کا تبین و نقص آیات کتاب مبین صفحہ ۱۲)۔

سید نواب علی صاحب اپنی کتاب تاریخ صحف سماوی میں لکھتے ہیں ، کہ حضرت عثمان نے جو مصحف لکھوائے تھے ان میں نقطے اور اعراب نہ تھے۔جب عجمی کثرت سے مسلمان ہونے لگے تو زبانِ عرب سے ناآشنا ہونے کے باعث ان کو بطور خود پڑھنے میں سخت دقت پیش آئی۔ اس دقت کی طرف سب سے پہلے ابوالا سودملی (المتوفی ۶۹ھ)شاگرد حضرت علی مرتضیٰ نے توجہ کی ۔ واقعہ یہ تھا کہ ابوالاسود نے ایک دن ایک شخص کو کلام مجید کی اس آیت ان اللہ بری من المشرکین ورسولہ میں رَسُولُہ کو رَسولِہ پڑھتے سنا ۔ جس سے معنی کچھ کے کچھ ہوگئے یعنی صحیح قرات کے مطابق معنی یہ ہوئے کہ " بے شک اللہ مشرکین سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (بیزار ہے)۔لیکن اس شخص کے غلط اعراب پڑھنے سے یہ معنی ہوگئے کہ " اللہ مشرکین اوراپنے رسول سے بیزار ہے ۔"ابو الاسود یہ سن کر سخت گھبرائے اورمکان پرآکر ایک کاتب کو بلایا اوراس کو اپنے پاس بٹھا کرہدایت کی کہ میں قرآن کو لکھواتا ہوں جس حرف کے ادا کرنے میں آواز کا رخ نیچے ہو۔ اس کے نیچے نقطہ دینا، اور جس حرف کو منہ گول کرکے ادا کروں تم اس کے کے آگے نقطہ دینا[1] ۔ اسی زمانہ میں حجاج بن یوسف نے اپنے کاتب نصر بن عاصم اورایک روایت میں ہے کہ یحیٰی بن یعمر سے قرآن مجید کو لفظوں کے ذریعے سے اعراب کا اظہار کرکے لکھوانا شروع کیا۔ لیکن یہ طریقہ مبہم تھا اس لئے خلیل بن احمد (المتوفی ۱۷۰ھ) نے نقطوں کے عوض مروجہ زیر، زبر پیش کے علامات ایجاد کئے جوآج تک رائج ہیں۔" صفحہ ۱۳۹ ۔

یہ ظاہر ہے کہ اِعراب کے اختلافات سے قرآنِ عربی کے الفاظ کے معنی بالکل بدل سکتے ہیں۔مثال کے طورپر ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں:

سورہ بقر کی آیت ۲۲۲ ۔ تفسیر حسینی میں یہ لکھا ہے ۔وَلَاَ تَقْرُبُوْ ھُنَّ نزدیک مشوید بدیشاں یعنی مباشرت مکنید حتیٰ یطھُرون تاوقتیکہ غسل کنندہ بعد ازا نقطاعِ دم وایں مذہبِ امام شافعی است وحفص یطھُرن بسکون طاو ضم ہاخواندہ یعنی وقتیکہ پاک شوندودم منقطع گردوایں قول امام اعظم است کہ چوُں انقطاع دم اجداز گذشتن اکثر ایام حیض باشد قبل از غسل وطی حلال است ۔ ظاہر ہے کہ یہاں دو قراتیں ہیں۔ اول یطھرَن کہ جب تک بعد انقطاعِ خون غسل نہ کریں اس وقت تک مرد اوراس کی بیوی متصل نہ ہوں اور یہ مذہب شافعی کا ہے۔ اور دوسری قرات یطھرون ہے کہ اس سے معلوم ہوتاہے کہ فقط انقطاع خون ضرور ہے اور غسل کی حاجت نہیں اور یہ مذہب امام اعظم کا ہے۔ (صفحہ ۳۲)۔

سورہ عنکبوت کی دوسری آیت کے لفظ لَیَعْلَمَنَّ کےموجودہ اعراب کے مطابق معنی یہ ہیں " اللہ ان کو بھی جان لے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی جان لے گا۔" اس سے خدائے علام الغیوب پر جہل لازم آتاہے۔ جو مفہوم قرآن کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی

---

[1] یہ امر قابل ذکر ہے کہ عبرانی کُتب مقدسہ کے اعراب نقطوں اور لکیروں پر مشتمل ہیں۔ غالباً الاسواد نے یہ طریقہ یہود سے لیا ہوگا۔ برکت اللہ

کاتب نے اعراب لگانے میں غلطی کردی ہے۔ غالباً اصل لفظ لیعلمنَ تھا جس سے آیت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ " اللہ جتلادے گا کہ کون سچے اور کون جھوٹے تھے۔"

"سورہ بقر آیت ۲۶۱ میں آخر جملہ ہے ۔ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ بولا (یعنی حضرت ابراہیم بولے) میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس پر بیضاوی یہ لکھتاہے کہ قولہ وقراء جمزہ والکساری قال اعلمہ الامر۔ یعنی اور پڑھا حمزہ اور کسائی نے کہا جان تو بطور حکم کے ۔ پس فقط اعراب کی تبدیلی سے مذکورہ بالا جملہ بجائے قول ابراہیم کے قولِ خدا ہوگیا۔"

سورہ یوسف آیت ۴۵ أُمَّةٍ آیا ہے اور اس کے معنی مدد اور جماعت ہیں اور بیضاوی لکھتاہے کہ بعض نے اس کی بجائے لفظ اَمتہٍ پڑھاہے کہ اس کے معنی نعمت ہیں اور بعض نے اُمتہٍ کہ اس کے معنی نسیان یعنی بھول کے ہیں۔ یہ تین الفاظ بالکلیہ عنیر ایک دوسرے کے ہیں اوران کے معنی بھی مختلف ہیں ۔(ایضاً صفہ ۲۷)اوروجہ صرف اعراب کی تبدیلی ہے۔ ایسی آیات بیسیوں ہیں لیکن بخوف طوالت ان کاذکر نہیں کیا جاتا ۔ لیکن کوئی صحیح الرائے شخص ان اعراب کے اختلاف کی بنا پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اب قرآن کا اصل مطلب ایسا خبط ہوگیاہے کہ وہ پایہ اعتبار سے ساقط ہوگیا ہے۔ اسی طرح اعراب کے اختلافات کی بنا پر کوئی سلیم العقل انسان کتابِ مقدس کو محرف قرار نہیں دے سکتا۔

حرُوف کی مشابہت

عبرانی رسم الخط کے متعلق دوسرا قابل عوز امر یہ ہے کہ اس کے حرُوف تہجی کے بعض حرُوف ایک دوسرے سے ایسےملتے جلتے ہیں کہ نقل کرتے وقت ان کے خلط ملط ہوجانے کے امکان کا احتمال ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر عبرانی حروف یود (ی) اور واؤہ ہیں۔ اسی طرح عبرانی حرُوف ر اور د۔ ت ، اور ھ ، ک اور ب ۔ ج اورن ، ح اور خ ہیں۔ اگر ان میں سے ایک کو بھی بے احتیاطی سے لکھا جائے تو یہ احتمال رہتا ہے کہ اس کی جگہ دوسرا حرف لکھا گیا ہے ۔ مثال کے طور پر ، ۱ سموئیل ۸: ۱۳ میں لکھاہے ، "اور داؤد اٹھارہ ہزار ارامی آدمی نمکے کے نشیب میں مار کے لوٹ آیا۔"لیکن یہاں " ارامی " کی بجائے " اُدومی" چاہیے دیکھو ۱ تواریخ ۱۸: ۱۲ اور زبور ٦ کا عنوان ۔ یہ غلطی کس طرح واقع ہوئی ؟ عبرانی میں تھا " اُدم" اورچونکہ عبرانی حروف د اور ر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں نقل کرنے والے نے غلطی سے " ارم" لکھ دیا اور یہ غلطی تاحال درست نہیں کی گئی اسی طرح حزقی ایل ٦: ۱۴ میں لفظ دبلہ کی بجائے ربلہ ہونا چاہیے [1] ۔

اس نکتہ کو ہم ایک اورمثال سے واضح کردیتے ہیں۔ ۱۔سموئیل ۱: ۲۴ میں ہے کہ جب حنہ اپنے بچے سموئیل کو سیلامیں خداوند کی خدمت کے لئے لائی تووہ" تین بچھڑے" اپنے ساتھ لے گئی لیکن اگلی آیت میں لکھا ہے کہ " انہوں نے ایک بچھڑے کو ذبح کیا۔" یونانی اور سریانی ترجموں میں "ایک تین سالہ بچھڑا" لکھاہے۔اس مقام پر عبرانی لفظ کے حرُوف کی ذرا سی تبدیلی سے اس لفظ کے معنی " تین بچھڑوں " کی بجائے تین سالہ بچھڑا" ہوجاتے ہیں۔ علم آثارِ قدیمہ بھی اس تبدیلی کی تائید کرتا ہے۔ شمالی مسوپوٹامیہ کے قدیم شہر نوزی سے چند تختیاں دستیاب ہوئی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی بچھڑا قربانی کے قابل تصور نہیں کیا جاتا تھا جو کم از کم دوسال کا نہ ہو۔ پس مذکورہ بالاآیت میں اصل لفظ" تین بچھڑے"نہیں ہے بلکہ " ایک تین سالہ بچھڑاہے۔ بچھڑے کی عمر تخصیص اس واسطے کی گئی تاکہ یہ امر عیاں ہوجائے کہ بچھڑا اچھا خاصا قربانی کرنے کے قابل تھا۔

لیکن کیا مختلف حرُوف کی مشابہت سے عہد عتیق کی کُتب میں اتنا فرقِ عظیم پڑگیاہے کہ وہ اب پایہ اعتبار سے ساقط اور کلیتہً محرُف ہوچکی ہیں؟ ہم ایک مثال سے اس

---

[1] اس کتاب کی دوسری ایڈیشن کے کاتب نے صفحہ ۱۲ کی دوسری سطر میں لفظ" بابل" کی بجائے " بائبل" لکھ دیا تھا۔ برکت اللہ

بات کو واضح کریں گے کہ اردو رسم الخط میں متعدد حرُوف ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے مشابہ ہیں مثلاً ب پ ت ث ج چ خ د ڈ و ذ - ر ڑ ز ژ - س ش - ص ض - ط ظ - ع غ - ک گ - وغیرہ علیحدہ علیحدہ اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایسے مشابہ ہوتے ہیں کہ مطلب کے خبط ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ بعض اوقات حرُوف د اور و میں فرق ظاہر نہیں ہوتا اور مطلب خبط ہوسکتا ہے۔ اسی طرح بعض حرُوف مل کر ایک ایسا لفظ بنتے ہیں جو کسی دوسرے لفظ کے مشابہ ہوتا ہے اور یوں مطلب خبط ہوسکتا ہے مثلاً فقرہ " میں سفر چلا ہوں" کو اگر کوئی صاحب نقل کرتے وقت یوں لکھ دے " میں سقر چلا ہوں" تو مطلب خبط ہوجائے گا۔

بعض عبرانی اعداد بھی ایک دوسرے کہ مشابہ ہیں جس طرح اردو کے اعداد ٦ ، ٩ یا ٢ ، ٣ یا ٢ ، ٤ وغیرہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں مثلاً اسی کتاب کی پہلی ایڈیشن میں کاتب نے صفحہ ٦٤ سطر ٤ میں عدد ٢ ٤ کو ٤ ٢ لکھ دیا تھا۔ اسی طرح اگر عبرانی اعداد کی نقل کرنے میں احتیاط نہ کی جائے تو ہمیشہ غلطی کا امکان رہتا ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے سامری تورات اور سیپٹواجنٹ (جن کا آگے چل کر ذکر کیا جائے گا) میں طوفان سے پہلے کے بزرگان اسرائیل کی عمروں میں فرق ہے۔

کیا حروف کی مشابہت کُتب مقدسہ کی تحریف پر دلالت کرسکتی ہے؟ کیا یہ امکان یقین کی صورت اختیار کرسکتا ہے؟ کیا ہم اس کو ایک قاعدہ کلیہ ٹھہرا سکتے ہیں کہ متعدد حرُوف کی مشابہت عبارت کی صحت کے نقیض ہے؟ اگر ایسا ہو تو اردو اور فارسی اور عربی کُتب کے نقل کرنے والے سب سے زیادہ کتابوں کے محرف کرنے والے ہیں اور چھاپہ خانوں کے کاتب اصل کتابوں کو نقل کرنے کی بجائے ان کا مطلب ایسا خبط کرتے ہیں کہ وہ پایہ اعتبار سے ساقط اور کلیتہً محرف ہوجاتی ہیں۔ تجربہ ہم کو بتلاتاہے کہ اگرچہ حروف کی مشابہت سے غلطی کا امکان ہوسکتا ہے تاہم وہ امکان ہی رہتا ہے اور وہ یقینی بات نہیں ہوجاتی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حرُوف کی مشابہت کی وجہ سے اردو فارسی اور عربی کتابوں میں غلطیاں واقع ہوجاتی ہیں - لیکن وہ غلطیاں نہ تو تعداد میں اتنی ہوتی ہیں کہ ان سے اصل کتاب درجہ اعتبار سے ساقط ہوجائے - پس گو عبرانی حرُوف ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اوران کی مشابہت کی وجہ سے کاتبوں سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں لیکن نہ تو وہ غلطیاں تعداد میں اس قدر ہیں کہ عبرانی کُتب مقدسہ کی عبارت ہی خلط ملط ہوجائے اور نہ وہ ایسی اہم ہیں کہ ان مقُدس کتابوں کے مطالب ومعانی اس قدر بگڑجائیں کہ وہ کتابیں درجہ اعتبار سے گرجائیں - انشاء اللہ آگے چل کرواضح ہوجائے گا کہ یہودی کاتب کس قدر احتیاط سے اپنی کُتب مقدسہ نقل کرتے تھے۔

تجربہ سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب کبھی کاتب کی غلطی سے ایک حرف کی بجائے دوسرا لکھا جاتا ہے تو عبارت اور سباق وسیاق ہم کو بتادیتا ہے کہ کاتب نے غلطی سے ایک حرف کی بجائے دوسرا لکھ دیا ہے اورہم اس کو درست کرلیتے ہیں چنانچہ ہم روزانہ اخباروں میں ایسی سینکڑوں غلطیاں دیکھتے ہیں اور بعض غلطیاں تو ایسی مضحکہ خیز ہوتی ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے چنانچہ چند سال ہوئے ایک اخبار میں کاتب صاحب نے " میں اپنے آپ کو مارتا ہوں۔"(١ کرنتھیوں ٩ : ٢٧) کی بجائے " میں اپنے باپ کو مارتا ہوں " لکھ دیا اور کاتب نے " ہندوستانی لیڈر" کے بجائے "ہندوستانی گیدڑ" لکھا تھا۔

عبرانی کُتبِ مقدسہ میں جب کبھی کاتبوں نے ایسی غلطیاں کیں تو سباق وسیاق نے اس غلطی کو ظاہر کردیا اوراگر اس غلطی کا تعلق سباوسیاق سے نہ ہوتا تو دیگر ذرائع سے اس غلطی کے وجود کا پتہ چل جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اوپر جس غلطی کا ذکر ٢ سموئیل ٨: ١٣ میں کیا گیا ہے - اس کا پتہ ١ - تواریخ ١٨ : ١٢ سے اور ساٹھویں زبور کے عنوان کے مقابلہ کرنے سے لگ جاتا ہے اور جہاں غلطی کے وجود کا ان ذرائع سے پتہ نہ ملے یہودی مستند اور مسلم الثبوت ربیوں کی قرات (جس کا ذکر بعد میں ہوگا) اس غلطی کو ظاہر کردیتی تھی پس حروف کی مشابہت سے عبرانی کُتب مقدسہ میں ایسا فتور نہیں پڑسکتا جس کی وجہ سے وہ کُتب پائہ اعتبار سے گرگئ ہوں۔

قرآنِ عربی میں بھی اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں جہاں دو مشابہ حروف کی کتابت کی وجہ سے عبارت کا مطلب کچھ سے کچھ ہو گیا۔ ذیل کی آیات نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

"سورہ اعراف آیت ۵۵ کا جملہ اول یہ ہے۔ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ نشْرًا ترجمہ: اور وہی یعنی خدا ہے جو بھیجتا ہے ہوائیں پھیلنے والی (یا زندہ کرنے والی) بیضاوی لکھتا ہے کہ بجائے نشراً عاصمہ بشراً پڑھتا ہے اوراس کے معنی خوشخبری دینے والی ہیں اورموافق قرات عاصم مولوی عبدالقادر دہلوی مذکورہ بالاجملہ قرآنی کا اس طرح ترجمہ کرتے ہیں اور وہی ہے کہ چلاتا ہے بادیں (یاہوائیں) خوشخبر، یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو نسخہ قرآن مولوی عبدالقادر کے پاس تھا اس میں قرات عاصم درج تھی۔"(صفحہ ۵۲)۔

"سورہ انفال آیت ٦ میں ہے اے نبی شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا۔ جس لفظ کا ترجمہ شوق دلانا ہے وہ لفظ متن قرآن بیضاوی میں ہے۔ حرِّض جس کے معنی بھڑکانا ہے۔ اس پر بیضاوی لکھتاہے وقری حرِّض یعنی بعض نے پڑھاہے حرص" (ایضا صفحہ ۵۸)۔

"سورہ یونس آیت ۳۱ میں ہے ۔ وہاں جانچ لے گا ہر کوئی جو آگے بھیجا۔ اس پر بیضاوی لکھتاہے کہ پڑھا حمزہ اور کسائی نے تتلوُ تلاوت سے یعنی پڑھے گا ذکر اس کا جو پہلے گذرا" ۔ یہ ظاہر ہے کہ لفظ بتلوُ بمعنی جانچے گا اور لفظ تتلو بمعنی پڑھے گا بالکلیہ غیر ایک دوسرے کے ہیں۔(ایضاً صفحہ ٦۴)۔

سورہ یونس آیت ۹۲ میں ہے تاکہ ہووے تو واسطے ان کے جو تیرے بعد ہوں ایک نشانی ۔ یعنی جو لوگ زمانہ فرعون کے بعد ہوں۔ جس جملہ کا ترجمہ ، "واسطے ان کے جو تیرے ہوں" اس جملہ کی اصل عبارت قرآن میں یہ ہے لِمَنْ خَلْفَكَ اس کی نسبت بیضاوی یہ لکھتا ہے کہ وَتِرَ لِمنَ خلَقَه [1] یعنی بعض نے پڑھاہے واسطے اس کے جس نے تجھ کو پیدا کیا"(ایضاً صفحہ ٦٧)۔ ان قراتوں میں فرق حروف کی مشابہت کی وجہ سے ہے۔

"سورہ طہ آیت ۱۹ کا شروع جملہ یہ ہے اور پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں پر الخ بیضاوی لکھتا ہے وقری باالمین من الھس بعض نے سین سے پڑھا ہے ہس اور وہ روکنا بکریوں کا ہے معنی بالکل بدل گئے۔

غرض ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں لیکن جس طرح کوئی شخص ان کی وجہ سے قرآن کو محرف اوربے قدر نہیں گردان سکتا، اسی طرح اس قسم کی غلطیوں کی بنا پر کوئی صحیح العقل شخص کتابِ مقدس کو محرف نہیں گردان سکتا۔

فصلِ دوم

سہوِ کاتب کی حقیقت

بائبل اور کتابت کی غلطیاں

۱۴۴۵ء میں یورپ میں چھاپہ خانہ ایجاد ہوا ، اورپہلے پہل ۱۴۸۸ء میں عبرانی کُتب مقدسہ چھاپی گئیں۔ پس قدیم ترین زمانہ سے ۱۴۸۸ء عیسوی تک یہ کُتب مختلف زمانوں ، ملکوں اور زبانوں میں کاتبوں کے ہاتھوں ہی سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ کسی صحیح العقل شخص کو اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ نسخوں کے نقل کرنے میں کتابت کی غلطیاں ضرور واقع ہوجاتی ہیں۔ کاتب خواہ کتنا ہی محتاط شخص کیوں نہ ہو نقل کرنے میں وہ ضرور غلطیاں کرتا ہے۔ بالخصوص جب کتاب کے صفحات کی تعداد زیادہ ہو اور وہ زمانہ قدیم سے نقل ہوتی چلی آتی ہو تو اس میں اغلاط کا وجود ایک لازمی امر ہوجاتا ہے۔مثال کے طور پر

[1] اس کتاب کی دوسری ایڈیشن کے کاتب نے یہاں بھی خلفک لکھ دیا تھا۔(برکت اللہ)

اردو کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں عبارت ، الفاظ یا حروف کی غلطیاں موجود نہ ہوں اور یہی حال دیگر زبانوں کی کتابوں کا ہے۔ صفحہ ہستی پر کوئی کتاب ایسی موجود نہیں جس کے نقل کرنے میں کاتبوں سے غلطیاں سرزد نہ ہوئی ہوں۔ اگر ناظرین خود تکلیف گوارا کرکے کسی کتاب کے چند صفحوں کی نقل کریں تو یہ حقیقت ان پر خود بخود منکشف ہوجائیگی ۔ پس عبرانی کُتب مقدسہ کی نقل کرنے میں کاتبوں نے غلطیاں ضرور کی ہیں گو اس میں کچھ شک نہیں کہ کاتب حد درجہ کے حزم اور احتیاط کو کام کرنے میں لاتے تھے تاہم عبرانی کُتب مقدسہ جیسی قدیم اور ضیغم کتابوں کی نقل میں کئی صدیوں کے دوران میں کاتبوں سے غلطیاں ضرور واقع ہوئیں۔ بعض اوقات حروف اور الفاظ کی مشابہت کی وجہ سے ایک لفظ کی بجائے دوسرا لکھا گیا اور اگر کاتب کو کتاب لکھائی گئی ہو تو ہم آواز الفاظ کی وجہ سے بعض اوقات غلطی سرزد ہو گئی۔ عبرانی زبان میں اس قسم کی غلطی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے کیونکہ جو حروف حلق سے نکلتے ہیں ان کے خلط ملط ہوجانے کا زیادہ ہوتا ہے۔

بعض اوقات عبارت میں ایک ہی لفظ دو دوفعہ لکھا ہوتا ہے لیکن کاتب اس کو صرف ایک دفعہ لکھ دیتا ہے۔ بعض اوقات دو سطروں میں ایک ہی لفظ لکھا ہوتا ہے اور اگر کاتب خود نسخہ کو دیکھ کر لکھے تو کسی سطر کے آخری لفظ لکھنے کے بعد وہ اسی لفظ کو ایک سطر نظر انداز کرکے لکھ دیتا ہے اور وہاں سے آگے لکھتا چلا جاتا ہے اور یوں ایک پوری سطر نظر انداز ہوجاتی ہے ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب کے حاشیہ پر کوئی تشریحی نوٹ لکھا ہوتا ہے اور کاتب اس نوٹ کو متن کا اصل حصہ سمجھ کر متن میں نقل کردیتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم دورِ حاضرہ کی کتابت کولیں عہدِ عتیق کے اردو ترجمہ کی اگرچہ کاتب نہایت احتیاط سے نقل کرتے ہیں ۔ تاہم ان سے غلطیاں سرزد ہوجاتی ہیں۔ ذیل کی غلطیاں ملاحظہ ہوں۔

(۱-) اصل: میرے دل کو کسی بُری بات کی طرف مائل نہ ہونے دے۔"

(زبور ۱۴۱: ۴)۔

نقل: " میرے کو کسی بات کی طرف مائل نہ ہونے دے۔"

(۲-) اصل:" میں نے کہا تو میری پناہ ہے اور زندوں کی زمین میں میرا بخرہ۔"

(زبور ۵: ۴۲)

نقل: میں نے کہا تو میری پناہ ہے اور رندوں کی زمین میں میرا بخرہ۔"

(۳-) اصل:" کاش تیرے آئین ماننے کے لئے میری روشیں درست ہوجائیں۔

(زبور ۱۱۹: ۵)۔

نقل:" کاش تیرے آئین ماننے کے لئے تیری روشیں درست ہوجائیں۔

بعض اوقات دو عبرانی الفاظ کو یکجا جمع کرنے سے کاتب نے غلطی پیدا کردی۔مثلاً زبور ۴۸: ۱۴ میں ہے یہ " خدا ابد الآباد ہمارا خدا ہے ۔ تادم مرگ وہی ہماری ہدایت کرے گا۔" بعض نسخہ جات میں الفاظ " تادم مرگ" کی بجائے "تاابد" لکھے ہیں۔ کیونکہ دو عبرانی الفاظ (ھل متھ بمعنی " تادم مرگ") کو کاتب نے یکجا کرکے (ھلمتھ بمعنی " تاابد" لکھ دیا۔ ایک اردو اخبار کے کاتب نے زبور کی کتاب میں ایسا ہی کیا ہے۔

(۴-) اصل:" دس تاروالی بربط پر میں تیری مدح سرائی کروں گا۔"

(زبور ۱۴۴: ۹)

نقل:" دستاروالی بربط پر میں تیری مدح سرائی کروں گا۔"

یہاں پر دو مختلف الفاظ (دس تار) کو کاتب نے یکجا کرکے تیسرا لفاظ (دستار) جس کے معنی بالکل مختلف ہیں لکھ دیا ہے۔

اسی قسم کی مثالیں ہم کو قرآن عربی میں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ عربی میں لفظ این کے معنی ہیں کہ "کہاں" اور لفظ ماَ کے معنی ہیں " جو کچھ یا جن چیزوں کو"۔ اور اگر ملاحظہ ہو

سورہ نساء رکوع ۱۱ جن میں آیت یوں لکھی ہے این ماتکو نواادرک کمُہ الموت ، موجودہ حالت میں اس کا ترجمہ یہ ہے " جو کچھ بھی تم کہاں ہو تم کو موت پائے گی"۔ جو بے معنی فقرہ ہے لیکن اگر اس آیت کے پہلے دو لفظوں کو ملا کر اینما قرآن میں ہو تب قرآنی مفہوم نکلتا ہے یعنی" تم جہاں کہیں بھی ہو موت تم آکر رہے گی۔"اسی طرح سورہ شعرا (رکوع ۵) میں ان دونوں لفظوں کو ملادیا گیا ہے حالانکہ ان کو جدا لکھنا چاہیے تھا۔ موجودہ عبارت (وقیل لھمہ اینما کنتمہ تعبدوامن دون اللہ) کے یہ معنی ہوئے " ان سے کہا جائے گا کہ جہاں کہیں بھی تم ہو غیر خدا کی پرستش کرو۔"لیکن اگر اس آیت میں ان دونوں لفظوں کو الگ لکھا جاتا تو اسکے معنی یہ ہوتے" ان سے کہا جائیگا کہ جن کی خدا کے سوا تمام پرستش کرتے تھے وہ اب کہاں ہیں؟ جو قرآن کا اصل مطلب تھا۔

سورہ نساء رکوع ۱۱ میں قرآنی آیت یوں لکھی ہے فمال ھولاء لقوم لا یقادون یفقھون حدیثنا۔ اس عبارت کے یہ معنی ہیں" پس اس قوم کا مال وہ اس بات کو نہیں سمجھتے۔" جو بے معنی ہے۔لیکن اگر پہلے دولفظوں کو یوں لکھا جاتا (فما لھوالاء لقوم) تو اس آیت کے یہ معنی ہوتے۔" اس قوم کو کیاہو گیاہے کہ وہ بات نہیں سمجھتے۔" جو قرآن کا اصل مطلب تھا۔

مشاہیر اساتذ کے کلام میں کتابت کی غلطیاں

اگر ہم اردو اور فارسی کے پرانے مصنفین کی کتابوں اور شعرا کے مطبوعہ دیوانوں پر ایک سطحی نظر ڈالیں تو ہم جا بجا حرف" ن " دیکھیں گے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض نسخوں میں فلاں لفظ کی بجائے فلاں لفظ لکھا ہے۔ مثلاً سعدی کی گلستان کا نسخہ جو میرے پاس موجود ہے وہمنشی نولکشور کے مطبع میں چھپا ہے۔ اس میں جا بجا یہ حرف" ن " پایا جاتا ہے۔ اس نسخہ کے تیسرے صفحہ میں انیس سطریں ہیں اور ان انیس سطروں میں نسخوں کے اختلافات کی تعداد دس ہے؟ مثنوی معنوی" کی نسبت کہاجاتا ہے کہ

ع ہست قرآن درزبان پہلوی

اس کتاب کی نسبت مولانا عبدالماجد صاحب بی اے رسالہ مرقع (لکھنو) بابت جنوری ۱۹۲۶ء میں فرماتے ہیں ۔" مثنوی کی عمر اس وقت عمر تقریباً سات سو سال کی ہے۔ اس طویل مدُت میں خدا معلوم اس پر کتنے انقلابات گذر چکے ہیں۔ آج جو بلند ہمت اپنی تحقیق کے دستِ بازو سے کام لے کر اس کے کھرے کو کھوٹے سے جدا کرسکے وہ ہزار آفرین کا مستحق اور صد ہزار تحسین کا سزاوار ہے۔" لیکن بایں ہمہ کوئی صاحبِ ہوش مروجہ گلستان یا موجودہ مثنوی کو محرف گردان کر ان کو ساقط الاعتبار قرار نہیں دیتا۔ مولانا موصوف اس مضمون میں" کاتب صاحبان کی لغزشوں" کی متعدد مثالیں بھی دیتے ہیں اور مصنفین کی کتابوں کی نسبت ایک قاعدہ کلیہ کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں ۔" مشاہیر اساتذہ کے کلام کے متعلق ایک بڑی دقت ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ مختلف اسباب واغراض سے لوگ دانستہ یا نادانستہ ان کے کلام میں(" تصرف کرتے ہیں" ۔ یہ تین الفاظ مرقع کے کاتب سے لکھتے وقت رہ گئے ہیں) یہاں تک کہ کچھ عرصے کے بعد اصل و نقل سونا اور پیتل خلط ملط ہو کر ایک ہوجاتا ہے ۔"

جب ہم ان غلطیوں کے انبار کامقابلہ عبرانی کتُب مقدسہ سے کرتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ ان کتُب کے کاتبوں نے کیسی ہوشیاری، احتیاط ، محنت اورجانفشانی سے کام لیا ہے۔ اورجہاں " مشاہیر اساتذہ۔" کے کلام میں ہزاروں الفاظ تبدیل ہوچکے ہیں یہاں تک " کہ " اصل اور نقل سونا اور پیتل خلط ملط ہو کر " ایک " ہوچکے ہیں۔ اورجہاں" مثنوی معنوی " میں جو ضخامت کے لحاظ سے کوئی بڑی کتاب نہیں ہے اور جس کو صرف تقریباً سات سو سال " کا عرصہ ہوا ہے" کھرے کو کھوٹے سے جدا " کرنا صرف ایک " بلند ہمت " شخص کا ہی کام ہے وہاں عبرانی کتُبِ مقدسہ میں جو ضیغم کتُب ہیں اور ہزاروں برس سے نقل ہوتی چلی آئیں مقابلتہً معدودے چند الفاظ فقرات اور آیات کا اختلاف ہم کو نظر آتا ہے جس کا اصل عبارت پر کوئی بڑا اثر نہیں پڑتا۔

نتیجہ

حاصل کلام جب ہم مشاہیر اساتذہ کی تصنیفات کی کتابت وغیرہ کی غلطیوں کا عبرانی کُتب مقدسہ کی کتابت کی لغزشوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں توہم پر عیاں ہوجاتا ہے کہ عبرانی کُتب مقدسہ کی نقل نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے کی جاتی تھی اس کا مفصل ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ ان نسخوں میں مقابلتاً بہت کم ایسی اہم غلطیاں واقع ہوئی ہیں جن سے مطلب ایسا خبط ہوجائے کہ اصل کُتب کے مطالب اور معانی مفقود ہوجائیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ جب ہم قدیم کتابوں کی صحت کا مقابلہ کرتے ہیں توہم پر یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ جس صحت کے ساتھ عبرانی کُتب مقدسہ جیسی قدیم اور ضخیم کتابیں پشت درپشت نقل کی گئی ہیں۔ اس طرح روئے زمین کی کوئی پرانی یامذہبی کتاب صحت کے ساتھ نقل نہیں کی گئی۔ پس اگرچہ عبرانی کُتبِ مقدسہ میں سہو کاتب موجود ہے اور مختلف زمانوں اورملکوں میں نقل ہوتے وقت کاتبوں نے غلطیاں کی ہیں تاہم ان کے نسخوں کی غلطیاں ایسی اہم نہیں جن کی وجہ سے کوئی محقق یہ کہہ سکے کہ اب وہ پایہ اعتبار سے گر گئی ہیں اور اس قابل نہیں رہیں کہ وہ معتبر گردانی جائیں۔

باب دوم

عبرانی کُتبِ مقدسہ کے نسخہُ جات

عبرانی کُتبِ مقدسہ کے موجودہ نسخوں کا شمار دو ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ نسخہ جات مختلف اشیاء پر لکھے ہیں اور مختلف حالتوں میں محفوظ ہیں۔ کوئی نسخہ اچھی حالت میں ہے کوئی بُری حالت میں، کوئی پھٹا ہوا ہے، کسی کے الفاظ بمشکل نظر آتے ہیں۔ اور کوئی ایسا ہے کہ گویا ابھی لکھا گیا ہے۔ یہ نسخے مختلف ممالک سے دستیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً ملکِ کنعان سے اور بابل کی سرزمین، مغربی ایشیا، براعظم افریقہ، بحرہند کے جزائر سے، غیر یہود کے کتب خانوں سے، اطالیہ اورہسپانیہ کے ممالک سے چین اورمالابار (ہندوستان) کے یہودی ربیوں سےاور کُتبِ مقدسہ کے مدفون سے (جہاں اہلِ یہود ان کو دفن کردیتے تھے) یہ نسخہ جات دورِ حاضرہ میں دستیاب ہوئے ہیں۔

جب ہم ان مختلف اور دُور ودراز مقامات کے نسخوں کا ملاحظہ کرتے ہیں، تو دو امور ہم پر عیاں ہوتے ہیں۔

نسخہ جات کی خصوصیت

یہ تمام نسخہ جات جو دورِ حاضرہ میں ہم کو دستیاب ہوئے ہیں تقریباً لفظ بلفظ اور حرف بحرف ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اور شاذونادر ان دو ہزار نسخہ جات میں (جو ہم کو مختلف ممالک سے ملے ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف کاتبوں کے ہاتھوں لکھے گئے ہیں) کوئی اختلاف ہم کو نہیں ملتا، یہاں تک کہ اگر کسی کاتب نے کسی لفظ پر کسی خاص وجہ سے کوئی نشان لگادیا تو مابعد کے کاتبوں نے اس نشان کو بھی نقل کردیا ہے۔ مثلاً پیدائش ۴:۳۳ میں ہے۔" عیسو اس کو (یعنی یعقوب کو) ملنے دوڑا اور اسے گلے لگایا اور اس کی گردن

سے لپٹا اور اسے چوما۔" قدیم زمانہ میں کسی کاتب نے الفاظ " اور اسے چوما" پر نقطے لگادئیے اور یوں لکھ دیا" اسے چوما ۔" مابعد کے کاتبوں نے ایسی صحت کے ساتھ اس نسخہ کو نقل کیا کہ آج تک ہماری عبرانی بائبل میں ان الفاظ پر نقطے چھاپے جاتے ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ ان لفظوں کا کیا مطلب ہے۔ ایک یہودی ربی کا قول ہے، کہ عیسو نے یعقوب کو چومتے وقت دانتوں سے کاٹا تھا اور یہ نقطے اس کے دانتوں کے نشان ظاہر کرتے ہیں! بہر حال یہ دو ہزار نسخے اس قدر صحت کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں کہ ان کے نقطے اور شوشے بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

نسخوں کی تعداد

یہ دو ہزار نسخہ جات (سوائے چند قدیم ترین نسخوں کے جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا) تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ پرانے نہیں ہیں۔ اس امر میں عہد جدید کی کُتب کے نسخوں کو فوقیت حاصل ہے، کیونکہ انجیلی مجموعہ کے نسخے تاحال دوسری صدی کے دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن عہد عتیق کی قدیم کتابیں قریباً تین ہزار سال ہوئے لکھی گئی تھیں۔ ان کے نسخے جو ہمارے پاس موجود ہیں، صرف ایک ہزار سال پرانے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم نسخہ تورات کی پانچ کتابوں کا ہے جو برطانیہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ لینن گراڈ میں کُتبِ انبیاء کا ایک نسخہ ہے جس کی تاریخ ۹۱۶ء ثبت ہے۔ آکسفورڈ میں بھی ایک نسخہ موجود ہے جس میں عبرانی کُتب مقدسہ کی تقریباً تمام کتابیں لکھی ہیں۔ یہ نسخہ دسویں صدی کا ہے۔ پس عہد عتیق کی آخری کتاب کی تاریخ تصنیف اور ان قدیم نسخوں میں قریباً ایک ہزار سال کا وقفہ ہے۔

نسخوں کے ضائع ہونے کے اسباب

اس دراز وقفہ کی کیا وجوہ ہیں؟ یہاں ہم صرف مختصر طور پر چند وجوہ کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱۔) جب یروشلیم ۷۰ء میں برباد ہوگیا اور قوم یہود خستہ حال اور پراگندہ ہوگئی تو یہودی لیڈروں نے اپنی قومی روایات کو برقرار اور قائم رکھنے کے لئے ۱۰۰ء میں ایک مجلس منعقد کی۔ اس مجلس نے ان تمام کُتب کو جواب عہد عتیق کے مجموعہ میں شامل ہیں کُتبِ مقدسہ قرار دے دیا اور یوں یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچ گئیں۔ علاوہ ازیں اس مجلس نے ان پاک کتابوں کی صحت کے ساتھ نقل کرنے کے لئے قوانین وقواعد بھی وضع کئے جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

(۲۔) بادشاہ اینٹی اوکس ایپی فینیز[1] نے جو اہلِ یہود کا جانی دشمن تھا اپنے عہد میں ۱۷۵ تا ۱۶۴ قبل مسیح) اہل یہود کو ایسی ایذائیں دیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ عبرانی کُتب مقدسہ کے نسخہ جات جہاں کہیں ملیں تلف کردیئے جائیں اور اگروہ کسی شخص کے پاس ملیں تو وہ جان سے مارا جائے (۱مکابی ۱: ۵۴یا ۵۸)ظاہر ہے کہ اس ایذا رسانی کی وجہ سے کُتب مقدسہ کے متعدد نسخے ضائع ہوگئے۔

(۳۔) قرون وسطیٰ میں اور بالخصوص صلیبی جنگوں کے زمانہ میں متعصب مغربی مسیحی اہل یہود سے نفرت اور کینہ رکھتے تھے اور ان کے جنون نے عبرانی کُتب مقدسہ کے بہت سے نسخے اور بالخصوص تورات کے نسخے نذر آتش کردیئے۔

---

[1] Antiochus Epiphanies

(۴) اہل یہود کا یہ دستور تھا ، (اور یہ دستور دَورِ حاضرہ میں بھی مروج ہے) کہ کُتب مقدسہ کے نسخے جو کسی وجہ سے استعمال کے قابل نہ رہتے تھے ، بڑے ادب سے دفن کردئیے جاتے تھے تاکہ خدا کا کلام بے حرمتی سے محفوظ رہے۔ اور گلی کوچوں میں پاؤں کے نیچے روندا نہ جائے۔ اس غرض کے لئے ہر یہودی عبادت خانہ کے ساتھ ایک مدفن ہوتا تھا ، جہاں نہایت معمولی عیوب کی وجہ سے بھی نسخے دفن کردئیے جاتے تھے۔ مثلاً اگر کسی صفحہ پر کاتب کی دو سے زیادہ غلطیاں بھی مل جاتیں تو وہ صفحہ احتیاطاً دفن کردیا جاتا۔ یہودی عبادت خانوں کے نسخہ جات کے طومار جو روزانہ تلاوت کے باعث پھٹ جاتے تھے دفن کردئیے جاتے تھے۔ اہل یہود میں دستور تھا کہ کلام اللہ کے جس حصہ کو روزانہ پڑھتے اس کے شروع اور آخر کے الفاظ کو بوسہ دیتے تھے اور اس طرح مدتِ مدید کے بعد یہ الفاظ مٹ جاتے یا بخوبی نظر نہ آتے تھے۔ اہل یہود ایسے نسخہ جات کو بھی دفن کردیتے تھے۔

مذکورہ بالا اور دیگر وجوہ کے باعث ہمارے پاس کُتب عہد عتیق کے پرانے نسخے موجود نہیں ہیں اور جو موجود بھی ہیں وہ تقریباً سب کے سب یا تو غیر اقوام کے دارالعلوم اور کُتب خانوں سے یا انہی یہودی دفن گاہوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔

حیدرآباد دکن کا نسخہ

حال ہی میں خبر ملی[1] ہے کہ عبرانی کا ایک قدیم ترین نسخہ حیدرآباد (دکن ۔ واقع ہندوستان) سے دستیاب ہوا ہے جو کھجور کے پتوں (Palm Leaves) پر لکھا ہے۔ یہ نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کی سنسکرت اکاڈیمی میں سالہا سال سے محفوظ تھا۔ اس نسخہ پر تورات کی پہلی کتاب پیدائش کا ۳۷واں باب عبرانی میں لکھا ہے۔

[1] The Times of India, Delhi 9th March, 1965.

یروشلیم کی عبرانی اکاڈیمی کے فضلا اس نادر نسخہ کی جانچ پڑتال کررہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی یہودی عالم نے دو ہزار سال ہوئے لکھا تھا جب یروشلیم کی تباہی کے بعد اہل یہود جنوبی ہند نقل مکانی کرکے آگئے تھے۔ (دیکھو میری کتاب " مقدس تومار سول ہند" صفحہ ۹۵)۔

یہ نسخہ اس لحاظ سے بھی یکتا ہے کہ دنیا بھر کے نسخوں میں یہی ایک نسخہ ہے جو کھجور کے پتوں پر لکھا ہے۔

باب سوم

کُتبِ عہد عتیق کی صحت پر تاریخ کی شہادت

اب ہم اس امر کی تحقیق کریں گے کہ آیا موجودہ عبرانی کُتب کے متن کے الفاظ بجنسہ وہی ہیں جو ان کُتب کے مصنفین اور انبیاء اللہ نے تحریر کئے تھے۔ اس سول کی تحقیق کے لئے ہم اہل یہود کی تاریخ کو چار زمانوں میں تقسیم کرکے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ آیا ان میں سے کسی زمانہ میں ان کُتب کے متن میں کوئی واقع ہوا ہے یا نہیں۔

دَور اول ۔ خروج مصر سے بابل کی اسیری تک کا زمانہ یعنی حضرت موسیٰ سے لے کر حضرت عزرا تک (چودھویں صدی قبل مسیح سے ۴۵۸ قبل مسیح تک)۔

دَورِ دوم۔ حضرت عزرا اور فقیہوں کا زمانہ ،ہیکل کی تباہی تک (۴۵۸ قبل مسیح سے ۷۰ عیسوی تک)۔

دَورِ سوُم ۔ تلمودی زمانہ (از ۷۰ء تا ۶۰۰ء صدی عیسوی)

دَورِ چہارم۔ مسوراہی زمانہ (از ۶۰۰ء تا ۱۰۰۰ء عیسوی تک)۔

باب چہارم

دَور اوّل

خروج مصر سے بابل کی اسیری تک کا زمانہ

(چودھویں صدی قبل مسیح سے ۵۸۶ قبل مسیح تک)

ارضِ مقدس کے یہودُ اور نوشت وخواند

جب ہم عہد عتیق کے مجموعہ پر سطحی نگاہ ڈالتے ہیں توہم پر یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ اس مجموعہ کی کتابیں اور کتابوں کے حصے تک مختلف زمانوں میں مختلف مصنفوں نے لکھے تھے۔ ان کے لکھنے والے ہر قسم کے لوگ تھے۔ کوئی واضح قوانین وآئین تھا۔ کوئی فوجوں کا جرنیل تھا۔ اگرایک نبی تھا تو دوسرا منصف یا قاضی تھا۔ اگرایک بادشاہ تھا تو دوسرا بکریاں چرانے والا تھا۔ اگر ایک کاہن تھا تو دوسرا شاعر تھا۔ غرضیکہ ان کتابوں کے لکھنے والے ہر قسم کے آدمی تھے اورہر کتاب کا تعلق مختلف حالات اور مختلف زمانوں کے ساتھ ہے ۔جس میں خاص ان حالات اور زمانوں کے لئے خدا کی طرف سے خصوصی پیغامات درج ہیں۔

موجودہ زمانہ کے پڑھےلکھے آدمی عموماً یہی سمجھتے ہیں کہ نوشت وخواند کا سلسلہ صرف چند صدیوں سے ہی چلا آرہا ہے۔ لیکن علم آثار قدیمہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ سیدنا مسیح سے تین ہزار سال پہلے بھی لوگ لکھا پڑھی کیا کرتے تھے ۔گو مختلف ممالک میں مختلف اشیاء پر لکھا کرتے تھے ۔چنانچہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی کرنے والوں نے مسوپوتامیہ ، ایشیائے کوچک ، مصر ، شام ، ایران میں بے شمار مٹی کی تختیاں کھود نکالی ہیں جن پر خطِ میخی کی عبارت کندہ ہے۔ ان تختیوں پر خط کے علاوہ دیگر قسم کی عبارتیں بھی کھدُی ہیں۔

اُور کی کھدائی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ حضرت ابراہام سے برسوں پہلے مسوپوتامیہ میں ہر جگہ لکھنے کا دستور موجود تھا۔ چنانچہ سیدنا مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کنعانیوں میں اگر پانچ نہیں توکم ازکم چار قسم کی تحریرات مروج تھیں جن کو اہلِ کنعان اپنی زبان لکھنے کے لئے مختلف موقعوں پر استعمال کرتے تھے۔ کنعان کے ارد گرد کے ممالک میں بھی نوشت وخواند کا دستور باقاعدہ جاری تھا۔چنانچہ ملکِ مصر سے پے پائرس کے طورمار دستیاب ہوئے ہیں جو سیدنا مسیح سے دو ہزار سال قبل کے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ان سے پیشتر کم ازکم ایک ہزار سال پہلے لوگ لکھا پڑھی کیا کرتے تھے ۔ پس حضرت ابرہام کے وقت ارضِ مقدُس میں نوشت وخواندہ کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۹۲۶ء میں ایک عبرانی کتبہ دستیاب ہوا جو سیدنا مسیح سے قریباً بارہ سوسال پہلے کا ہے۔ ارضِ مقدس میں اس زمانہ میں عموماً پتھروں اور مٹی کی تختیوں پر لکھا جاتا تھا۔ (استثنا ۲۷: ۲، ۸) اور الفاظ کو کندہ نہیں کیا جاتا تھا۔ نوشت وخواند کا ذکر عبرانی کُتب مقدسہ میں اکثر آیا ہے (خروج ۳۴: ۱، ۲۷- ۳۹: ۳۰- استثنا ۲۱: ۱۹- یشوع ۱: ۸، ۸: ۳۱- قضاۃ ۵: ۱۴ وغیرہ)۔جس زمانہ میں حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے (یعنی چودہویں صدی قبل مسیح) اس زمانہ میں سینا کے علاقہ میں حروف تہجی رائج تھے۔

پس علمِ آثار قدیمہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جب حضرت ابرہام نے کلدیوں کے اُور سے تارکِ وطن ہو کر ہجرت اختیار کی تواس شہر میں نوشت وخواند کا سلسلہ جاری تھا۔ بلکہ جیسا ہم ابھی بتلاچکے ہیں مصر میں پے پائرس کے بعض ایسے قدیم طومار ملے ہیں جو ابرہام کے زمانہ سے بھی پہلے کے ہیں۔ مختلف مقامات سے (جو بحر متوسط اور مسوپوتامیہ کے درمیان ملک شام میں واقع ہیں)، ہزاروں الواح دستیاب ہوئی ہیں جو سیدنا مسیح سے بھی دوہزار سال پہلے کی ہیں جن سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ جب اسرائیلی چودھویں صدی قبل از مسیح کے پہلے نصف میں ملکِ مصر سے نکلے تھے تو وہ ایسے ملک سے نکلے تھے جہاں صدیوں سے نوشت

وخواند کا سلسلہ جاری تھا اور وہ ایک ایسے ملک (کنعان) میں گئے جہاں کے اصلی باشندے اموری اور کنعانی (اوران کے ہمسایہ ممالک شام، مسوپوتامیہ اور ایشیائے کوچک) نوشت وخواند سے بخوبی واقف تھے۔ اس حقیقت کا ذکر ہم اس کتاب کے مقدمہ کے شروع میں کر آئے ہیں۔

پس گذشتہ پچاس سال کے انکشافات سے ظاہر ہے کہ عبری زبان قدیم زمانہ ہی سے نوشت وخواند کا ذریعہ بن چکی تھی۔ اس لئے یہ نہایت اغلب بلکہ یقینی امر ہے کہ عبرانی کُتب مقدسہ کے قدیم ترین حصے اوران کے ماخذ ابتدائی زمانہ ہی سے احاطہ تحریر میں آچکے تھے۔

قدیم کُتب مقُدسہ کی تاریخ تصنیف

اس ابتدائی زمانہ میں (جس کی معیاد تقریباً ایک ہزار سال ہے) ذیل کی کُتبِ مقدسہ احاطہ تحریر میں آئیں:

پیدائش، خروج، احبار، گنتی، استثنا، یشوع، قضاۃ، روت، سموئیل، سلاطین، یسعیاہ، یرمیاہ کا نوحہ، حزقی ایل، حبقوق، صفنیاہ، ناحوم، میکاہ، ہوسیع، عاموس، عبدیاہ، یوایل، ایوب، حجی، زکریا۔

فصلِ اوّل

عبرانی کُتبِ مقدسہ کی صحت کی اندرونی شہادت

اس ابتدائی زمانہ کی بابت ہم کو کُتبِ مقدسہ کی اندرونی شہادت اور حالات سے بہت واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ خارجی ذرائع سے اس ابتدائی زمانہ کی نسبت ہم کو اتنا پتہ نہیں مل سکتا جتنا بعد کے زمانوں کے حالات کا ملتا ہے۔ پس ہم پہلے اس سوال پر غور کریں گے کہ خود ان کتب مقدسہ سے ہم ان کے متن کی صحت کی نسبت کیا جان سکتے ہیں؟

(۱)

عبرانی کُتبِ مقدسہ کی حفاظت کے وسائل

جب ہم اِن کُتب کا غور سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس قدیم دور میں نسخے قدیم عبرانی حرُوف میں پارچہ جات پر طومار کی شکل میں لکھے جاتے تھے(یرمیاہ ۳۶: ۱۴ - وحزقی ایل ۲: ۹- زبور ۴۰: ۷ وزکریا ۵: ۱) اور وہ نہایت ادب اور تکریم سے محفوظ رکھے جاتے تھے۔ چنانچہ لکھاہے کہ جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کوایک کتاب میں لکھ چکا اور وہ ختم ہوگئیں توموسیٰ نے لاویوں سے جوخداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھایا کرتے تھے کہا کہ اس شریعت کی کتاب کو لے کر خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کے پاس رکھ دو"(استثنا ۳۱: ۲۴ تا ۲۶)۔ پس جو کُتبِ مقدسہ اس وقت تحریر ہوچکی تھیں وہ سب قدس الاقداس میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔(خروج ۴۰: ۲۰، استثنا ۳۱: ۲۴تا ۲۶- ۲ سلاطین ۲۲: ۸) اورہر ساتویں سال لفظ بلفظ پڑھی جاتی تھیں۔ (یشوع ۸: ۳۵- استثنا ۳۱: ۱۰تا۱۳) یہ ظاہر ہے کہ وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت اس ابتدائی دَور میں ان کی نقلیں بھی ضرور کی جاتی ہونگی۔ علاوہ ازیں شاہانِ اسرائیل تخت نشینی کے بعد اپنے ہاتھ سے قدُس الاقداس کے نسخہ کی نقل کیا کرتے تھے (استثنا۱۷: ۱۸) اوریہی قُدس الاقداس کا نسخہ تاجپوشی کے وقت شاہانِ اسرائیل کے ہاتھوں میں رکھا جاتا تھا۔ (۲-سلاطین ۱۱: ۱۲، ۲ تواریخ ۲۳: ۱۱) مسیحی آبائے کلیسیا ٹرٹولین، ایپی فنیس اورآگسٹین ہم کو بتلاتے ہیں کہ علاوہ تورات کے دیگر کُتب مقدسہ بھی قُدس الاقداس میں رکھی جاتی تھں۔ اوریہودی مورخ یوسیفس اس بات کی تائید کرتا ہے، اور کتابِ مقدس سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے (یشوع ۲۴: ۲۶، ۲سلاطین ۲۲: ۸- ۱سموئیل ۱۰: ۲۵) پس ابتدامیں خدا کے خیمہ میں اور پھر ہیکل میں کُتبِ مقدسہ کے نسخے محفوظ رکھے جاتے تھے۔

(۲)

"انبیازادوں" کے مدرسوں میں جو بینوت، یریحو، جلجال اور بیت ایل وغیرہ میں تھے، کُتُبِ مقدسہ کی باقاعدہ تعلیم ضرور دی جاتی ہوگی (۱سموئیل ۱۹: ۱۹تا ۲۰۔ ۲سلاطین ۲: ۳۔ ۵، ۴: ۳۸: ، ۶: ۱وغیرہ) یہ انبیاءزادے" یہودی قوم کے ممتاز رُکن تھے اور انبیاء اللہ کے شاگرد اوراصحاب تھے۔ وہ قومِ یہود کے شاعر، مورخ، زبور، نویس اور مصنف تھے(عاموس ۷: ۱۴)۔ حضرت ہوسیع اور حضرت یوناہ وغیرہ نے انہی مدرسوں میں جنم لیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ " انبیاءزادے" کُتُبِ مقدسہ کی نقل ضرور کرتے ہوں گے، کیونکہ کون صحیح العقل شخص یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اہلِ یہود کے پاس سوائے اس نسخہ کے جو قدُس الاقداس میں محفوظ تھا کوئی اور نسخہ موجود نہیں تھا۔ یہ ایسا ہے جیسا کوئی کہے کہ گذشتہ صدی میں سوائے اس قرآن کے جو سلطانِ روم کی خاص ملکیت تھا اور خلیفہ المسلمین کی حیثیت سے اس کے پاس تھا اور کوئی نسخہ دنیائے اسلام یا ٹرکی میں موجود نہ تھا۔" انبیاء زادے" اہلِ یہود کے مذہبی پیشوا تھے۔ لہذا مذہبی کُتُبِ سماوی کے محافظ اور مفسر تھے۔ پس وہ کُتُبِ مقدسہ اوران کے متن کے الفاظ کی صحت کے محافظ تھے۔

(۳)

یوں تو شاہانِ اسرائیل بالعموم کُتُب مقدسہ کے محافظ تھے لیکن حزقیاہ بادشاہ کے دنوں میں بالخصوص کُتُب مقدسہ کی حفاظت کی گئی اوران کا مطالعہ نہایت اہتمام کے ساتھ کیا گیا۔(۲تواریخ ۳۱: ۴)۔ سلیمان کی امثال کی کتاب نقل کی گئی (امثال ۲۵: ۱) اورہیکل کے زبوروں کے طوماروں کے انبار کا ملاحظہ کیا گیا۔ ہم کُتُبِ مقدسہ کے عاشقوں کی تعداد کا کچھ اندازہ کرسکتے ہیں۔ جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ گانے والوں کی تعداد دوسواٹھاسی تھی۔(۱تواریخ ۲۵: ۷)حزقیاہ بادشاہ کے زمانہ میں اسرائیل کے مذہب کو بڑا فروغ حاصل تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہودی کُتُبِ مقدسہ اس کے زمانہ میں نہایت عزت، تعظیم اور احترام کی نظر سے دیکھی، پڑھی اور نقل کی جاتی تھیں۔ گواس کے جانشین بادشاہ مُرتد منسہ کے زمانہ میں کُتُب مقدسہ کی بے حُرمتی کی گئی۔ لیکن کوئی سلیم الطبع شخص یہ کہنے کو تیار نہ ہوگا کہ اس کے زمانہ میں کُتُبِ مقدسہ میں تحریف یا فتور واقع ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس بادشاہ کے عہد میں کُتُب مقدسہ کی تباہی اور بربادی کا خدشہ تھا نہ کہ ان کے محرف ہونے کا۔ بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ ایسے بادشاہ کے عہد میں کُتُبِ مقدسہ کی نقلیں بہت کم ہوئی ہوں گی اورجو موجود ہوں گی ان کو نہایت محفوظ جگہ میں رکھا گیا ہوگا۔لہذا اس بادشاہ کے زمانہ میں کتابت کی غلطیوں کا امکان یا کُتُبِ مقدسہ میں تحریف کا واقع ہوجانا ایک موہوم امر ہے۔

(۴)

آٹھویں صدی قبل از مسیح یہودی انبیاء خود اپنے الہامات کتابوں کی صورت میں لکھنے لگ گئے۔جب انبیاء نے دیکھا کہ بنی اسرائیل ان کے پیغامات کی پروا نہیں کرتے، توانہوں نے اپنے پیغامات کو کُل قوم کے افراد تک پہنچانے کے لئے اور آئندہ نسلوں پر اتمام حجت کی خاطر اپنی نبوتوں کو طوماروں پر لکھنا شروع کردیا۔ مثلاً حضرت یرمیاہ اوراس کے منشی بروک نے یرمیاہ کی نبوتیں قلمبند کیں۔(یرمیاہ ۳۶: ۱۔ ۴، ۹۔ ۳۲) یرمیاہ سے تقریباً ایک صدی پہلے حضرت یسعیاہ نے اپنی نبوتیں قلمبند کیں۔(یسعیاہ ۸: ۱۶) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یسعیاہ کے بعد تمام انبیاء اللہ اپنی نبوتوں کو قلمبند کرتے رہے۔ اور اُن کے شاگرد اور پیرواُن کو نقل کرتے رہے، جن کی کوشش یہی رہی کہ پوری صحت کے ساتھ ان انبیائے سابقین کی کُتُب کو نقل کرکے محفوظ رکھا جائے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے، کہ انبیائے اسرائیل اہلِ یہود کی خطاؤں اور گناہوں کو ہمیشہ ان پر جتاتے رہے اور ان کو ملامت کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنی اُمت پر یہ الزام نہ لگایا کہ تم نے کُتُبِ مقدسہ میں فتور ڈالا اور کلام اللہ کو محرف کردیا ہے۔ حالانکہ اگراس ابتدائی زمانہ میں کُتُبِ مقدسہ میں تحریف ہوگئی ہوتی تو انبیاء جو مامور من اللہ تھے۔ اس امر

کے لئے بنی اسرائیل کو ضرور ملامت کا نشانہ بناتے۔ ان بے خوف انبیاء کی معنی خیز خاموشی کُتبِ مقدسہ کی صحت اور کاتبوں کی امانتداری کی دلیل ہے۔

(۵)

زمانہ اسیری (از ۵۳۶ تا ۵۸۶ قبل مسیح) میں اہلِ یہود نے کُتبِ مقدسہ کا مطالعہ نہایت خلوصِ قلب اور محنت اور جانفشانی سے کیا، کیونکہ اَب اُن کی بادشاہی مٹ گئی۔ ان کا جاہ وجلال جاتا رہا۔ ان کی ہیکل مسمار اور شہید ہوگئی۔ ان کی عبادتیں بند ہوگئیں۔ ان کی قومیت جاتی رہی۔ ان کی آزادی چھن گئی۔ ان حالات میں ان کی کُتبِ مقدسہ ہی ایک جان سے زیادہ عزیز تھی جو ان کے پاس رہ گئی تھی۔ اور یہ کُتب ہی ان کی تسلی کا باعث تھیں۔ یروشلیم کی ہیکل کی بجائے جا بجا متعدد عبادت خانے قائم ہوگئے جن میں کُتب مقدسہ کی ہر سبت تلاوت ہوتی تھی (اعمال ۱۵: ۲۱، لوقا ۴: ۱۶، اعمال ۱۳: ۱۵) کُتبِ مقدسہ کی تلاوت کرنے والے صرف عبادت خانوں کے اراکین ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ جماعت کے شرکاء بھی ان کو عبادت خانوں میں پڑھا کرتے تھے۔(لوقا ۴: ۱۶، اعمال ۱۳: ۱۵ وغیرہ) جس سے فطرتاً قوم کے تمام افراد میں ان کُتب کے لئے محبت پیدا ہوگئی تھی۔ کُتب مقدسہ کا مطالعہ ان یہودی اسیروں کی تسلی کا باعث تھا۔ وہ" دن رات خداوند کی شریعت پر دھیان" رکھتے تھے۔ (مزمور ۱: ۲، ۱۱۹)۔ پس قدرتاً وہ اپنی کُتبِ مقدسہ کو نقل کرتے اور ان کی حفاظت کرنے میں ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

کُتبِ مقدسہ کے حصص کی صحت کا اندرونی ثبوت

علاوہ ازیں ایک اَور طریقہ سے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ آیا عبرانی کُتبِ مقدسہ میں دیدہ دانستہ اہلِ یہود نے تحریف کرکے ان کے الفاظ کو اَدل بدَل کیا ہے یا نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں بعض الہامی کتابوں کے حصص کا دوسرے ملہم مصنفوں نے اپنی کتابوں میں اقتباس کیا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے حصص ملاحظہ ہوں:

(۱۔) ۲ سموئیل باب ۲۲ اور زبور ۱۸

(۲۔) زبور ۱۴ اور زبور ۵۳

(۳۔) ۱ تواریخ ۱۶: ۸۔ ۲۲۔ زبور ۱۰۵ ۱۔ ۱۵

(۴۔) ۱ تواریخ ۱۶: ۳۳۔ زبور ۹۶

(۵۔) ۲ سلاطین باب ۱۹ و ۲۰ اور یسعیاہ ۳۷: ۳۸

(۶۔) ۲ سلاطین باب ۲۵ اور یرمیاہ ۵۲ باب

(۷۔) یسعیاہ باب ۱۵، ۱۶ اور یرمیاہ ۴۸ باب

مذکورہ بالا مقامات بطور مشتے نمونہ ازخروارے نقل کئے گئے ہیں اگرچہ ایسے تقریباً سومقامات موجود ہیں۔ ان مقامات کا مقابلہ کرنے سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان اقتباسات کے الفاظ بعض اوقات اصل عبارت سے مختلف ہیں کیونکہ بعد کی کتاب کے الہامی مصنفین نے اقتباس کرتے وقت اپنے حالات اور مطلب کے موافق اپنی کُتب میں نقل کرتے وقت اصل عبارت کے ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ یا ایک فقرہ کی جگہ دوسرا فقرہ لکھ دیا اور یوں کُتبِ مقدسہ کے مختلف مقامات میں ایک ہی عبارت کے مختلف الفاظ نمودار ہوگئے۔ اب مابعد کے زمانہ میں کُتبِ مقدسہ کے نقل کرنے والے کاتب اگر چاہتے تو ان مختلف مقامات کے الفاظ کے اختلافات کو نقل کرتے وقت مٹاسکتے تھے اور یوں ایک ہی عبارت کے الفاظ کو اصل اور اقتباس دونوں جگہ یکساں کرسکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا ہر گز نہ کیا۔ اور مختلف انبیاء کے مختلف صحائف کے اختلافِ الفاظ کو برقرار رکھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں بھی عبرانی کُتبِ مقدسہ کے نقل کرنے والوں نے دیدہ ودانستہ کبھی اپنے انبیاء کی کُتب کے الفاظ کو نہیں بدلا حالانکہ وہ اس آزمائش میں پڑ کر لغزش کھاسکتے تھے۔

فصلِ دوم

عبرانی کُتب مقدسہ کی صحت کی خارجی شہادت

ہم نے اس باب کی فصلِ اول کے شروع میں لکھاہے کہ ابتدائی زمانہ میں جو تقریباً ایک ہزار سال کا ہے عبرانی کُتبِ مقدسہ کی صحت پر بہت خارجی شہادت موجود نہیں۔ تاہم جو شہادت ہمارے پاس موجود ہے وہ نہایت اہم قسم کی ہے۔

(۱۔) پہلا گواہ سامری نسخہ تورات

قوم سامری

ہمارا پہلا گواہ سامری نسخہ تورات ہے۔ سامری "بابل اور کوتہ اور عوّا اور حمات اور سفر دائیم کے لوگوں" کی نسل تھے جن کو اسیری میں فاتحین نے ۷۲۲ قبل مسیح اسرائیل کے دس قبیلوں کی بادشاہی کو تباہ برباد کرنے کے بعد لابسایا تھا (۲۔سلاطین ۱۷: ۶، ۲۴) مابعد کے زمانہ میں ان غیر یہود پردسیوں کی تعداد میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا (۴: ۱، ۹، ۱۰) ان غیر یہود لوگوں نے ان یہودیوں سے جو اسیری میں نہیں گئے تھے شادی بیاہ کرلئے (۲سلاطین ۲۳: ۱۹، ۲۰، ۲ تواریخ ۳۴: ۶، عزرا ۶: ۲۱)ان کی اولاد" سامری "کہلاتے تھے، (۲سلاطین ۱۷: ۲۹)۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنے قومی معبود اوربُتوں کی پرستش لے آئے تھے اورساتھ ہی کنعان اور قوم اسرائیل کے معبود یہوواہ کو خوش کرنے کی غرض سے اس کی پرستش بھی کیا کرتے تھے۔(۲سلاطین ۱۷: ۲۶)۔

جب اہل یہود بابل کی اسیری سے واپس آئے تو وہ ان مخلوط النسل سامریوں کو ان کے ناطوں اور بُتوں کی وجہ سے حقیر سمجھتے تھے۔ جب نحمیاہ نے ۵۳۰ قبل مسیح یروشلیم کی دیواروں کو بنانا شروع کیا تو سامریوں نے بھی اس نیک کام میں حصہ لیناچاہا لیکن ان کی یہ پیشکش نفرت کے ساتھ رد کی گئی۔ اہلِ یہود نے ان کو اپنی عبادت اور دینی رسوم وغیرہ سے خارج کردیا۔ پس دونوں قوموں میں حددرجہ کا عناد پیدا ہوگیا (عزرا ۴: ۱) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سامریوں نے یروشلیم کے بنانے میں خلل ڈالا (عزرا ۴: ۷، ۲۴۔ نحمیاہ ۴: ۷۔ ۱۳)۔انہوں نے یہودی زمینوں پر قبضہ کرلیا اوران کے مالکوں کو غلام بنالیا۔ ۳۳۴ قبل مسیح میں نحمیاہ نے منسہ کو جو کاہنوں کی اولاد تھا ناجائز شادی کے معاملہ میں یروشلیم سے ملک بدر کردیا (نحمیاہ ۱۳: ۲۸) اس نے سامریوں کے ہاں جا پناہ لی کیونکہ سامری ان تمام لوگوں کو جو یہودی جماعت سے خارج کئے جاتے تھے خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ دشمنی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ ایک موقعہ پر انہوں نے یہودی مردوں کی لاشوں کو ہیکل میں پھینک کر اسے ناپاک کرنے سے بھی باک نہ کیا۔ ایک اور موقعہ پر انہوں نے تمام گلیلیوں کو جو عید منانے کے لئے سامریہ میں سے گذر کر یروشلیم جارہے تھے قتل کردیا۔ مورخ یوسیفس اس قسم کے متعدد واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ سامری قوم کے مفصل حالات ۲۔سلاطین ۱۷: ۲۴، ۲۴: ۱۵، ۱۶ اور عزرا اور نحمیاہ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان ارامی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔

جب سامریوں کو منسہ مل گیا جو کاہنوں کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے قربانیاں چڑھاسکتا تھا تو انہوں نے سکندرِ اعظم کی جنگِ اسس میں مدد کرنے کے عوض عزیزیم پہاڑ پر (جو موجودہ نابلس کے قریب ہے) ہیکل بنانے کی اس سے اجازت حاصل کرلی۔ وہاں وہ یہودی شریعت کے مطابق قربانیاں چڑھایا کرتے تھے۔ اب سامری قوم سلطنتِ اُردن میں قدیم سکم کے نزدیک نابلس میں بستی ہے۔

انجیل کا مطالعہ ظاہر کردیتا ہے کہ یہود اور سامری ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ سیدنا مسیح کے زمانے میں سامری پردیسی شمار کئے جاتے تھے (لوقا ۱۷: ۱۸)۔ ان کے مذہب میں مشرکانہ عناصر بھی موجود تھے (یوحنا ۴: ۲۲) وہ یہودی زائرین

کی جو یروشلیم جایا کرتے تھے سخت مخالفت کیا کرتے تھے (لوقا ۹: ۵۲) حتیٰ کہ بعض اوقات وہ ان کو لُوٹ بھی لیا کرتے تھے ۔(یوحنا ۸: ۴۸وغیرہ) یہودی عبادت خانوں میں ان پر علانیہ لعنت کی جاتی تھی۔ یہودی عدالتوں میں ان کی گواہی قابلِ سماعت شمار نہیں کی جاتی تھی ۔ وہ کہتے تھے کہ " جو شخص کسی سامری کے ہاں روٹی کھاتا ہے وہ سور کا گوشت کھاتا ہے۔"

سامری تورات

لیکن دونوں اقوام کے پاس ایک شئے تھی جس پر دونوں اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے، اور وہ تورات تھی۔چونکہ دونوں قوموں میں صدیوں سے کسی قسم کا برتاؤ نہیں تھا(یوحنا ۴: ۹) لہذا تورات جو سامریوں کے پاس تھی ان کے باہمی عناد سے پہلے کی تھی۔ یہ مخاصمت اتنی قدیم تھی کہ سامری لوگ تورات کے علاوہ یہود کے کسی دوسرے صحیفہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ پس جو تورات کا نسخہ سامریوں کے پاس تھا وہ نحمیاہ اور عزرا کے زمانہ سے بہت پہلے کا تھا ۔ پس اس کا متن مسیح سے پانچ صدیاں قبل سے بھی پہلے کا ہے اور بلاشک وشبہ قدیم ترین ہے۔ سامری تورات جو نابلس میں محفوظ ہے قدیم عبرانی رسم الخط میں لکھی ہے اور یہ امر سامری تورات کی قدامت ثابت کرتا ہے۔

جب نحمیاہ نے منسہ کو یروشلیم سے خارج کردیا تھا تووہ تورات کا نسخہ اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ پس یہ نسخہ سامری تورات کا جدِ امجد ہوا۔ جو نسخہ سامریوں کے پاس اب موجود ہے وہ گیارہویں صدی مسیحی کا ہے۔ منسہ کا نسخہ پشت در پُشت نقل ہوتا چلاآیا ہے۔

سامری تورات کا ترجمہ دیگرزبانوں میں بھی کیا گیاہے ۔ جب اہلِ اسلام نے ۶۳۷ء میں ارضِ مقدس کو فتح کیا اور سامری بھی عربی بولنے لگے تو گیارہویں صدی کے صور کے ابوالحسن نے سامری تورات کا ترجمہ عربی میں کیا جس کی ابو سعید نے تیرھویں صدی میں نظر ثانی کی۔

پس سامری تورات کا نسخہ سیدنا مسیح سے صدیوں پیشتر دیگر تمام عبری اور عبرانی نسخوں سے جدا ہو گیا اوراس کا کنعان کے تمام نسخوں سے اڑھائی ہزار سال تک قطع تعلق رہا۔ لہذا سامری تورات اوریہودی تورات کا باہمی مقابلہ کرنے سے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ موجودہ تورات کے متن کے الفاظ وہی ہیں جو اڑھائی ہزار سال پہلے تھے یا کہ نہیں۔ ان کا مقابلہ ہم پر یہ امر عیاں کردیتا ہے کہ ان دونوں نسخوں کے متعدد الفاظ ، فقرات اور آیات میں فرق ہے لیکن یہ اختلافات اہم قسم کے نہیں ہیں۔اگرچہ یہ اختلافات تعداد میں چھ ہزار کے قریب ہیں لیکن ان میں سے اکثر اختلافات ہجا کے ہیں یاسہو کاتب ہیں۔ ان چھ ہزار اختلافات میں سے دوہزار ایسے ہیں جو سپٹیواجنٹ (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) ترجمہ کے اصل عبرانی متن کے مطابق ہیں۔ مثلاً خروج ۱۲ : ۴۰ میں ہے کہ بنی اسرائیل کو ملک مصر میں بودوباش کرتے ہوئے ۴۳۰ برس ہوئے تھے(دیکھو گلتیوں ۳: ۱۷) یہی عدد سپٹیواجنٹ میں لکھا ہے ۔ سامری نسخہ اور سپٹیواجنٹ دونوں میں پیدائش ۱۷: ۱۴ میں الفاظ، "جس کا" کے بعد" آٹھویں دن " لکھے ہیں ۔ پادری ایس کیہن Rev.S.Kehan نے سامری تورات اور قمران کے طُومار کا (جس کا ذکر آگے آئے گا)مروجہ عبرانی متن سے مقابلہ کرکے ثابت کردیا ہے کہ تینوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ، وہ درحقیقت نہایت معمولی اور خفیف قسم کے ہیں۔اور کہ سامری نسخہ کا پایہ اعتبار رفیع ہے۔ مثلاً سامری تورات میں ہے " قائن نے اپنے بھائی ہابل سے کہا ۔ آؤ کھیت میں چلیں۔"(پیدائش ۴: ۸) " اس نے ان کو غلام بنالیا۔" (پیدائش ۴: ۲۱) " بنی اسرائیل کو مصر اور کنعان میں بدوباش کرتے چار سو تیس برس سے ہوئے ۔(خروج ۱۲ : ۴۰)۔ مقابلہ کرو گلتیوں ۱۷:۳) وغیرہ۔ ان اختلافات کی یہ چند مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ نہایت معمولی قسم کے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد علماء اور نقاد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عام طور پر یہودی عبرانی تورات کو سامری نسخہ پر فوقیت حاصل ہے۔

بہر حال ان دونوں نسخوں کا مقابلہ کرنے سے ہم پر یہ امر منکشف ہوجاتا ہے کہ ہماری موجودہ تورات سوائے معدودے چند اختلافات کے قریباً لفظ بہ لفظ وہی ہے جو ابتدائی زمانہ کے آخر میں موجود تھی اوراس میں کوئی ایسا فرق واقع نہیں ہوا جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ موجودہ تورات کی پانچ کتابیں بجنسہ وہ نہیں ہیں جو ان کے مصنفین نے لکھی تھیں۔ حق تو یہ ہے کہ عہدِ عتیق کی کُتب کے تمام مجموعہ میں سے تورات کی کتابیں ہی ایسی ہیں جن کا عبرانی متن سب سے زیادہ محفوظ ہے۔

(۲۔)دوسرا گواہ۔آثارِ قدیمہ

آثارِ قدیمہ کی شہادت اور بائبل کے بیانات

آثار قدیمہ کے علم نے گذشتہ پچاس سالوں میں حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں جن سے عبرانی کُتبِ مقدسہ کے مضامین اور بیانات کی صحت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان آثارِ قدیمہ کی شہادت نہایت زبردست ہے کیونکہ وہ صدیوں سے زیرزمین مدفون رہے ہیں اوراب گویا اپنی قبروں سے نکل کر عبرانی کُتب مقدسہ کی صحت پر گواہی دیتے ہیں۔

(۱)

حال ہی میں کلدیوں کے اُور (پیدائش ۱۵ : ۷) کی کھدائی ہوئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہاں سمیری سلطنت کے زبردست بادشاہ سیدنا مسیح سے تین اور چار ہزار سال پہلے حکمران تھے۔ ان کی زبان بعض باتوں میں موجودہ تُرکی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ اس قدیم زبان میں(جو غیر سامی تھی) مسوپوتامیہ یا بابل کا قدیم نام عدن تھا۔ سیمری موحد تھے جو بعد میں بتوں کی پوجا کرنے لگ گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو " خدا کے بیٹے" اور دوسروں کو" آدمی کے بیٹے " (پیدائش ۶ : ۳) کہتے تھے۔ آثارِ قدیمہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس غیر سامی تہذیب کی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب طوفان نے سب کچھ ملیا میٹ کردیا تھا (پیدائش ۷: ۲۱، ۲۴) ۔۱۹۳۵ء میں فرات کے وسط ماری کے مقام سے اور شمال مغربی مسوپوتامیہ سے اور نوزو کے مقام سے جو شمال مشرقی مسوپوتامیہ میں واقع ہے آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو الواح دستیاب ہوئی ہیں جن سے ابرہام، اضحاق اور یعقوب کے زمانہ رسوم ورواج اور تاریخ پر زبردست روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ پیدائش کی کتاب کے بیانات کی صحت میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش نہیں۔

پیدائش کی کتاب کے چودھویں باب میں لکھا ہے کہ حضرت ابرہام کے زمانہ میں چند بادشاہوں نے متحد ہو کر مشرقی کنعان پر حملہ کردیا تھا۔آثارِ قدیمہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کے حملے عموماً ہوا کرتے تھے۔ ایلبرائٹ Albirght نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جس راہ سے یہ لشکر گیا تھا، اس پر چند مشہور شہر واقع تھے جن کا اس زمانہ کے دوصدیوں کے بعد نام ونشان بھی مٹ گیا تھا۔ پس یہ شہر اپنی قبروں سے نکل کر پیدائش کی کتاب کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

آثارِ قدیمہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ سیدنا مسیح سے قریباً بیس صدیاں قبل حضرت ابرہام کے زمانہ میں سدوم اور عمورہ شہر تھے جو تباہ برباد ہوگئے تھے(پیدائش ۱۹ باب) ۔

حضرت ابرہام کے شہر اُور کی کھدائی کرنے سے اس زمانہ کا پتہ چل گیا ہے جس کا پیدائش کی کتاب میں ذکر آیا ہے۔ اب ہم کو معلوم ہوگیا ہے کہ ابرہام دوسرے لوگوں کی طرح کال کی وجہ سے مصر گیا تھا کیونکہ اس زمانہ میں مصر کا ملک اردگرد کے ممالک کو غلہ مہیا کیا کرتا تھا (پیدائش ۱۲ : ۱۰) اس کے بعد پیدائش کی کتاب کے بیان کے مطابق وہ جرار کو گیا تھا۔ آثارِ قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصر اور جرار جانے کے درمیانی عرصہ یہ مقام ایک غلہ خیز خطہ تھا جس کو فسلطیوں نے بنایا تھا(پیدائش ۲۰۔۱)۔

راس شمرا کی تختیوں پر خدا کے نام ایل ، الوہیم اور ایل ایلیون پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر لینگڈن Dr. Langdon کہتا ہے کہ خدا کے یہ نام سیدنا مسیح سے دو ہزار برس پہلے عبریوں میں رائج تھے۔

پیدائش میں آیا ہے کہ یعقوب کی بیوی راخل نے اپنے باپ لابن کے بُتوں کو چرالیا تھا(۳۱: ۱۹) نوزی کے مقام میں جو تختیاں دستیاب ہوئی ہیں ان میں سے ایک تختی سے ظاہر ہے کہ خاندان کے بُتوں پر قبضہ کرنے سے وراثت پراثر پڑتا تھا۔ پس جب راخل نے بُتوں کو اپنے قبضہ میں کرلیا تو اس کا اصلی مدعُا یہ تھا کہ اپنے خاوند کو اپنے باپ کی جائداد کا وارث بنائے اورلابن نے بھی اسی خدشہ کے مارے یعقوب کا پیچھا کیا تھا۔

یوسیفس کہتا ہے کہ حضرت یوسف اور اس کے بھائی مصر میں اس زمانہ میں گئے تھے جب ہکسوس Hyksos خاندان کے بادشاہ مصر کے فرعون تھے۔ آثارِ قدیمہ نے اس امر کی تصدیق کردی ہے اور دو عبری ناموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے یعنی یعقوب اور حور کے نام بھی ملتے ہیں۔

(۲)

پروفیسر یہودا (A.S.Yahuda) نے یہ ثابت کردیا ہے کہ پیدائش اور خروج کی کتابوں میں ملکِ مصر کے جو حالات درج ہیں وہ بعینہ وہی ہیں جن کا پتہ آثارِ قدیمہ سے ہم کو ملتا ہے۔ ان انکشافات سے ان دونوں کتابوں کے الفاظ، فقرات اور اسلوبِ بیان پر ایسی روشنی پڑتی ہے کہ اب ہم ان کتابوں کے بیانوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔آثارِ قدیمہ ان بیانات کی صحت کی نہ صرف عام طور پر تصدیق کرتے ہیں بلکہ بعض خاص واقعات کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ مثلاً خروج کے پہلے باب میں لکھا ہے کہ مصریوں نے بنی اسرائیلیوں پر تشدد کرکے ان سے سخت مشقت کا کام لیا اور انہوں نے فرعون کے لئے ذخیرہ کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے ۔ آثارِ قدیمہ نے ان دونوں شہروں کو کھود نکالا ہے۔ ان سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ سیدنا مسیح سے قبل چودہویں صدی کے پہلے ربع میں بنی اسرائیل کو ملکِ مصر سے نکال لائے تھے۔(۱۵ باب)

(۳)

راس شمرا کی الواح سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ موسوی شریعت کی قربانی کی رسوم جن کا ذکر تورات میں آیا ہے فی الواقع عمل میں آیا کرتی تھیں اور عبادت کے لئے ایک خیمہ گاہ ہوتا تھا۔ استثنا کی کتاب میں صلہ رحم کی شادی کا ذکر ہے (۲۵: ۵، ۱۰ ، روت ۳، ۴ باب)۔ اس قسم کی شادیاں نوزی میں اور اسوریوں کے قانون اور حتیوں کے قانون کے مطابق جائز تھیں ۔ پس آثارِ قدیمہ نے ان باتوں کی تصدیق کردی ہے۔

(۴)

آثارِ قدیمہ نے کنعان کے شہروں کے کھنڈرات اوران کی قدیم زندگی کو بے نقاب کردیا ہے۔ ان کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ عبرانی کُتُبِ مقدسہ کے بیانات صحیح ہیں۔ پروفیسر گارسٹنگ Prof. Garstang نے یریحو اور کنعان کے دیگر مقامات کی کھدائی کی ہے۔ یریحو کی دیواروں کے فوٹو یہ ثابت کرتے ہیں کہ یشوع کی کتاب (۶ باب) کے بیانات بالکل درست ہیں اور چودھویں صدی قبل از مسیح کے پہلے نصف میں دیواروں کا گرنا ایک امرِ واقعہ تھا۔ یہ دیواریں باہر کی جانب چپٹی پڑی ہوئی ہیں اور پھونکے ہوئے شہر میں کھانے کے لئے چیزیں تیار ملی ہیں جن کو ہاتھ بھی لگایا نہیں گیا تھا۔

طل امرنہ کے خطوط میں عبریوں کے حملوں کا ذکر ہے اور یشوع کا نام بھی لکھا ہے۔ یشوع نے شہر دبیر کو فتح کیا تھا۔(۱۰ : ۳۸)۔ اس شہر کا بھی پتہ چل گیا ہے۔ اس کا قدیمی نام قریت سفر تھا(۱۵ : ۱۵) ۔آثارِ قدیمہ سے ثابت ہے کہ یہ شہر تیرھویں صدی میں فتح کیا گیا تھا ۔ ایک اور شہر بیت صور کا جس کا ذکر یشوع میں آیا ہے(۱۵ : ۵۸) پتہ مل گیا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے علم نے ثابت کردیا ہے کہ یہ شہر پہلے برباد ہوچکا تھا اور پھر دوبارہ

بارھویں صدی قبل مسیح آباد ہوا جس سے اس کتاب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکیس شہر کے قدیم مقام سے مٹی کے جو برتن دستیاب ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ شہر تیرھویں صدی میں برباد ہوا تھا۔ یہ یشوع کی کتاب کے بیان کے عین مطابق ہے (یشوع ۱۰ : ۳۱)۔لکیس کا قدیم مقام طل دوبیر ہے ۔یہاں کی کھدائی کرنے سے حروفِ تہجی دستیاب ہوئے ہیں جو ۱۲۶۲ قبل مسیح سے بھی پہلے کے ہیں۔ اس کی دیواروں کے باہر مندر کھنڈرات میں قدیم مصری جواہرات ملے ہیں جو بھونرے کی شکل پر تراشے جاتے تھے اور جس پر نشان ہوتے تھے۔ یہ جواہرات امین ٹوپ سوم، Amenhetop کے ہیں۔ علاوہ ازیں رجعام، سنیخرب اور نبوکد نصر بادشاہوں کے متعلق بھی آثار قدیمہ کی شہادت موجود ہے۔

یشوع اور قضاۃ کی کتابوں کی تاریخیں اوران کے بیانات ہو بہو اس زمانہ کے ملک مصر کے تاریخی حالات کے عین مطابق ہیں۔ شمجر بن عنات (قضاۃ ۳: ۳۱، ۵ : ۶) آثارِ قدیمہ کےمطابق ایک مصری امیر البحر تھا۔ سر فلینڈرس پیٹری Sir. Flanders Patri کو غزہ (قضاۃ ۱۶ : ۱ وغیرہ) میں ایک ایسا ہتھیار ملا ہے جو گھوڑے یا گدھے کے جبڑے سے بنا ہے جس کےدانت نہایت تیز ہیں۔ صاحب موصوف کہتے ہیں کہ یہ بڑا زبردست اور کارآمد ہتھیار ہے ۔ اسی قسم کے ہتھیار کو سمسون نے استعمال کیا تھا(قضاۃ ۱۵ : ۱۵تا ۱۶)۔ فلسطی شہروں کی کھدائی نے یہ ظاہر کردیا ہے کہ ان کے گھروں کے کھمبے لکڑی کے بنے ہوتے تھے جوایک پتھر کی سلِ پر رکھے جاتے تھے۔ اور سمسون جیسا طاقتور انسان ان کو ان کی جگہ سے کھسکا کر اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکتا تھا(قضاۃ ۱۶ : ۲۹)پس یہ انکشافات عبرانی کُتبِ مقدسہ کےبیانات کی تصدیق کرتےہیں۔

(۵)

سطورِ بالامیں ہم ذکر کرچکے ہیں آثار قدیمہ کے ماہرین نے جوبیانات دبیر کے متعلق شائع کئے ہیں ۔ وہ یشوع کی (۱۰ : ۳۹) کی تصدیق کرتے ہیں۔ اسی طرح لکیش کی بربادی (۱۲۳۰ قبل مسیح) سے پہلے تیرھویں صدی کی ابتدامیں ۔بنی اسرائیل کا یریحو اور بیت ایل کو تباہ کرنا آثارِ قدیمہ سے ثابت ہے۔ اس علم نے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ بنی اسرائیل نے تیرھویں صدی قبل از مسیح کے آخر تک آہستہ آہستہ یردن کی دونوں جانب پہاڑی مقاموں میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ مجدو اور بیت شان کی کھدائی سے ظاہر ہے کہ یہاں کے باشندے پُشتوں تک بنی اسرائیل کے پے درپے حملوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

ارضِ مقدس کے مقامات کی کھدائی سے ظاہر ہے کہ بارہویں صدی کے شروع میں کنعان کے ساحل پر فلسطی آباد ہوگئے تھے جنہوں نے غزہ سے لے کر عکردن تک ملک پر قبضہ کرلیا تھا ۔ فلسطیوں کی کلچر جداگانہ تھی جووہ اپنے ہمراہ لائے تھے ، لیکن وہ مفتوح کنعانیوں سے جلدی گھل مل گئے ، چونکہ ان کے قبضہ میں زرخیز مقامات تھے انہوں نے دیگر اقوام پر جلدی غلبہ حاصل کرلیا ۔ گیارھویں صدی قبل از مسیح کے درمیان میں فلسطیوں نے اسرائیلیوں کو ابنِ عزر کے مقام پر شکست دی اور عہد کے صندوق پر قبضہ کرکے سیلا کر برباد کردیا۔ یہوداہ کے دیگر قصبوں کے آثار بھی ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے مغربی کنعان کو تباہ کردیا اور اسرائیلیوں کو اپنا تحت بنالیا۔ لیکن شاؤل نے ۱۰۲۰ قبل مسیح کے قریب اپنی سلطنت کے ابتدائی ایام میں ان کا جوُا اتار پھینکا لیکن فلسطیوں نے اس کو جبوعہ پر شکست فاش دی ۔ پر بنی اسرائیل نے داؤد کے زمانہ میں ۹۹۰ قبل مسیح کے قریب فلسطیوں کا زور ایسا توڑدیا کہ ان کو پھر کبھی غلبہ حاصل نہ ہوسکا اور وہ تاجر ہوگئے ۔ کیا یہ بیانات عبرانی کُتبِ مقدسہ کے واقعات کی حیرت انگیز طور پر تصدیق نہیں کرتے ؟

جب ہم قضاۃ کے زمانہ کے آثارِ قدیمہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ بارھویں اور گیارھویں صدی قبل از مسیح میں ۔بنی اسرائیل کی زندگی نہایت سادہ تھی اوران میں کلچر اور تہذیب کا نام بھی نہ تھا۔ تیرھویں صدی قبل مسیح قریب کنعانیوں کی طرزِ زندگی میں اور اسرائیلیوں کی طرزِ رہائش میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے ۔ حملہ آور

اسرائیلی نیم خانہ بدوش وحشی تھے جو قبائیلی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس زمانہ کے آثار قدیمہ کتاب قضاۃ کی آیت " ہر شخص جو کچھ اس کی نظر میں اچھا معلوم ہوتا وہی کرتا تھا۔"(۱۷: ۶) کی تفسیر ہیں اور اس زمانہ کے صحیح حالات کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

قدیم یروشلیم ، سامریہ اور کنعان کے دیگر مقامات کی کھدائی کی گئی ہے اور ان مقاموں کی دریافتیں عبرانی کُتُبِ مقدسہ کی کُتُبِ سموئیل وسلاطین و تواریخ پر نہ صرف روشنی ڈالتی ہیں ، بلکہ حیرت انگیز طور پر ان کی تصدیق بھی کرتی ہیں۔ سکم، بیت ایل، عی، یریحو، بیت شمس وغیرہ شہروں کا پتہ لگا چکا ہے۔

سیلا کا مقام وہ تھا جہاں قضاۃ کے زمانہ میں خداوند کا صندوق اور خیمہ گاہ ہوتا تھا(۱سموئیل ۱: ۹، ۲: ۲۲وغیرہ) آثار قدیمہ نے اس شہر کا بھی پتہ کھود نکالا ہے ۔ یہ خیمہ ہیکل سے پہلے استعمال ہوتا تھا اور بیابان سے ارضِ مقدس میں گیا تھا اور سیلا میں رہا ، آثارِ قدیمہ نے اس خیمہ پر نہایت دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ گو تاحال اس خیمہ کی کوئی تصویر یا پارچہ وغیرہ نہیں ملا تاہم یہ معلوم ہے کہ رسولِ عربی کی بعثت سے پہلے عربوں میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے بُتوں کو ایک خیمہ میں رکھتے تھے جو قرمزی رنگ کے چمڑے کا ہوتا تھا۔ یہ خیمہ بعض اوقات شتر کی پیٹھ پر لاد کر میدانِ جنگ میں لے جایا جاتا تھا ، اور قبیلہ کی معزز ترین عورتیں اس کی محافظ ہوتی تھیں۔ اس خیمے کے مختلف نام ہوا کرتے تھے۔ اس کا ایک نام" قبہ" تھا۔ یہ لفظ پالمیرا(Palmyra) کے ارامی کتبوں میں بھی پایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی مسیحی صدیوں میں یہ رواج پالمیرا کے لوگوں میں بھی موجود تھا۔ لفظ" قبہ" صرف ایک دفعہ کُتُب عہد عتیق میں آیا ہے ۔ (گنتی ۲۵: ۸)جہاں اس کا ترجمہ " خیمہ " کیا گیا ہے۔ یہ امر بھی دلچسپی کا موجب ہے کہ پالمیرا کے لوگوں کا خیمہ قرمزی رنگ کے چمڑے کا ہوتا تھا اور بنی اسرائیل کا خیمہ بھی قرمزی سرخ رنگ کا تھا(خروج ۲۶: ۱۴) اس قسم کے انکشافات نہ صرف عبرانی کُتُبِ مقدسہ کی تفاصیل کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ ان کی چھوٹی چھوٹی اور معمولی تفصیلوں کی صحت کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔

عہدِ عتیق کی کُتُب میں متعدد قدیم شہروں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے بہت سے مقامات کی کھدائی ہوگئی ہے اور برآمدہ اشیاء اور کتبوں سے کتابِ مقدس کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ عبرانی کُتُبِ مقدسہ کے بیانات نے ہی آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو قدیم مقامات کے کھوج لگانے میں مدد دی ہے۔ مثلاً انہی بیانات کے ذریعہ معلوم ہوگیا ہے کہ جزر کا قدیم مقام وہی ہے جو موجودہ زمانے میں طل جزر کھلاتا ہے۔ یہاں پہلی صدی قبل از مسیح کے کتبے ملے ہیں جن پر الفاظ" جزر کی حد" لکھے ہیں۔ بائبل کے بیان ہی سے اب ثابت ہوگیا ہے کہ لکیش کا قدیم شہر اس جگہ آباد تھا جہاں اب طل الدویر ہے۔ گلیل کا شہر حصُور (یرمیاہ ۴۹: ۳۳وغیرہ) موجودہ طل القدہ کے مقام پر آباد تھا۔اسی طرح قدیم شہر سیلا(یشوع ۱۸: ۱وغیرہ) ساؤل کا جبعہ(۱۔سموئیل ۱۵: ۳۴ جو طل الفل ہے) بیت ایل ، بیت صور وغیرہ کے مقامات کا صرف عبرانی کُتُبِ مقدسہ کے بیانات سے ہی پتہ لگ سکا ہے ، حالانکہ سیلا مسیح سے گیارہ صدیاں پیشتر آگ سے تباہ ہوگیا تھا جس کا ذکر ۱۔سموئیل ۴باب میں بھی ہے اور یرمیاہ نبی کے وقت میں بھی وہ ویران تھا۔ اسی طرح جبعہ بھی آگ سے جل کر خاک سیاہ ہوگیا تھا اور اس کا ذکر قضاۃ ۲۰ باب میں آیا ہے۔ آثارِ قدیمہ نے کُتُبِ مقدسہ کے بیانات کے ذریعہ بیت ایل کا پتہ لگالیا کہ وہ اسی مقام پر آباد تھا جہاں موجودہ بیطین واقع ہے۔ بیت صور کا بھی اسی طرح سراغ ملا کہ وہ موجودہ خربت الطبیقہ کے مقام پر واقع تھا۔ عبرانی کُتُبِ مقدسہ میں جن قدیم شہروں کا ذکر ہے ان میں سے اکثر کا زمانہ اور تاریخ علمِ آثارِ قدیمہ نے متعین کردیا ہے جن سے ان کتابوں کے بیانات کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً جن لاویوں کے شہروں کا ذکر یشوع ۲۱ باب اور ۱ تواریخ ۶ باب میں آیا ہے ان کی قدامت کو علمِ آثار قدیمہ نے ثابت کردیا ہے اور اب تمام علماء یہ تسلیم

کرتے ہیں کہ وہ مسیح کے دس صدیاں پہلے آباد تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونو عبرانی کتابوں کی فہرستیں ۹۷۵ قبل مسیح اور ۹۵۰ قبل مسیح کے درمیان بنائی گئی تھیں گو ان شہروں کی تاریخ فتح کنعان سے بھی پہلے کی ہے۔

(۶)

علمِ آثارِ قدیمہ نے ثابت کردیا ہے کہ اسرائیلی بزرگوں حضرت ابراہام، یعقوب، یوسف، موسیٰ، یشوع، جدعون، سمسون، ساؤل، داؤد اور سلیمان وغیرہ کے زمانہ کے حالات ہُو بُہو وہی تھے جو عبرانی کُتبِ مقدسہ میں مندرج ہیں۔ ماہرین کو تاحال قدیم ترین اسرائیلی قلعہ بندی کا نمونہ، صرف ساؤل کا قلعہ ملا ہے جو طل الفل کی چوٹی پر یروشلیم سے تین میل شمال کی جانب واقع ہے اور ۱۰۲۰ قبل مسیح کے قریب کا ہے۔ آثارِ قدیمہ سے ظاہر ہے کہ داؤد کی موت ۹۲۰ قبل مسیح کے قریب) کے بعد قومِ اسرائیل تجارت اور صنعت وحرفت کی جانب رغبت رکھنے لگ گئی تھی۔ صور اور صیدا نے (جو سلیمان کے دوست حیرام کی بادشاہی میں شامل تھے) فلسطیوں کے زوال سے فائدہ اٹھا کر اپنی تجارت کو بحر متوسط کے مغرب تک پھیلادیا تھا۔

علمِ آثارِ قدیمہ ثابت کرتا ہے کہ سلیمان کا زمانہ کنعان کی تاریخ اور تہذیب میں نہایت شاندارزمانہ تھا اور کہ سلاطین کی پہلی کتاب کے بیانات صحیح ہیں جن کا تعلق اس شاندار زمانہ سے ہے (۱۰: ۲۷وغیرہ) ۔ ماہرین نے سلیمان کے اصطبل تک کھود نکالے ہیں جن کا ذکر ۱۔سلاطین (۹: ۱۵ تا ۱۹) میں آیا ہے۔

حضرت داؤد خدا کے لئے ایک عالی شان ہیکل بنوانا چاہتے تھے کیونکہ ان کے عہد تک اوران کے زمانہ میں بھی " خدا کا صندوق پردوں کے اندر" ہی تھا۔ لیکن وہ اپنی حینِ حیات میں یہ مقدس فرض ادا نہ کرسکے۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں ہیکل کے لئے ایک وسیع قطہ زمین خرید لیا۔(۲۔سموئیل ۲۴: ۲۱ تا ۲۴) اور عمارت کے لئے لوہا، پتھر ، لکڑی وغیرہ اور سونے چاندی کے ظروف وغیرہ فراہم کرلئے اور مرنے سے پہلے اپنے جانشین حضرت سلیمان کو وصیت کرگئے کہ وہ اس ہیکل کی تعمیر اور تکمیل کرے (۱۔تواریخ ۲۲: ۱۱ تا ۱۹)۔

سلیمان نے اپنی حکومت کے چوتھے سال (۹۶۶ قبل مسیح) ہیکل کی عمارت کی تعمیر کے کام کو شروع کیا اور سات سال بعد (۹۵۹ قبل مسیح) اس نے یہ مبارک کام ختم کیا۔(۲۔تواریخ ۲ باب تا ۷ باب) حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں اس ہیکل کا نام ونشان بھی نابود ہوگیا تھا اور علماءُ کا خیال تھا کہ اس کے آثار کا ملنا امرِ محال ہے لیکن اب ماہرین آثارِ قدیمہ نے اس ہیکل اوراسکے مختلف مقامات کا پتہ لگالیا ہے۔ انہوں نے بیرونی احاطہ کی دو قربان گاہوں اور اندرونی مقدس کی قربان گاہوں کو بھی کھود نکالا ہے۔ ان کو وہ ظروف بھی مل گئے ہیں جن کا ذکر کتابِ مقدس میں آیا ہے اور جو قربانیوں کے وقت استعمال ہوتے تھے(ٹائمز آف انڈیا بابت اگست ۱۹۶۴ء صفحہ ۱) آثارِ قدیمہ نے ان تمام بیانات کی تفاصیل کی تصدیق کردی ہے جو تواریخ کی دوسری کتاب (از ۲ باب تا ۷ باب) اور سلاطین کی پہلی کتاب کے ۸، ۹ باب میں لکھی ہیں۔)

سامریہ کی بادشاہی کے حالات بھی وہی ثابت ہوتے ہیں جن کا بیان کُتبِ مقدسہ میں آیا ہے۔ چنانچہ نویں صدی قبل از مسیح سے چھٹی صدی قبل از مسیح کے زمانہ میں سامریہ کی قلعہ بندیوں کے حالات (جن کا تعلق بادشاہ عمری کے خاندان از ۸۴۲ ق م تا ۸۷۰ ق م) سے اور یاہو کے خاندان (از ۴۴۷ قبل مسیح تا ۸۴۲ قبل مسح) سے ہے۔ یہ سب کے سب حالات کتاب مقدس کے مطابق ہیں۔ یہوداہ کے بادشاہ ، عزیاہ اور حزقیاہ کے عہدِ حکومت کے بیانات کی بھی تصدیق ہو گئی ہے ۔ اور لکیش ، بیت مرسم، اور دیگر مقامات کی کھدائی نے یہوداہ کی سلطنت کے آخری زمانہ اور یرمیاہ نبی کے حالات زمانہ پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ ان کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان بھی نہیں رہا۔ آثارِ قدیمہ ہر مقام میں عبرانی کُتبِ مقدسہ کے بیانات کے مصدق ہیں۔ مثلاً ۱ سلاطین میں ہے کہ سلیمان کے بیٹے

" رحبعام بادشاہ کے پانچویں برس میں شاہِ مصر سیسق نے یروشلیم پر چڑھائی کی "(۱۴: ۲۵)۔ اس فرعون کی فتح کا ذکر کرنگ کے مندر کی دیواروں پر کندہ ہے، کیونکہ مصر کے بادشاہ، مندروں کی دیواروں پر ان شہروں کے نام کھودا کرتے تھے جن پر انہوں نے فتح حاصل کی تھی۔ قدیم شکستہ مرتبانوں کے ٹکڑوں پر بھی ایسے شہروں کے نام ملے ہیں جن کے بادشاہ فرعونِ مصر کے دشمنِ جان تھے۔ اسوریہ کے شاہنشاہوں کی فتوحات کی یادگاروں پر ایسے متعدد نام دستیاب ہوئے ہیں جن کا ذکر عبرانی کُتُب مقدسہ میں آیا ہے۔ امرنہ کے خطوط اور دیگر میخی قسم کی عبارتوں سے بھی ان شہروں کا پتہ چلتا ہے۔

۲۔سلاطین میں لکھا ہے کہ بادشاہ حزقیاہ نے تالاب اور نالی بنا کر شہر یروشلیم میں پانی پہنچایا (۲۰: ۲۰) اس نالی کا بھی اب پتہ مل چکا ہے۔ سلیمان کی مشہور بندرگاہ عصیون جبر کا بھی پتہ لگ گیا ہے۔(۱سلاطین ۹: ۲۶: ۲۸) اسوریہ کے شہنشاہ شلمنصر سوم نے ۸۵۳ قبل مسیح دمشق کے بادشاہ حدد عصر اور اخی آب کو شکست دی تھی اور شاہِ اسرائیل اخی اب کا نام اس شاہنشاہ کی فتوحات میں درج ہے۔ شلمنصر چہارم غاصب بادشاہ حزائیل (۲سلاطین ۸: ۷تا ۱۵) کا ذکر نہایت حقارت سے کرکے کہتا ہے کہ حزائیل جوایرے غیرے نتھو خیرے کا بیٹا تھا تخت پر بیٹھا اور یوں سلاطین کی کتاب کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برطانوی عجائب خانہ میں پتھر کا ایک مینار ہے جس کی چوٹی مخروطی شکل کی ہے۔ اس میں نہ صرف یاہو کے نام کا ذکر ہے بلکہ اس پر ایک تصویر بھی کندہ ہے جس میں وہ شلمنصر کے سامنے جھک کر خراج ادا کرتا ہے۔ایک اور کتبہ سے ثابت ہے کہ یہ واقعہ ۸۴۱ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ طغلات پلیسر سو Tightath Pileser III کے وقائع اور تحریرات میں مناہم کے خراج ،پیکاہ کی شکست اور اسرائیل کے آخری بادشاہ ہوسیع کا اور شاہ یہوداہ آخز کا ذکر آتا ہے۔ یہ وقائع نگار ۲سلاطین کی کتاب کے بیان (۱۵ باب و ۱۷ باب) کی تصدیق کرتے ہیں۔ سارگون دوم (Sargon II) کے وقائع نگار اسرائیل کے بادشاہ اور اسرائیلیوں کی اسیری کا ذکر ۷۲۲ قبل مسیح کرکے کتابِ مقدس کے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اسوریوں کی دستاویزوں میں حزقیاہ اور منسہ شاہان یہوداہ کے نام موجود ہیں چنانچہ سنیخرب کے مشہور مثلثی منشور میں یہوداہ پر حملہ کرنے کا مفصل ذکر موجود ہے جس سے ۲سلاطین ۱۸ ، ۱۹ باب کی پوری تصدیق ہوتی ہے اور شاہِ اسور اسرحدون کی وقائع میں ہے کہ منسہ اس کا باجگزار تھا (۲سلاطین ۱۹: ۳۷، یسعیاہ ۳۷: ۳۸، عزرا ۴: ۲)۔ ایک تختی دستیاب ہوئی ہے جس میں لکھا ہے، کہ "یاکین شاہِ ملک یہود" کو بابل کے شاہی دربار سے ہر روز سامانِ رسد ملتا تھا، جس سے سلاطین کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے ۔(۲۵: ۲۹تا ۳۰)آثارِ قدیمہ کے انکشافات کی روشنی میں ہم عبرانی کُتُبِ مقدسہ کی کُتُبِ تواریخ کو اب بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں مثلاً ۲سلاطین میں ہے "شاہ اسور نے ترتان اور رب سارس اور رب شاقی کو لکیش سے بڑے لشکر کے ساتھ حزقیاہ بادشاہ کے پاس یروشلیم کو بھیجا"(۱۸: ۱۷) اب آثارِ قدیمہ سے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ ترتان اور رب سارس اور رب شاقی اسم معرفہ نہیں ہیں بلکہ اراکین سلطنت اسور کے فوجی عہدے تھے۔ چنانچہ " ترتان " فی الحقیقت فیلڈ مارشل یعنی سپہ سالار کا عہدہ تھا۔ "رب شاقی " شاہنشاہ کا خاص نمائندہ اور چیف افسر ہوتا تھا(یسعیاہ ۳۶: ۲)"رب سارس " (یرمیاہ ۳۹: ۳) محل کا خواہ سرا ہوا کرتا تھا۔

شاہ نبوکرنصر کے کتبوں سے عبرانی کُتُبِ مقدسہ پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتبے نہ صرف ان کتابوں کے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں بلکہ ان واقعات کی تاریخ متعین کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔

(۷)

بابل کی اسیری شاہ فارس خورس کی فتوحات (۵۸۳ قبل مسیح) سے ختم ہوگئی۔ اس زمانہ کی تحریرات نہایت تفصیل کے ساتھ خورس کی فتوحات کا ذکر کرتی ہے،ہیں جن سے عبرانی کتب مقدسہ کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بابل کی فتح کے بعد عبرانی کُتُبِ

مقدسہ ہر ایرانی بادشاہ کے عہد حکومت کی تاریخ بتلاتی ہیں۔(حجی ۱: ۱، زکریا ۱: ۱، عزرا ۶: ۱۵ وغیرہ) آثارِ قدیمہ کے کتبے ان تاریخوں کی صحت کی شہادت دیتے ہیں۔ نحمیاہ کی کتاب میں نحمیاہ کا بادشاہ ارتخششتا اول کے زمانہ میں یروشلیم آنے کا ذکر ہے (۲: ۱) بالائی مصر سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کوایک ارامی زبان کا پے پائرس جو اس واقعہ کی تصدیق کرتا ہے دستیاب ہوا ہے۔

آثارِ قدیمہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ بادشاہ بیلشضر جس کا ذکر دانی ایل کی کتاب میں آیا ہے درحقیقت اور فی الواقعہ ایک بادشاہ تھا (۷: ۱ وغیرہ) وہ بادشاہ نبونی دس (Nobonidus) کا بیٹا تھا اور باپ کی غیر حاضری میں ریجمنٹ (قائم مقام) کے فرائض ادا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کو یہ اختیار تھا کہ دانی ایل کو بادشاہی میں تیسرا درجہ عطا کرے۔

آثارِ قدیمہ کے علم سے بعض امور میں ہم کو کتابِ مقدس کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔مثلاً نوزی کے الواح سے ظاہر ہے کہ کھیتوں میں بالیں چھوڑدی جاتی تھیں تاکہ غربا ان کو چن کر اپنا پیٹ پال سکیں (روت ۲ باب، احبار ۱۹: ۹، استثنا ۲۴: ۱۹ تا ۲۴ وغیرہ) عہدِ عتیق کے بعض مقامات میں اسرائیلیوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ کنعانیوں کے "صمانیم" سے پرہیز کریں مفسروں کو اس کے ٹھیک معنی معلوم نہیں تھے چنانچہ بعض علما کا خیال تھا کہ اس لفظ سے مراد مورت یا بُت ہے۔ بعض اس سے سورج دیوتا کا بُت مراد لیتے تھے۔ لیکن اب پالمیرا میں ایک بخور جلانے کی قربانگاہ ملی ہے جس پر یہ لفظ کندہ ہے۔ اس قسم کی قربان گاہیں ارضِ مقدس کی کھدائی میں بھی دستیاب ہوئی ہیں جس سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ لفظ " صمانیم " سے مراد وہ قربان گاہیں تھیں جن پر کنعانی عبادت کے وقت بخور جلایا کرتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸) میں اتحادی افواج نے ارضِ مقدس میں تُرکوں کے خلاف جنگی مہمیں اور معرکے کئے۔ اس جنگ کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ عبرانی کُتبِ مقدسہ کی کُتبِ تواریخ میں جن قدیم راستوں کا ذکر ہے ان کو اختیار کرنے سے اتحادیوں نے متعدد فتوحات حاصل کیں۔ یہ قدیم راستے اب غیر معروف تھے جن سے ان کے دشمن ناواقف تھے۔لیکن اتحادیوں نے ان کُتبِ تواریخ کے راستوں کو اپنا جنگی نقشہ بنا کر کئی بار فتح حاصل کی جس سے ان کُتب کے بیانات کی صحت ثابت ہے۔

بخوفِ طوالت ہم انہی چند انکشافات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہر محقق پر اب ظاہر ہوگیا ہے کہ آثارِ قدیمہ نے جتنی چیزیں کھود نکالی ہیں، ان سے عبرانی کُتبِ مقدسہ کے بیانات کی صحت ثابت ہوگئی ہے تاحال آثارِ قدیمہ کے علم نے ایک بھی اسی بات دریافت نہیں کی جو ان عبرانی کُتب مقدسہ کی تکذیب کرے۔ آثارِ قدیمہ کے گواہ اپنی قبروں سے نکل کر ثابت کرتے ہیں کہ جو کتابیں چودھویں صدی قبل مسیح سے ۴۸۵ قبل مسیح تک لکھی گئی ہیں وہ قطعاً صحیح ہیں۔ چنانچہ پروفیسر الیگیرو لکھتا ہے کہ " بمشکل کوئی دن ایسا ہے جب علمِ آثارِ قدیمہ کتابِ مقدس کی کسی نہ کسی آیت پر نئی روشنی نہیں ڈالتا۔ محکمہ آثارِ قدیمہ ان ممالک میں کھدائیاں کرتا رہتا ہے جن کا ذکر بائبل میں آیا ہے۔ نئے کتبے دریافت ہوتے رہتے ہیں اور محکمہ کے فضُلا۔ اس قدیم زمانہ کے لوگوں کے حالات اور قوم یہود کی تاریخ وکتب پر نئی روشنی ڈالتے رہتے ہیں اور یہ روشنی کتابِ مقدس کے الفاظ کے مطالب ومعانی کروشن کردیتی ہے۔"(صفحہ ۳۷)۔

آثارِ قدیمہ اور کُتبِ مقدسہ کا زمانہ تصنیف

آثارِ قدیمہ نہ صرف عبرانی کُتبِ مقدسہ کے بیانات کی صِحت کی تصدیق کرتے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت کردیتے ہیں کہ یہ قدیم کتابیں (جواب ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں) اسی زمانہ کی تصنیف ہیں جن میں وہ لکھی گئی تھیں اور مابعد کے مصنفوں نے ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا۔ ماہرین کو قدیم زمانے کی ہزاروں الواح اور دستاویزات دستیاب ہوئی ہیں۔ بالخصوص ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان یُوگرت Ugarit کی قدیم بادشاہی کی

وہ الواح ملی ہیں جن کا تعلق دین اور مذہب کے ساتھ ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الواح کی نظم ونثر اور عبرانی کُتُبِ مقدسہ کی نظم ونثر کی ساخت، فصاحت وبلاغت ،صنائع اور بدائع، طرز بیان اور زبان ایک ہی قسم کی ہیں۔

مثلاً زبور ۹۲: ۹ کی یہ صنعت ملاحظہ ہو۔

"کیونکہ دیکھ تیرے دشمن، اے خداوند
دیکھ تیرے دشمن ہلاک ہوجائیں گے۔
سب بد کردار پراگندہ کردئیے جائیں گے۔

یا قضاۃ ۵: ۳۰ کے مصرعوں کی یہ صنعت ملاحظہ ہو:

"سیسرا کو رنگارنگ کپڑوں کی لوُٹ
رنگ رنگ کپڑوں کی لوُٹ جس پر بیل بوٹے کڑھے ہیں۔
بیل بوُٹے کڑھے ہوئے رنگارنگ کپڑوں کی لوُٹ جو اسیروں کی گردنوں پر لدی ہے۔"

یا مریم کے گیت کے اشعار جو خروج ۱۵ باب میں ہیں۔

یہ صنعت اور دیگر صنعتیں[1] جو عبرانی کُتُبِ مقدسہ کی نظموں میں موجود ہیں قدیم کنعانی علمِ ادب میں اکثر پائی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کے شاعر کس قسم کی نظمیں اور اشعار لکھا کرتے تھے۔ پس آثارِ قدیمہ سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس قسم اور طرز کے اشعار جو عبرانی کُتُبِ مقدسہ میں موجود ہیں مسیح سے تیرہ اور بارہ صدیاں پہلے کے لکھے ہوئے ہیں کیونکہ ان صدیوں کے بعد کنعانی علم ادب کا طرز کلیتہً بدل گیا تھا اور ایک نیا دور شروع ہوگیا تھا جس میں دوسری قسم کی صنعت اور طرزِ مقبول ہوگئی تھی۔ مریم کے گیت (خروج ۱۵ باب) کی قدامت اس امر سے بھا ظاہر ہے کہ اس میں الفاظ "میراث کا پہاڑ" آتے ہیں اور یہی پہلے کے ہیں۔

علم آثارِ قدیمہ کے ذریعہ اب ہم عبرانی کُتُب مقدسہ کی زبان کے ان قدیم عبری الفاظ کو سمجھ سکتے ہیں جو مابعد کے دوَروں میں متروک ہوگئے تھے اور متروک ہونے کی وجہ سے ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مثلاً زبور ۶۸: ۴ میں ایک لفظ ہے جس کا لفظی ترجمہ " صحرا کا سوار" کیا گیا ہے لیکن یوُگرت کے علمِ ادب کے قدیم الفاظ کی روشنی میں ہم کو معلوم ہوا ہے کہ اس لفظ کا صحیح ترجمہ" بادلوں پر سوار" ہونا چاہیے۔ زبور ۸۹: ۱۹ میں الفاظ "زبردست پر مقرر کیا ہے اور قوم پر ایک جوان کو مسلط کیا ہے۔" سیاق وسباق سے ظاہر ہے کہ یہاں داؤد بادشاہ کی طرف اشارہ ہے۔" امثال ۲۱: ۹، ۲۵: ۲۴ میں الفاظ "کشادہ گھر" کی بجائے الفاظ "بھرا گھر" ہونے چاہئیں ۔ کیونکہ یہی عبرانی لفظ قدیم مصری، اسوری اور یوگرتی زبانوں میں ان معنوں میں آیا ہے۔

آثارِ قدیمہ کے علم نے نہ صرف ان الفاظ پر روشنی ڈالی ہے جس کا مطلب نہ جاننے کی وجہ سے مترجمین بائبل نے ان کا لفظی ترجمہ کردیا ہے بلکہ اب بعض ایسے الفاظ کی بخوبی توضیح ہوگئی ہے جن کا مطلب تاحال صاف طور پر معلوم نہ تھا۔ مثلاً پیدائش ۱: ۲ میں ہے" خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔" لیکن اب اقھط کی رزمیہ نظم سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ اس آیہ شریفہ میں وہ لفظ جس کا ترجمہ" جنبش کرتی تھی" کیا گیا ہے ان ہی لطیف معنوں میں استعمال ہوا ہے جن میں استثنا ۳۲: ۱۱ میں " منڈلانا" استعمال ہوا ہے جہاں لکھا ہے "جیسے عُقاب اپنے بچوں پر منڈلاتا ہے۔"

نتیجہ

پس ہم اس ابتدائی زمانہ کی نسبت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کہ اگرچہ موجودہ عبرانی کُتُبِ مقدسہ حرف بحرف وہ نہیں ہیں جو الہامی مصنفین نے تحریر کی تھیں کیونکہ کاتبوں کی

[1] ان صنعتوں کا مفصل ذکر ہم نے اپنی کتاب "قدامت واصلیت اناجیل اربعہ" کی جلد دوم میں کیا ہے۔ (برکت اللہ)۔

غلطیوں کا امکان ابتدا ہی سے رہا ہے تاہم ان میں کوئی ایسا فرق رونما نہیں ہوا جس کی وجہ سے کوئی محقق یہ کہہ سکے کہ اب وہ بجنسہ وہی کتابیں نہیں ہیں جو انبیاء نے لکھی تھیں۔ برعکس اس کے ہم بڑے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ روئے زمین کی تمام قدیم کتابوں میں عبرانی کُتبِ مقدسہ ہی ایسی کُتب ہیں جو فی الحقیقت صحیح اور تحریف کے بدنما داغ سے پاک ہیں۔

باب پنجم

دَورِ دوم

(از ۴۵۸ قبل مسیح تا ۷۰ عیسوی)

اسیری کے خاتمہ سے یروشلیم کی بربادی تک ک زمانہ

فصلِ اوّل

حضرت عزرا اور فقُہا کا زمانہ

کُتبِ مقدسہ کی تاریخ تصنیف

اس زمانہ میں ذیل کی کُتبِ مقدسہ تحریر کی گئیں:

تواریخ، عزرا، نحمیاہ، آستر، زبور، امثال، یوناہ، واعظ، غزل الغزلات، دانی ایل، ملاکی۔

حضرت عزرا اور حلقہ فقُہا

اس زمانہ کی ابتدا تب ہوئی جب بنی اسرائیل بابل کی اسیری سے رہا ہو کر واپس اپنے ملک میں آئے ۔ یہ نظارہ ہم کو نحمیاہ کے آٹھویں باب میں ملتا ہے ۔ ہزاروں اشخاص یروشلیم کے جل پھاٹک کے آگے جمع ہوئے ۔ اور عزرا فقیہہ نے اپنے چوبی منبر سے جماعت کے لوگوں کو عبرانی کُتبِ مقدسہ پڑھ کر سنائیں لیکن زمانہ اسیری میں وہ اپنی مادری زبان عبرانی بھول گئے تھے اور اب وہ ارامی زبان بولتے تھے۔ لہذا لاوی ان کو " معنی بتلاتے اور اُن پڑھی ہوئی باتوں کی عبارت ان کو سمجھاتے تھے۔"(آیت ۸)۔ اس وقت سے عبرانی

صرف تعلیم یافتہ اصحاب کے زبان رہ گئی اور عوام الناس ارامی بولنے لگے۔مذکورہ بالاواقعہ کے چند ہفتوں کے بعد بنی اسرائیل پھر خدا کے سامنے جمع ہوئے اورانہوں نے توبہ کرکے اس کے حضور عہد کیا کہ وہ اس کے احکام کے پابند رہیں گے اور " ان ساری باتوں کے سبب ہم ایک سچا عہد کرتے اور لکھتے ہیں ، اور ہمارے امراء اورہمارے لاوی اورہمارے کاہن اسی پر مُہر کرتے ہیں۔ اور وہ جنہوں نے مہرُیں ثبت کیں، یہ ہیں۔ نحمیاہ ، ترشاتا ، صدقیا، عزریا " وغیرہ، چوراسی اشخاص نے اپنی مہریں ثبت کیں۔

(۲)

یہودی روایت کے مطابق یہ چوراسی اشخاص، عبادت خانہ [1]عظیم " (جس کا ذکر نحمیاہ ۸تا ۱۰ باب میں ہے) کے اراکین تھے۔ وہ خدا کے برگزیدہ اور چیدہ اشخاص تھے جنہوں نے عبرانی کُتبِ مقدسہ کے نسخوں کی صحت کے ساتھ نظر ثانی کرکے نقل کی ۔ اس روایت کے مطابق حضرت عزرا اس "عبادت خانہ عظیم" کے صدر تھے اور مختلف زمانوں میں حضرت دانی ایل ، حضرت حجی ، حضرت زکریا، حضرت ملاکی ، حضرت زربابل اور حضرت نحمیاہ وغیرہ اس کے اراکین میں سے تھے۔ چنانچہ مشنہ میں آیا ہے کہ " خدا نے موسیٰ کو کوہِ سینا پر تورات دی اوراس نے وہ تورات یشوع کو اور دیگر بزرگوں کو دی جنہوں نے اسے انبیاء اللہ کے سپرد کیا اورانبیاء نے اس کو عبادت خانہ عظیم کی سپردگی میں دیا۔"

مذکورہ بالا یہودی روایات رنگ آمیزی سے خالی نہیں۔ بہر حال کُتبِ مقدُسہ سے ثابت ہے کہ اس زمانہ میں حضرت عزرا کے گرد فاضل معلموں کا ایک حلقہ جمع ہوگیا تھا(عزرا ۸باب ۱۶)اور جس روز سے یروشلیم کے حل پھاٹک پر" عزرا فقیہہ" نے لوگوں کو کُتبِ مقدسہ سنائیں یہ " فقیہوں کا حلقہ " وجود میں آگیا۔ ان فقہیوں کا کام یہ تھا کہ خدا کے کلام کو

[1] The Great Synagouge.

پڑھ کر سنائیں، سمجھائیں اور نقل کریں۔ انہی فقیہوں کا ذکرانجیل جلیل میں بھی آتا ہے اور یہی وہ فقیہہ تھے جنہوں نے اپنے مذہب کی غیرت کے مارے ابن اللہ کو صلیب دلوائی تھی۔

اس " عبادت خانہ عظیم" کی پیدائش کے ساتھ ہی اہلِ یہود میں نبوت بھی ختم ہوگئی اور انبیاء کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

(۳)

اہلِ یہود کی اسیری کے زمانہ میں ان فقہیوں کے گروہ کی انتہائی کوشش یہ رہی کہ وہ اپنے قومی اور ملّی اَدب یعنی اپنی کُتبِ مقدسہ کو محفوظ رکھیں۔ اب جو ان کی بادشاہی کا خاتمہ ہوچکا تھا ان کے پاس یہی کُتب رہ گئی تھیں جو ان کی ملی روایات ،مذہب اور ثقافت کو ایک یک جاقائم اور برقرار رکھ کے ان کے قومی انتشار کو روک سکتی تھیں۔ پس حضرت حزقی ایل نبی کی زیر قیادت کُتبِ مقدسہ کو ترتیب دے کر شائع کیا گیا۔ زمانہ اسیری کے ستر سال کے طویل عرصہ میں ان فقہا نے قدیم عبرانی کُتبِ مقدسہ کو نہایت صحت کے ساتھ نقل کیا۔ اس بات کی اشد ضرورت بھی تھی کیونکہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں، اس زمانہ میں اہلِ یہود کی زبان رفتہ رفتہ عبرانی سے ارامی ہوگئی تھی۔

خود کُتبِ مقدُسہ کی اندرونی شہادت ثابت کردیتی ہے کہ ان کُتبِ سماوی کے الفاظ میں عمداً ردوبدل کرنا یا کمی بیشی کا واقع ہونا ایک ناممکن امر تھا۔ (دیکھو استثنا ۴: ۲، یرمیاہ ۲۶ : ۲ وغیرہ) حق تو یہ ہے کہ اہلِ یہود کی تاریخ میں کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں آیا جب کُتبِ مقدسہ میں کمی یا بیشی کرنے کے ارتکاب کا خیال بھی ان کے نزدیک پھٹکا ہو۔ اس کے برعکس جیسا یہودی مورخ یوسفیس لکھتا ہے" ہم نے ہمیشہ اور ہر زمانہ میں اپنی کُتبِ مقدسہ کے احترام کا عملی ثبوت دیا ہے۔ ہزاروں سالوں کی طویل مدت میں کسی شخص نے کبھی یہ جرات نہیں کی کہ وہ عمداً ان کُتب کے کسی ایک لفظ یا حرف کو کم وبیش کرنے یاردوبدل کرنے کا خیال تک بھی کرے۔ ہر یہودی کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ روز پیدائش ہی سے ان الہیٰ

کتابوں کو خدا کا کلام سمجھے اوران کے احکام پر عمل کرنے میں ہی اپنی سعادتِ دارین تصور کرے ۔ حتیٰ کہ بوقتِ ضرورت ان کی حفاظت کی خاطر اپنی جانِ عزیز بھی خوشی سے قربان کردے ۔ ہماری گذشتہ تاریخ میں بار بار یہ دیکھا گیا ہے کہ یہودی قیدی سخت سے سخت عقوبتوں کو کلامِ الہیٰ کی خاطر برداشت کرتے رہے لیکن ان کی زبان سے کبھی کتُبِ مقدسہ اور شریعت کے آئین کے خلاف ایک حرف بھی نہ نکلا۔

ہر فقیہہ کا یہ فرض تھا کہ وہ " خداوند کی شریعت کاطالب ہو۔(یعنی اس کا غوروتدبر کے ساتھ مطالعہ کرے) اور اس پر عمل کرے اور اسرائیل میں آئین اور احکام کی تعلیم دے "،(عزرا ۷: ۱۰) پس فقیہہ شریعت کی کتابوں کو ترتیب دے کر اس کو مدون کرنے والے تھے۔سامریوں کی بدعت کوزیر نظر رکھ کر انہوں نے عبرانی متن کے مستند الفاظ کو قطعی طورپر متعین کردیا۔ انہوں نے دینیات کے احکام وقواعد کو جو تاحال ضبط تحریر میں نہیں آئے تھے نہایت استقلال اور محنت سے مکمل کیا۔ تورات مقُدس کی مستند تفسیر کرکے ذومعنی باتوں کوواضح کیا۔(۲۔ تواریخ ۱۳: ۲۲)اور مقدس کتابوں کے باہمی اختلافات کی تاویل کی، یہودی اصطلاح میں انہوں نے " شریعت کے چوگرد باڑلگادی۔"

جب اہلِ یہود نے اسیری سے یروشلیم کوواپس لوٹ کر یہ تیہہ کرلیا کہ وہ خداوند کی شریعت کے اُصول کو اپنی قومی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی کریں گے (نحمیاہ ۸تا ۱۰ باب) تو اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی کہ کتُبِ مقدسہ کا کامل طورپر مطالعہ کیا جائے تاکہ عوام الناس ان کے الفاظ ، احکام اور مضامین سے بخوبی آگاہ ہوجائیں۔ فقہا کے گروہ نے اس بات کو سر انجام دینے کا ذمہ لے لیا۔ پس یہ فقیہہ خاص طور " اہلِ کتاب" تھے جن کا یہ فرض تھا کہ کتُبِ مقدُسہ کو نہایت صحت کے ساتھ نقل کریں۔ ان کو اہلِ یہود کی قومی ملی اور تمدنی زندگی کے لئے شمع ہدایت بنائیں اور افرادِ قوم میں شرعی فرائض کی تبلیغ کریں۔ کتُبِ مقدسہ کی کامل واقفیت اور شریعت کو کماحقہ ،جاننے کی وجہ سے عزرا کو " ماہر فقیہہ "کہا گیا (۷: ۶)

فقہا نے اپنی زندگی اسی بات کے لئے وقف کردی کہ وہ عوام کے سامنے کتابِ مقدس کی "تلاوت" کریں۔ اس کے معنی بتلائیں اوران کو عبارت سمجھائیں "(نحمیاہ ۸: ۸) عبرانی متن کے الفاظ کا نہایت احتیاط اور تدبر کے ساتھ مطالعہ کریں۔ پس متن کے الہامی الفاظ کو نقل کرنے کے لئے انہوں نے نہایت باریک اور مفصّل قواعد و قوانین وضع کئے تاکہ الفاظ انتہا درجہ کی صحت کے ساتھ نقل کئے جائیں ۔ انہوں نے الفاظ کی صحت کے معاملہ میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا یہاں تک کہ وہ لفظ پرست ہوگئے ۔ (رومیوں ۷: ۶، ۲ کرنتھیوں ۳: ۶)لیکن اس لفظ پرستی کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کتابِ مقدس کا عبرانی متن بصحت تمام من وعن محفوظ رہا۔

ہر فقیہ کے لئے یہ لازم تھا کہ وہ دوسروں کو تعلیم دے (عزرا ۷: ۱۰) پس مشہور فقیہوں کے گرد ہر دم شاگرد شاگردوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا (واعظ ۱۲: ۱۱)اور یوں صدیوں تک درس وتدریس کا سلسلہ پشت درپشت جاری رہا۔ لیکن شریعت کی تعلیم دینا ان فقیہوں کاذریعہ معاش نہ تھا بلکہ وہ تجارت وغیرہ سے اپنا پیٹ پالتے تھے ، فقہیا ہمیشہ زبانی تعلیم دیا کرتے تھے جس کو ان کے شاگرد از برحفظ کرلیا کرتے تھے۔ یہ فقیہ زبانی تعلیم دینے پر اس لئے اصرار کرتے تھے تاکہ ان کی انسانی تعلیم میں اورالہیٰ شریعت میں (جو کتُبِ مقدسہ میں تھی) دائمی تمیز برقرار رہے اور دونوں کے خلط ملط ہونے کا امکان بھی نہ رہے۔ پس ہر شاگرد کے لئے یہ لازم تھا کہ وہ اپنے ربی کی تعلیم کے الفاظ تک نہایت صحت کے ساتھ ہمیشہ زبانی یاد رکھے اور کسی ایسے امر کی تعلیم نہ دے جس کی اس نے اپنے استاد سے خود تعلیم نہ پائی ہو۔یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا عیسیٰ مسیح تعلیم دینے لگے تو عوام آپ کی تعلیم سے حیران ہوکر بول اٹھتے تھے کہ آپ " ان کے فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحبِ اختیار کی طرح تعلیم دیتے تھے "(متی ۷: ۲۹ وغیرہ) کیونکہ یہ ربی صرف اسی شاگرد کو تعریف وتحسین کے قابل سمجھتے تھے جو باریک ترین تفصیلات کو صحت کے ساتھ از بر سنا سکے ۔ ان کا ہر شاگرد گویا

ایک زندہ کُتب خانہ یا لائبریری تھا۔ اس طریقہ کارس سے اہلِ یہود میں کتابِ مُقدس کا علم سینہ بسینہ صدیوں تک جاری اور محفوظ رہا۔

(۴)

فقیہ نہ صرف شریعت کے عالم ،ماہر اور فاضل مفسر تھے(عزرا ۷: ۶، ۱۱، ۱۲ نحمیاہ ۸: ۱، ۴، ۹ ، ۱۳- ۱۲: ۲۶، ۳۶)بلکہ اہلِ یہود کی اصطلاح میں وہ "اہلِ دانش وفہم" تھے (دانی ایل ۱۱: ۳۳، ۳۵، ۱۲: ۳) جن کا ذکر امثال او رواعظ کی کتاب میں اکثر آتا ہے (امثال ۱۱: ۱۳- ۲: ۱۶- ۱۰: ۱۳ وغیرہ ، واعظ ۹: ۱۱ وغیرہ) ان فقیہوں میں جہاں ایسے لوگ تھے جو قابلِ ملامت تھے (متی ۲۳ باب) وہاں ایسے بھی تھے جو نہایت روشن ضمیر انسان تھے۔ مثلاً حلیل اور شمعی سیدنا مسیح کے زمانہ سے ذرا پہلے کے تھے۔ گملی ایل مُقدس پولوس کا استاد تھا۔(اعمال ۲۲: ۳) جس نے رسولوں کو ایذا دینے کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی (۵: ۳۴) جب مکابیوں نے یونانی تہذیب وتمدن کے خلاف علمَ جہاد بلند کیا تو فقیہوں کا گروہ پہلے سے بھی زیادہ زور پکڑ کر با اختیار ہوگیا۔ وہ پہلے ہی باقاعدہ طور پر انجمنوں میں منظم تھے(۱- تواریخ ۲: ۵۵) اب وہ صاحبِ اقتدار ہوگئے۔ یروشلیم کی تباہی (۷۰ء) کے زمانہ تک یہودیہ کا صوبہ فقیہوں کا محکم گڑھ تھا(متی ۱۵: ۱، مرقس ۳: ۲۲وغیرہ) گووہ ارضِ مقدس میں ہر جگہ سکونت کرتے تھے اور کنعان کے باہر جس ملک میں بھی یہودی آباد تھے وہاں فقیہہ پائے جاتے تھے۔ جب (۷۰ء) میں یروشلیم تباہ ہوگیا تو فقہا کا اختیار اور اقتدار بیش از بیش ہوگیا۔ انہوں نے نہایت مایوس کن حالات میں یہودی قوم کی از سرِ نو تنظیم کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ ان کو اس مقصد کی تحصیل میں کیسی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ۔ وہ ہر معنی میں " موسیٰ کی گدی " پر بیٹھے تھے(متی ۲۳: ۲)۔

جمعِ کُتبِ عہد عتیق

فقیہوں کے گروہ کی طفیل اسی زمانہ میں عہدِ عتیق کی تمام مختلف کُتب یکجا جمع کی گئیں اوران کی جمع اور ترتیب وقوع میں آئی۔ اس زمانہ کے بعد گو بے شمار کتابیں لکھی گئیں جن کے انبار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ " کتابیں بنانے کی انتہا نہیں ہے۔"(واعظ ۱۲: ۱۲) لیکن ان میں سے کسی کتاب کو بھی اس مجموعہ میں شمولیت کا شرف نصیب نہ ہوا۔

عبرانی کا جدید رسم الخط

اسی زمانہ میں قدیم عبرانی رسم الخط کی بجائے جدید عبرانی حرُوف استعمال کئے گئے اور عبرانی کُتبِ مقدسہ جدید رسم الخط میں نقل کی گئیں۔ اس حلقہ فقہا نے محنتِ شاقہ کرکے کُتبِ مقدسہ کے نقل کرنے میں کمال دیانتداری سے کام لیا۔ اور نہایت صحت کے ساتھ انہوں نے قتل کرنے کے اس کا کو سرانجام دیا۔ گو فقہا کے حلقہ نے اس کارِ عظیم کو کماحقہ، سرانجام دیا لیکن ان کی خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ ہم کو عزرا اور صدوق کے ناموں کے علاوہ (نحمیاہ ۱۳: ۱۳) کسی دوسرے فقیہ کا نام بھی نہیں ملتا۔

قدیم کُتب خانے

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تمہارے پاس اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ " عبادت خانہ عظیم " کے اراکین اورحلقہ فقہا نے عبرانی کُتبِ مقدسہ کو جمع کیا اور نہایت صحت کے ساتھ نقل کیا تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ۲مکابیوں ۲: ۱۳ میں لکھاہے کہ " یہی باتیں کاغذات اوردفاترمیں تحریرہیں اور نحمیاہ کی تحریرات اور تفاسیر میں بھی موجودہیں کہ اس نے ایک کُتب خانہ قائم کیا جس میں اس نے انبیاء کی کُتب اور سلاطین کی تواریخ اور داؤد کی کتابوں وغیرہ کو جمع کیا۔" اس حلقہ فقہا نے جامع اور ضیغم کُتبِ تواریخ کے خلاصے تالیف کئے (۱۔تواریخ ۲۹: ۲۹۔ ۲ تواریخ ۹: ۲۹)۔ ان تمام امور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نحمیاہ اور دیگر فقیہوں نے کُتبِ مقدسہ کی حفاظت اور نقل کرنے میں بے حد کوشش کی اور نحمیاہ وغیرہ نے ایک کُتب خانہ بھی قائم کیا جس میں کُتب مقدسہ کی نقلیں محفوظ تھیں۔

اوّلین ترجمہ سبعینہ یا سیپٹواجنٹ

سکندرِ اعظم کی فتوحات کے وقت سے ہی اہلِ یہود مصر میں بسنے لگ گئے تھے کیونکہ سکندریہ کا شہر نہ صرف علم وفضل کا مرکز تھا بلکہ مشرق ومغرب کے ممالک کی تجارت کا بھی زبردست مرکزہوگیا تھا۔

مصر کے علم پرور فرعون ٹولیمی ثانی فیلڈیلفس
Ptolemy II Philadelphus.
(از ۲۸۵ قبل مسیح تا ۲۴۶ قبل مسیح) کےزمانہ میں اہلِ یہود اس کثرت سے مصر میں رہائش گزیں ہوگئے تھے کہ روایت ہے کہ اس فرعون نے ۷۲ علماء کو یروشلیم سے بلوایا تاکہ شاہی کُتب خانہ کے لئے اہل یہود کی عبرانی کُتبِ مقدسہ کا ترجمہ یونانی زبان میں کریں۔ فرعون نے علماء کو بلوایا ہو یا نہ بلوایا ہو لیکن یہ تصدیق شدہ امرہ ہے کہ اس کے دَورِ حکومت میں علمائے یہود کی ایک بڑی تعداد سکندریہ میں (جوعلم وفضل کا گھوارہ تھا) جمع ہوئی تاکہ عبرانی کُتبِ مقدسہ کا یونانی میں ترجمہ کیا جائے۔ ترجمہ کی ضرورت اس واسطے لاحق ہوئی کہ مصر میں یہودی پشتوں سے مصر میں بسنے کی وجہ سے عبرانی زبان سے ناواقف اورارامی زبان سے ناآشنا ہوچکے تھے اوراب یونانی ان کی مادری زبان ہو گئی تھی۔

ان علماء نے دوسو پچاس سال قبل مسیح ترجمہ کا کام شروع کیا اورپہلے پہل تورات شریف کی کتابوں کا یونانی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ تورات لفظی ترجمہ ہے۔ اس کے بعد مختلف علما نے کتبِ تواریخ اورصحفِ انبیائے سلف کے ترجمے مقابلتہً آزاد بامحاورہ یونانی زبان میں کئے۔ تمام کُتبِ عہدِ عتیق کا ترجمہ ایک صدی قبل مسیح پایہ تکمیل کوپہنچا۔ یہ اوّلین ترجمہ سیپٹواجنٹ یا ترجمہ سبعینہ کہلاتا ہے[1]۔ اہل یہود میں (جوارضِ مقدس کے باہر بستے تھے) یہ ترجمہ پُشتوں تک مستند سمجھا گیا(۱۔پطرس ۱: ۱۔یعقوب ۱: ۱ وغیرہ)۔

یہ ترجمہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اوراس کے ذریعہ ہم وہ عبرانی متن معلوم کرسکتے ہیں جو سیدنا مسیح سے صدیوں پہلے ملک مصر میں مروج تھا۔ جب ہم موجودہ اصل عبرانی متن اور اس قدیم ترین اوراوّلین یونانی ترجمہ کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم پر موجودہ عبرانی متن کا پایہ اعتبار واضح ہوجاتا ہے۔

مسیحی کلیسیا اور ترجمہ سبعینیہ

منجئی عالمین کی صلیبی موت اور ظفریاب قیامت کے بعد پہلی صدی میں ہی مسیحیت بڑی سرُعت کے ساتھ سلطنتِ روم کے مختلف کونوں میں پھیل گئی تھی۔ہرچہار طرف یونانی زبان بولنے والی کلیسیائیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ قدرتاً یہ کلیسیائیں ترجمہ سبعینیہ کا استعمال کیا کرتی تھیں۔ یہ ترجمہ اس قدر مستند تھا کہ سیدنا مسیح کے دوازدہ رسول اسی کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں استعمال کیا کرتے تھے۔ ابتدائی مسیحی صدیوں میں

[1] Septuagint.

مشرق ومغرب کی کلیسیاؤں کے آبائے کلیسیا اس ترجمہ کے الفاظ کو اصل عبرانی الفاظ کی طرح الہامی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات میں اس ترجمہ کے اقتباسات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ ترجمہ تقریباً تمام مسیحی اصطلاحات کا ماخذ بھی ہے۔

علاوہ ازیں تبلیغ واشاعتِ انجیل جلیل میں یہ ترجمہ بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ چنانچہ اہلِ یہود کے اعتراضات کاجواب دیتے وقت اور حضرت کلمتہ اللہ کی مسیحائی کے ثبوت میں کلیسیاؤں کے فضُلا اسی ترجمہ کے مقامات اور آیات پیش کیا کرتے تھے۔ مقُدس جسٹن شہید ہم کو بتلاتا ہے کہ جب اہلِ یہود نے دیکھا کہ یہ ترجمہ مسیحیوں کے ہاتھوں میں بڑا زبردست حربہ ثابت ہورہا ہے تو انہوں نے اس ترجمہ کو استعمال کرنا چھوڑدیا۔ تب ایکولا۔ تھیوڈوشن اور سمیکس نے دوسری صدی میں اہلِ یہود کے استعمال کے لئے نئے یونانی ترجمے کردیئے اور ترجمہ سبیعینہ کو" مسیحیوں کی بائبل کا نام دے کراس کو ترک کردیا۔ لیکن مسیحی کلیسیا اس ترجمہ کا برابر استعمال کرتی رہی۔ مشرقی کلیسیا کی نظر میں تو یہ ترجمہ ایسا مستند اور معتبر ہے کہ وہ ابتداہی سے اصل عبرانی کی بجائے۔یہی ترجمہ تاحال استعمال کرتی چلی آئی ہے اور اسی ترجمہ کو مستند تسلیم کرتی ہے۔

ترجمہ سبعینیہ کے ترجمے

مسیحی کلیسامیں یہ ترجمہ سبعینیہ ابتدائی صدیوں کے دوران میں ایسا مقبول ہوگیا کہ اس قدر مستند تسلیم کیا گیا کہ اس کا ترجمہ مختلف ممالک کی زبانوں میں ہوگیا۔ چنانچہ ان ابتدائی صدیوں میں اس کا ترجمہ قدیم لاطینی زبان، قبطی (یعنی صحیدی اور بُحُری)زبانوں میں حبشی زبان، آرمنی ، عربی زبانوں میں ملکِ گاتھ اورجارجیا اور سلیون Slavonie ملکوں کی زبانوں میں وہاں کی کلیسیاؤں کے لئے کیا گیا۔ یہ تمام ترجمے دوسری صدی مسیحی سے چھٹی صدی مسیحی تک انجام پاگئے۔

سیپٹواجنٹ کے نسخے

اس یونانی ترجمہ سبعینیہ (سیپٹواجنٹ) کے نسخہ جات ہمارے پاس بکثرت موجود ہیں جن کے باہمی مقابلے سے نہ صرف مترجمین کی اصل یونانی عبارت کا پتہ چل سکتا ہے بلکہ اس عبرانی متن کا بھی علم ہوجاتا ہے جو ان مترجمین کے سامنے تھا۔ ان نسخوں کا مفصل ذکر ہم اس رسالہ کے دورسرے حصہ میں کریں گے جس سے ناظرین پر واضح ہوجائیگا کہ عبرانی کُتبِ مقدسہ کا موجودہ متن نہایت مستند اور قابل اعتبار ہے۔ چنانچہ بڑے حروف کے نسخوں کَے علاوہ ہمارے پاس اس ترجمہ کے وہ نسخے جو چھوٹے حروف میں لکھے ہیں تعداد میں تین سو سے زائد ہیں۔ ان کا ذکر بھی بعد کے اوراق میں کیا جائے گا۔

سیپٹواجنٹ کے بعض قدیم ترین نسخوں کے پارے حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً استثنا کی کتاب کے چند پارے (جن کو بالعموم " رابرٹ پپے پائرس" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے)اس ترجمہ کے قدیم ترین گواہ ہیں کیونکہ یہ اس زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں جب ابھی اِکلی زی ایس ٹی کس کی کتاب[1] کا یونانی میں ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ان پاروں میں استثنا کے ۲۲ تا ۲۸ باب شامل ہیں۔ ان کا متن نسخہ سکندریہ کے متن سے ملتا ہے اور نسخہ ویٹی کن کے متن کی خصوصی غلطیوں سے پاک ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ جہاں کہیں ان پاروں کا متن مابعد کے نسخوں سے مختلف ہے ان مقامات میں وہ موجودہ عبرانی متن کے مطابق ہے۔ پس یہ قدیم ترین پارے موجودہ عبرانی متن کی تصدیق کرتے ہیں۔

جب ہم اس یونانی ترجمہ کا (جو دوہزار سال سے زیادہ عرصہ کا ہے) موجودہ عبرانی متن سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ باستثنائے متعدد الفاظ فقرات اور آیات دونوایک دوسرے کے مطابق ہیں۔ مثال کے طور پر عہدِ عتیق کی پہلی پانچ کتابوں

---

[1] Ecclesiastics

یعنی تورات کو لے لیں۔ موجودہ عبرانی تورات اور یونانی ترجمہ کی تورات کی کتابوں میں صرف چار اختلافات ہیں گو دیگر کُتب مثلاً سموئیل اور سلاطین میں اختلافات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان اختلافات کی زیادہ تروجہ یا تومترجم کی نا سمجھی ہے یا یہ ہے کہ اس نے اصل عبارت کا آزاد ترجمہ کردیا ہے۔

پس جس طرح ابتدائی زمانہ میں سامری تورات نے یہ ثابت کردیا تھا کہ موجودہ عبرانی کُتب بجنسہ وہی ہیں جو ان کے مصنفین نے تحریر کی تھیں اسی طرح یونانی ترجمہ سبعینیہ نے ثابت کردیا ہے کہ موجودہ عبرانی کُتبِ عہدِ عتیق بجنسہ وہی ہیں جو سیدنا مسیح سے صدیوں پہلے اہلِ یہود میں مروج تھیں اورجو اختلافات موجود ہیں وہ کتابت اور دیگر وجوہ کے سبب سے ہیں لیکن جہاں تک مطالب اور معانی کا تعلق ہے ان اختلافات کا وجود عدم موجودگی کے برابر ہے۔ پس اگرچہ کوئی محقق یہ نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ عبرانی کُتبِ مقدسہ حرف بحرف وہی ہیں جو اڑھائی ہزار سال پہلے رائج تھیں کیونکہ بہت سے اختلافات موجود ہیں جو معمولی قسم کے ہیں لیکن ان اختلافات کی بنا پر کوئی محقق یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایسے اہم ہیں کہ ان سے کُتبِ مقدسہ کے مطالب ومعانی میں عظیم فتور واقع ہوگیا ہے اور اب وہ اس لائق نہیں کہ ان پر اعتبار کیا جائے یا ان کو سند قرار دیا جائے۔

فصل دوم

مکابیوں کا زمانہ۔ کنارِ بحرِ مُردار کے طوُمار

ہم نے بابِ دوم کے شروع میں زیرِ عنوان "نسخوں کی تعداد" لکھا تھا کہ اب ہم کو عبرانی کُتبِ مقدسہ کے "قدیم ترین" نسخے دستیاب ہوگئے ہیں جن کا مطالعہ یہ ثابت کردیتا ہے کہ موجودہ عبرانی متن وہی ہے جوزمانہ قدیم سے چلاآتا ہے۔ یہ نسخے کب، کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوئے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان سوالوں کا جواب دیں۔ یہ مناسب معلوم ہوتاہے کہ ہم ناظرین کی واقفیت کے لئے اہلِ یہود کی قدیم تاریخ کے چند واقعات کا ذکر کریں کیونکہ صرف اس تاریخ کی روشنی میں ناظرین ان قدیم ترین نسخوں کی اصل حقیقت اوراہمیت سے کماحقہ واقف ہوسکتے ہیں۔

یہودی فرقہ قمران کا تواریخی پسِ منظر

جن اصحاب نے کُتبِ عہدِ عتیق تواریخ کا مطالعہ کیا ہے ان کو یاد ہوگا، کہ جب شاہِ فارس خورس Cyrus نے سلطنتِ بابل کا ۵۶۹ قبل مسیح خاتمہ کردیا تو اس نے یہودی قیدیوں کے ایک گروہ کو اپنے ملک میں واپس جانے کی اجازت دے دی جہاں سے نبوکد نصر بادشاہ نے ان کو دو پشتیں پہلے خارج از وطن کردیا تھا۔ خورس نے ان کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ یروشلیم کی ہیکل کو دوبارہ تعمیر کرلیں۔

چنانچہ چند سالوں کے بعد ہیکل دوبارہ کھڑی ہوگئی اوراس میں قدیم کاہنوں کی اولاد بدستورِ سابق قربانیاں چڑھانے لگی ۔ ان کا سردار کاہن حضرت داؤد کے زمانہ کے کاہن صدوق کے گھرانے کا تھا۔ اس کے بیٹے اوران کی اولاد ۹۶۰ سال قبل مسیح سے (جب

حضرت سلیمان نے پہلی عالیشان ہیکل بنائی) سردار کاہن ہوتے چلے آئے تھے ۔ جب اہل بابل نے ۵۸۷ قبل مسیح اس ہیکل کوتباہ کردیا اس وقت بھی صدوق کے گھرانے کے لوگ سردار کاہن تھے ۔ لیکن گوشاہ فارس خورس نے سردار کاہن کے گھرانے کے لوگوں کو یہ اجازت دیدی کہ وہ اپنے مذہبی فرائض ادا کریں اوراس نے ان کو اس کے سابق عہدہ پر بحال کردیا ۔ لیکن اس نے داؤد کے شاہی گھرانے والوں کو(جو اپنےوطنِ مالوف کوواپس آئے) شاہی اختیارات عطا نہ کئے ۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نئی یہودی قوم ایک ایسی ریاست ہوگئی جس کا سردار حضرت داؤد کی نسل سے نہ تھا بلکہ سردار کاہن ہی قوم اور ریاست کا سردار ہوگیا۔ وہ اہلِ یہود کے صرف اندرونی اور داخلی معاملات کا ہی انتظام کرتا تھا لیکن امورِ سلطنت یہودیہ کے سِول گورنر کے ہاتھوں میں ہوتے تھے اور وہ اُن اُمور کو سلطنتِ فارس کی پالیسی اور مصلحت ویہودی کو پیش نظر رکھ کر چلاجاتا تھا۔ بادشاہ خورس خود ان گورنروں کومقرر کیا کرتا تھا۔

جب دو سو سال کے بعد ۳۳۲قبل مسیح میں سکندرِ اعظم نے سلطنتِ فارس کا خاتمہ کردیا تو اس نے یروشلیم کی چھوٹی سی ریاست کا انتظام بحسبِ سابق بحال رکھا۔ اہلِ یہود کے لئے فرق صرف اتنا ہوا کہ اب فارس کے گورنر کی بجائے مقدونیہ کا گورنر مقرر ہوکر آتا اوریہودی سلطنت کے رہنے والے فارس کی سلطنت کو ٹیکس ادا کرنے کی بجائے مقدونیہ کی سلطنت کو ٹیکس ادا کرنے لگے۔ صدوق کے گھرانے کا سردار کاہن اس مختصر یہودی ریاست کا حسبِ سابق سرر ہا۔

جب مصر کے فراعنہ نے (جن کے حصے میں سکندر کے ممالک مقبوضہ کا وہ حصہ جو مصر پر مشتمل تھاآیا) غلبہ حاصل کرکے ۳۱۲ قبل مسیح میں کنعان کو اپنے قبضہ میں کرلیا تب بھی یہودی ریاست کے حالات میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب مصر کے حریف سلوکیوں نے (جن کے حصہ میں سکندر کے فتح کردہ ایشیائی ممالک آئے تھے) کنعان کو ۱۹۸ قبل مسیح میں فتح کرلیا تب بھی یہودیہ کی مختصر ریاست پر کوئی بڑا اثر نہ پڑا۔ اور سلوکیوں کا یونانی بادشاہ اپنےدارالسلطنت انطاکیہ واقع شام سے ان پر سلطنت کرنے لگا ۔ لیکن فاتحین کی یونانی تہذیب جو دوصد سال سے یہود کو متاثر کررہی تھی اب مفتوحین کو اپنے رنگ میں رنگنے لگی ۔ لیکن یہ ایک اندرونی معاملہ تھا۔ ریاست کے سر کو " غیر اقوام" کی حکومت سے کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ سردار کاہن اور عوام یہود کو بحسبِ سابق اپنے مذہبی فرائض ، رسوم ، اور دستورات وغیرہ کوادا کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔

سلوکیہ خاندان کے فرمانرواؤں کے عہد میں اہلِ یہود پر یونانی، زبان، یونانی علم ادبِ یونانی طریق زندگی ، یونانی معاشرت اوریونانیت نے زبردست پیمانہ پر اثر کیا۔ یہودی عوام تک اس قدر متاثر ہوگئے کہ دیندار یہود کو یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ مبادا یونانیت ، یہودیت کو جذب کرلے اوران کی یہودی شریعت خصوصی رسوم وروایات مٹ جائیں پس۔ انہوں نے عزم بالجزم کرلیا کہ ہرچہ بادا باد وہ اپنے آباؤاجداد کی روایات ، طریق معاشرت اور خدا کی شریعت کو بُت پرستی اوریونانیت کے زہریلے اثر سے بچا کہ رہیں گے ۔ اس قسم کے خیالات کے یہود کا نام "حسدیم" یعنی" پاک باز" پڑگیا۔ اس گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جن کی دانی ایل کی کتاب میں " مسکلین" یعنی " دانا" یا " استاد " کا نام دیا گیاہے۔ کیونکہ وہ سچی اور راست دانش یعنی یہودی شریعت ورواج کی تلاش میں تھے اورلوگوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے۔

جب اینٹی اوکس چہارم Antiochus IV جو ایپی فینیز، Epiphanies کے نام سے موسوم ہے ۔ ۱۷۵ قبل مسیح تختِ سلطنت پر بیٹھا تو عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لیتے ہی اس نے یہودی سردار کاہنوں کے سلسلہ کہانت میں دخل اندازی شروع کردی اور ۱۷۱ قبل مسیح میں اس نے صدوق کہانت کے سردار کاہن کو برطرف کردیا اور اپنے ایک پروردہ شخص مینی لاس Menelaus کو سردار کاہن بنادیا۔ تقرری سے پہلے بادشاہ نے اس سے وعدہ لے

لیا کہ وہ ہر ممکن کوشش کرکے اہلِ یہود کو یونانیت کے رنگ میں رنگ دے گا۔ ۱۷۲ قبل مسیح میں بادشاہ نے یہودی طریق زندگی پر حملے شروع کردیئے تھے اور ۱۶۷ قبل مسیح اس نے خصوصی یہودی رسوم مثلاً ختنہ ، سبت کا ماننا وغیرہ ممنوع قرار دیدیا اور حکم صادر کیا کہ یہودی کُتبِ مقدسہ کو تباہ وبرباد کردیا جائے۔ جس شخص کے گھر سے کُتبِ مقُدسہ کا کوئی نسخہ برآمد ہوتا اس کو جان سے ماردیا جاتا ۔ اس نے حکم دیا کہ تمام یہودیہ کے باشندے خدائے واحد کی بجائے بُتوں کی پرستش کریں اور شرعی رسوم کی بجائے یونانی بُت پرستوں کی رسوم اختیار کریں۔اسی سال کے آخر میں اس کے حکم سے یروشلیم کی ہیکل دیوی دیوتاؤں کے بُتوں کی پرستش کے لئے مخصوص کردی گئی ۔ جو یہود اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے ان پر سخت ترین مظالم ڈھائے گئے ۔ اس نے یروشلیم کو جلادیا۔ ہزارہا مردوزن کو بیدریغ تہ تیغ کردیا۔ جوان عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کردیا۔ یہود کو احکام سبت کو توڑنے اور حرام اشیا کو کھانے پر مجبور کیا اور حکم دیا کہ یہودی شریعت پر عمل کرنے والا قتل کردیا جائے۔ یہودہ کے ہر قصبہ میں بتوں کے آگے قربانیاں چڑھائی گئیں۔ ہیکل کی قربانگاہ پر خنازیرقربان کئے گئے اور قدُس الاقداس میں دیوی دیوتاؤں کے بُت نصب کئے گئے ۔ اسی واقعہ کا ذکر دانی ایل کی کتاب (۹: ۲۷، ۱۱: ۳۱) میں کیا گیا ہے جہاں ان دیوی دیوتاؤں کے بُتوں کو اجاڑنے والی مکروہات کہا گیا ہے۔ دانی ایل کے یہ الفاظ یہودی تاریخ میں اس قدر معنی خیز ہوگئے کہ منجئی عالمین کی صلیبی موت کے دس سال بعد جب رومی قیصر کالی گیولاCaligula نے ۴۰ء میں حکم صادر کیا کہ یروشلیم کی ہیکل میں اس کا بُت نصب کرکے اس کی پرستش کی جائے تو انجیل نویس مقدس مرقس اس کے حکم کی جانب دانی ایل کے مذکورہ بالا الفاظ میں اشارہ کرتاہے کہ " جب تم اس اجاڑنے والی مکروہ چیز کو اس جگہ کھڑی دیکھوجہاں اس کا کھڑاہونا روا نہیں (پڑھنے والا سمجھ لے---۔الخ) (۱۳: ۱۴)[1]۔

اینٹی اوکس کے احکام نے اہلِ یہود کے جذبات کو بے حد مشتعل کردیا۔ معدودے چند یونانیت کے شیدائیوں کے سوا تمام کی تمام قوم ایک تن ہوکر سربکف ہوگئی اور سب نے مرنے مارنے پر تیار ہوکر تہیہ کرلیا کہ وہ بزورِ شمشیر اس بُت پرست ظالم بادشاہ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے ۔ ان کا لیڈر متھیاس کاہن تھا جوکہنے کو تو بوڑھا تو لیکن جوانوں سے زیادہ جواں ہمت اور دلیر تھا۔ اہلِ یہود نے اس کی اوراس کے بیٹے یہوداہ مکابی اور دیگر چار بیٹوں کی زیر قیادت اپنے آپ کو منَظّم کرلیا۔ یہود کا فرقہ " حسدیم" بھی مکابیوں کے ساتھ مل گیا۔ سب یہود باغی ہوگئے اور شاہی افواج سے خونیں جنگ کرکے فتحیاب ہوتے چلے گئے تو تین سالوں کی سخت اور متواتر جنگوں میں شکست پر شکست کھانے کے بعد بادشاہ اینٹی اوکس کو ہوش آئی اور اس نے ان پابندیوں کو منسوخ کردیا جو یہودی مذہب اور شریعت پر لگائی گئی تھیں۔ گذشتہ تین سال میں یروشلیم کی ہیکل میں بُتوں کی پرستش ہوتی رہی تھی۔ اس مدُت کے بعد جب مکابیوں کی فتح نصیب ہوئی تو یہوداہ مکابی اپنے ساتھیوں سمیت ہیکل میں داخل ہوا۔ اس نے ہیکل کو پاک کیا اور ازسرِ نووہ خدائے واحد کی عبادت کے لئے مخصوص کردی گئی۔

مکابیوں کے زمانہ میں کُتب مقدسہ کی حفاظت

جب شمعون مکابی کی زیر سرگردگی اہلِ یہود نے خود مختاری حاصل کرلی تو یہودی کُتبِ مقدسہ کی حفاظت ان کا مقصدِ زندگی ہوگیا۔ اینٹی اوکس کے احکام نے تورات اور

[1] ہم نے اس واقع کا مفصل ذکر اپنی کتاب " قدامت واصلیت اناجیل اربعہ" جلد اول کے حصہ دوم کے باب سوم کی فصل چہارم میں کیا ہے۔ (برکت اللہ)

صحائف انبیاء کی قدرومنزلت کو ان کی نظروں میں دوبالا کردیا۔ ان تینوں سالوں میں بادشاہ کی قہرمانی کی وجہ سے انہوں نے نہایت تندہی اور کوشش سے اپنی کُتبِ مقُدسہ کی حفاظت کی۔ مکابیوں کی دوسری کتاب کے ۲: ۱۴ سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت عزرا اور نحمیاہ نے کُتبِ مقُدسہ کی حفاظت کے لئے ایک کُتب خانہ قائم کیا تھا اسی طرح یہوداہ مکابی اوراس کے جانشینوں نے کُتبِ مقُدسہ کو جمع کرکے محفوظ رکھا۔ یہ محبِ وطن اور قوم ومذہب کے عاشق اپنی قوم کے مذہبی پیشوا بھی تھے لہذا وہ اپنے عہد میں اپنی مذہبی کُتب کی حفاظت کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔

یہودی فرقہ قمران کا آغاز

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ بادشاہ اینٹی اوکس نے مجبور ہوکر تین سالہ کی متواتر شکستوں کے بعد اہلِ یہود کو مذہبی آزادی دیدی ۔ لیکن اب یہود کی متواتر فتوحات نے ان کے حوصلے بلند کردئیے تھے اور یہوداہ نے ان مراعات کو ٹھکرادیا اور جنگ آزادی جاری رکھی۔ یونانی افواج نے فتح حاصل کرنے کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن ناکام رہے۔ ایک سبُت کے روز انہوں نے یہودی لشکر پر دھاوا بول دیا۔ لیکن سبت کے حکام کی تعمیل میں یہود نے ہتھیاروں کو ہاتھ تک نہ لگایا ، اور ہزاروں کشتوں کے پشتے لگ گئے(دانی ایل ۱۱: ۳۲، ۳۳) ان خونریز جنگوں کا تفصیلی بیان مکابیوں کی پہلی کتاب میں پایا جاتا ہے۔ ادھر یہود خود مختاری حاصل کرنے پر ڈٹے ہوئے تھے، اُدھر اینٹی اوکس کی سلطنت میں خود ارکان سلطنت نے بد نظمی پھیلارکھی تھی۔ اندرونی حالات نے یہودی مساعدت کی اور بلآخر ۱۴۲ قبل مسیح ملک یہودیہ سلوکیوں کی حکومت کے ہاتھوں سے نکل گیا اور شمعون مکابی (جس کے چاروں بھائی جنگ میں کام آئے تھے) یہودیہ کے ملک خود مختار بادشاہی کا سرہو گیا۔

شمعون مکابی نے ملکی قیادت پر ہی اکتفا نہ کی ،چونکہ وہ حشمونی کاہنوں کے خاندان سے تھا اس نے اس بات کو غنیمت جان کر سردار کاہن کا عہد ہ بھی غصب کرلیا حالانکہ وہ صدوق کے گھرانے سے نہ تھا۔ یوں اس نے ملکی قیادت اور مذہبی سیادت کے دونوں عہدوں کو سنبھال لیا۔ لیکن کٹر یہود کو یہ حرکت پسند نہ آئی ۔ فرقہ حسدیم کے پابندِ شریعت یہود اس قدم کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ شمعون اورا سکے بیٹے یوحنا ہر کینس Hyrcanus کے دوران حکومت میں (از ۱۴۲ تا ۱۰۴ قبل مسیح) یہ آگ اندرہی اندر سلگتی رہی۔ بالآخر جب سکندر جینیس Jannaeus ۱۰۳ قبل مسیح تخت نشین ہوا تو یہ پھوڑا پھوٹ نکلا۔ حسدیم کی ایک بڑی جماعت نے الگ ہوکر " فریسیوں " کی جماعت بنالی۔ ایک دوسرے گروہ نے " راستی کے استاد" کی زیر قیادت اپنی الگ تنظیم کرلی۔ یہ گروہ اپنے قائدہ کو ہادی صادق مانتا تھا اوراس کے اشاروں پر بلا چوُن وچرا چلتا تھا۔ یہ ہادی اپنی جماعت کو تورات اور انبیائے سلف کے مقامات کی " صحیح اور " راست " تفسیر تاویل کرکے ان کو کُتبِ مقدسہ پر سختی سے عمل کرنے کی تائید کرتا تھا جس کی وجہ سے گروہ کے امام کا نام"راستی کا استاد" پڑگیا۔ اس نے یسعیاہ نبی کے صحیفہ کی ۴۰: ۲ کی بناء پر اپنی جماعت کو حکم دیا کہ " بیابان میں خداوند کی راہ درست کرو۔ صحرا میں ہمارے خدا کے لئے شاہراہ ہموار کرو۔" پس تمام جماعت کے کل افراد نے یہودیہ کے بیابان کی راہ لی اور انہوں نے قمران کو اپنا صدر مقام بنالیا۔ وہ اس بیابان میں خیموں میں رہنے لگ گئے جس طرح ان کے آباؤ اجداد حضرت موسیٰ کے زمانہ میں خیموں میں رہتے تھے۔ انہوں نے ازسرِ نو یہ عہد کرلیا کہ وہ خدا کی شریعت کے ہر قانون کے پابند ہوں گے تا کہ دنیا میں ایک نیا دور شروع ہوجائے جو راستی وصداقت اور راستبازی کا دوَر ہو۔ اس جماعت کے افراد اپنے آپ کو " خدا تعالیٰ کے مُقدس لوگ۔" عہد کے پاک لوگ"، "نور کے فرزند" ، "راست یا صادق انسان"، خدا کی برگزیدہ جماعت" ، اسرائیل اورہارون کی" جماعت حقہ" ، تقدس کے رضا کار" وغیرہ کہتے تھے۔ ان کے ہادی صادق کا تاویل ، شرع نہایت کڑی تھی جو فریسیوں کے " بزرگوں کی روایات" سے بھی زیادہ سخت تھی۔

یہودی فرقہ قمران کی تاریخ

مکابیوں یعنی حشمونیوں کا خاندان ۱۴۲ قبل مسیح سے ۶۳ قبل مسیح تک برسر اقتدار رہا۔ یہ بادشاہ دنیاوی سلطان اور مذہبی سردار کاہن تھے۔ لیکن کٹر یہود اور قمران کے یہود اس بات کو تسلیم نہیں کرسکتے تھے (اور نہ کرتے تھے) کہ یہ خدا کی مرضی ہے کہ صدوق کی نسل کے علاوہ کسی دوسرے کاہن کی اولاد سردار کاہن ہو۔ علاوہ ازیں وہ کہتے تھے کہ سردار کاہن کے لئے لازم ہے کہ وہ پاک اور بے عیب ہو لیکن ان سردار کاہنوں کے ہاتھ جنگوں سے (جو مذہبی نہ تھے) اور خلقِ خدا کے خون سے رنگے تھے۔ بالخصوص جب سکندر جینیس سردار کاہن کے فرائض ادا کرنے لگا تو ان کٹر پابند شریعت یہود کا خون اُبل پڑا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ نہ صرف بے شمار جنگوں کے خون سے رنگے تھے بلکہ وہ ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ پس ازروئے شریعت وہ صحیح النسب بھی نہ تھا۔ اس موقعہ پر ہر طرف سے اس پر آواز کسے گئے۔ جینیس صبرو برداشت کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ اس نے اپنی کرایہ کی فوج کو اشارہ کیا جس نے اس کے ہزاروں ہم قوموں کا قتل عام کردیا۔ چونکہ یہود قمران کا اس تحریک میں ہاتھ تھا اس کا غضب ان پر نازل ہوا۔ اس نے اپنے دشمنوں کو گرفتار کرکے اپنے محل کے سامنے صلیب پر کھینچ دیا جو یہودی شریعت کی سزا نہ تھی بلکہ "غیر اقوام" کی سزا تھی۔ مصلوب پیاس، بھوک اور شدت درد کے عذاب سے چیختے تھے اور وہ اپنی عورتوں کے ساتھ عیش کرتا یہ تماشہ دیکھتا تھا۔ اس کے حکم سے مصلوب قیدیوں کے بیوی بچے مقتل میں لائے گئے اور مرنے والوں کی آنکھوں کے سامنے نہایت بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ ایسی بات پہلے اسرائیل میں نہ کی گئی تھی اور نہ سنی گئی تھی۔ قمران کی کُتب میں اس سردار کاہن کو "بدکار اور شریر کاہن" کا نام دیا گیا ہے۔

حشمونی خاندان ۱۴۲ قبل مسیح سے ۶۳ قبل مسیح تک برسراقتدار رہا۔ بلاآخر ۶۳ قبل مسیح میں رومی سلطنت کی افواج نے یہودی لشکر کو شکستِ فاش دے کر ارضِ مقدس پر قبضہ کرلیا۔ رومی حکومت نے دریائے فرات کے مغرب کے تمام مفتوحہ ملکوں کے علاقہ کی از سر نو تنظیم کردی۔

رومی فاتحین نے بیس سال تک حشمونی سردار کاہن کو یہودی علاقہ کے اندرونی معاملات، کا انتظام کرنے دیا لیکن ۴۰ قبل مسیح میں انہوں نے مغربی ایشیا کے سیاسی حالات کو مدنظر رکھ کر ہیرودیس کو اہل یہود کا بادشاہ بنادیا جس نے ۳۷ قبل مسیح سے ۴ قبل مسیح تک ارضِ مقُدس پر حکومت کی اور سلطنتِ روم کے مفاد کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ارخلاؤس تخت نشین ہوا لیکن ۶ء عیسوی میں قیصر روم نے اس کو برطرف کردیا۔ اس کے بعد ساٹھ سال تک قیاصرہ روم کے مقرر کردہ گورنر ارضِ مقدس کے حاکم رہے۔ گو ان ساٹھ سالوں میں صرف تین سال تک (از ۴۱ء تا ۴۴ء) ہیرودیس کا پوتا اگرپا اوّل نے یہودیہ پر بطور بادشاہ حکومت بھی کی۔

ہیرودیس بادشاہ اپنی حکومت کی ابتدا ہی سے اہلِ یہود کے سردار کاہن مقرر کرتا رہا اور اس کے جانشینوں نے بھی یہی پالیسی اختیار کی۔ اس کے بعد رومی گورنر سردار کاہنوں کو مقرر کرنے لگے جو ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار کاہنوں کا اقتدار کم ہوتا چلا گیا اور وہ بس سنہیڈرن (جو قوم یہود کی صدر عدالت تھی) کی کرُسی صدارت کی ہی زینت بن کر رہ گئے۔

رومی گورنر بالعموم نااہل ہوتے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ محکوموں کے مذہب رسوم اور دستورات سے قطعی ناواقف ہوتے تھے۔ پس ملک میں بدانتظامی کے ساتھ ساتھ بدامنی کا دوَر دورہ ہوگیا۔ اُدھر یہودی قوم پرستوں میں اور بالخصوص وادی قمران کے یہود میں روز بروز بے چینی پھیلتی چلی گئی کیونکہ وہ کسی "غیر قوم" کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کا مدعاُ یہ تھا کہ موسوی شریعت اور انبیائے سلف کے احکامات کے مطابق ان پر حکومت ہو اور قوانینِ ملک وہ ہوں جو کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ یہود

نے ۶۶ء میں بغاوت کردی۔ لیکن رومی افواج نے ان کو سرکوبی کرکے ۷۰ء میں یروشلیم کی ہیکل کو تباہ کردیا اور شہر کو ویرانہ بنادیا۔ ہیکل کی تباہی کی وجہ سے یہودی شریعت اور قربانیاں چڑھاوے وغیرہ سب ختم ہوگئے اور سردار کاہن کا عہدہ بھی ختم ہوگیا۔ یہودیہ کا ملک رومی فوج اور فوجی حُکام کے ماتحت کردیا گیا۔ لیکن یروشلیم کی بربادی سے قوم پرست اور شریعت کے شیدائی یہود کے ارمان نہ مٹ سکتے تھے۔ اور نہ مٹے۔ انہوں نے ۱۳۲ء میں دوسری دفعہ رومی قیصر ہیڈرین Hadrian کے عہدِ حکومت میں بغاوت کردی۔ اس بغاوت کا سرغنہ شمعون نام ایک یہودی تھا جس نے " شاہزداہ اسرائیل" کے خطاب سے اپنے نام کے سکے مسکوک کرائے۔ ان سکوں پر " اسرائیل کی رہائی کا پہلا سال" اسرائیل کی آزادی کا دوسرا سال" کندہ تھا۔ شمعون " شاہزادہ اسرائیل " نے صرف دنیاوی سرداری پر اکتفا نہ کی کیونکہ عوام میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ وہ مسیح موعود ہے جس کو خدا نے قوم اسرائیل کو بُت پرست قیاصرہ روم کے پنجہ استبداد سے چھڑانے کے لئے بھیجا ہے۔ یہ خیال عوام کے علاوہ ربی عقبہ جیسی مقدر ہستی کا بھی تھا جو ایک زبردست اور جید عالم تھا۔ اس نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ یہ شمعون وہی " ستارہ " ہے جس کی بلعام نے صدیوں پیشتر بایں الفاظ پیشن گوئی کی تھی کہ یعقوب میں سے ایک ستارہ نکلے گا اور اسرائیل میں سے ایک عصا اٹھے گا۔ وہ موآب کی نواحی کو مار مار کر صاف کردے گا اور سب ہنگامہ کرنے والوں کو ہلاک کرڈالے گا۔ اس کے دشمن اس کے قبضہ میں ہوں گے۔(گنتی ۲۴: ۱۷تا ۱۹) ۔ اس مفروضہ پیشین گوئی کی وجہ سے شمعون کا نام ابنِ کوکب (ارامی= " بارِ کوکب") یعنی ستارہ کا بیٹا پڑگیا۔ لیکن بعض یہودی (بالخصوص یہودی مسیحی) شمعون کو مسیحِ موعود تسلیم نہیں کرتے تھے۔انہوں نے اس کو " ابنِ کب" کی بجائے " ابنِ کاذب " (ارامی "بارِ کاذب") کا نام دیدیا۔ لیکن تین سال کی متواتر اور خون ریزی جنگوں کے بعد ۱۳۵ء میں یہ بغاوت بھی ختم ہوگئی۔ رومی افواج نے یہودی قوم پرستوں اور بالخصوص شریعت کے پابندوں کو چُن چُن کر قتل کردیا۔ انہوں نے یروشلیم شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی ایسا کہ اس کی کسی عمارت کے پتھر پر پتھر باقی نہ رہا۔ رومیوں نے دوبارہ شہر یروشلیم کو اس طور پر تعمیر کردیا کہ اس میں اور دیگر بُت پرست شہروں میں تمیز اڑ گئی۔ انہوں نے یہودی شہر یروشلیم کا نام ونشان بھی باقی نہ رہنے دیا اور ارضِ مقدس کی تاریخ میں ایک نیا باب کھل گیا۔

اس بغاوت میں قمران کے یہود پیش پیش تھے۔ جب یہود کو شکستِ فاش ملی تو وہ یہودیہ کے بیابان میں بحر مُردار کے کنارے کے غاروں میں جو ان کی رہائش گاہیں تھیں واپس چلے گئے۔ لیکن رومی افواج نے ان کا وہاں بھی جا پیچھا کیا۔ پس انہوں نے اپنی جان سے عزیز مقدس کتابوں کے طوماروں کو بڑے بڑے مرتبانوں میں حفاظت کے ساتھ بند کردیا۔ اور غاروں میں چھپا کر بھاگ گئے۔

یہ ہے پس منظر ان طوماروں کا جو کُتُب عہد عتیق کے قدیم ترین نسخے ہیں۔ ان طوماروں کا مطالعہ ثابت کردیتا ہے کہ عبرانی کُتُبِ مقدسہ کا موجودہ متن وہی ہے جو وادی قمران کے نسخوں کا ہے۔

وادی قمران کے یہود کے اعتقادات

ہم سطورِ بالا میں یہود وادی قمران کے عقائد کا کچھ ذکر کرآئے ہیں جن کی وجہ سے وہ شریعت کے اس قدر پابند تھے اور کُتُبِ مقدسہ کے اس درجہ عاشق تھے کہ انہوں نے شہروں کو چھوڑ کر بیابان میں رہائش اختیار کرلی۔ وہ اپنے آپ کو " حقیقی اسرائیل کی جماعت " تصور کرتے تھے جن کا یہ فرض تھا کہ اس برگشتگی ، ارتداد اور بے دینی کے زمانہ میں وہ توراتِ موسوی اور انبیائے سلف کے آئین وقوانین اوراحکام کے پابند رہیں اور خود خدا کے عہد کو قائم برقرار اور استوار رکھ کر الہیٰ وقت عدالت سے پہلے تمام قوم کو دین حق پر واپس لائیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ لڑنے مرنے کو تیار رہتے تھے۔ دین اور دینی کتابوں کے تحفظ کے لئے انہوں نے جہاد کرنے کی خاطر جماعت کی تنظیم کی۔ انہوں نے اُصول اور

ضابطے وضع کئے جو ان کی دو کتابوں " ضابطہ کا دستور" اور " صدوقی دستاویز" میں محفوظ ہیں اور فی الواقع ہمارے سامنے میز پر پڑی ہیں [1]۔ موخرالذکر کتاب قاہرہ سے ۱۸۹۲ء میں دستیاب ہوئی تھی جب کوئی شخص اس جماعت کا نام بھی نہیں جانتا تھا جس کی وجہ سے کسی کو اس کتاب کا سر پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ اول الزکر کتاب وادی قمران کے غاروں سے ۱۹۴۷ء میں دستیاب ہوئی جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

اس جماعت کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا کا آخری زمانہ تب آئے گا جب عہدِ عتیق کی کُتبِ مقدسہ کی تین پیشین گوئیاں پوری ہوں گی۔ اوّل۔ استثنا ۱۸: ۱۵ کہ مطابق نبی موعود کی آمد ہو گی۔ دوم۔ مسیح موعود آئے گا جو ابنِ داؤد ہوگا اور سوم۔ ہارون کے گھرانے سے ایک زبردست کاہن (امام) برپا ہوگا جو دنیا کے نئے دور میں ریاست کا سر ہوگا۔ داؤد کی نسل سے جو مسیحِ موعود برپا ہوگا وہ ایک زبردست اور جنگجو شاہزادہ ہوگا جو "تاریکی کے فرزندوں" کو تہ و بالا کردے گا اور رومی سلطنت کے اقتدار کو توڑ کر اس کو پامال کردے گا جو" نبی موعود "برپا ہوگا وہ قوم کے لوگوں کے پاس خدا کے احکام بعینہ حضرت موسیٰ کی طرح پہنچایا کرے گا۔ ہارون کے گھرانے سے جو کاہن برپا ہوگا وہ پاکباز پابند شریعت اور عالم شرح ہوگا جو تورات اور کُتبِ انبیائے سلف کے احکام سے سرِ مو انحراف نہ کرے گا۔

اس جماعت کا " ہادی صادق" اپنے خصوصی عقائد کے مطابق کُتبِ مقدسہ کی تاویل و تفسیر کرتا تھا۔ اس کے پیرو اس کی تفسیر کو الہام کے قریب قریب تصور کرتے تھے۔ وہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ قمران کا گروہ یہود یسعیاہ نبی کے ۵۲ باب کے مطابق تمام بنی اسرائیل کے لئے فدیہ ہوگا۔ جب آخری ایام آئیں گے تب " نور کے فرزند" " تاریکی کے فرزندوں" سے بزورِ سیف جنگ کرکے عدالت کا کام سرانجام دیں گے اور اسرائیل کے گنہگار مجرم

The manual of Discipline and the Zadokite Document.[1]

لیڈر کیفر کردار کو پہنچیں گے (یہاں سکندر جینیس اور مکابیوں کی جانب اشارہ ہے جو کُتبِ مقدسہ کو اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کرتے تھے) لیکن بنی اسرائیل کے عوام بچ جائیں گے کیونکہ جماعتِ قمران کی جانبازی اور فداکاری ان کا فدیہ تصور کی جائے گی۔ خدا کی یہ برگزیدہ جماعت غیر اقوام کی عدالت کرے گی۔ پس اہل قمران کی تعلیم کے مطابق اس جماعت نے نہ صرف یسعیاہ نبی کی کتاب کے "خادم یہواہ" کا پارٹ ادا کرنا تھا تاکہ " بہتوں کو راستباز بنائے " بلکہ دانی ایل نبی کی رویا کے مطابق اس جماعت نے " آدم زاد" کا بھی پاٹ ادا کرنا تھا جس نے " قدیم الایام" ہستی سے اختیار حاصل کرکے تاابد حکومت اور اقتدار حاصل کرنا تھا۔(دانی ایل ۷: ۱۳ تا ۲۳)۔

اس فرقہ کا امام" ہادی صادق" جماعت کے خصوصی عقائد کے مطابق کُتبِ مقُدسہ کی تاویل کرتا تھا وہ کہتا تھا کہ ان کُتب میں ہمارے اپنے زمانہ کے واقعات اور ہمارے ہم عصروں کے بارے میں پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ پس ان کا ذکر ہماری کُتبِ مُقدسہ میں صاف طور پر ملتا ہے کیونکہ یہ انبیاء صفائی کے ساتھ بتلاتے ہیں کہ خدا آخری زمانہ میں کیا کرے گا اگرچہ وہ یہ نہیں بتلاتے کہ یہ آخری زمانہ کب آئے گا۔ ہم ناظرین کی واقفیت کی خاطر مزمور ۳۷ کی آیات ۲۱ تا ۲۴ اور ۳۲، ۳۳ کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

آیات ۲۱، ۲۲ میں مُراد کامل انسانوں کی اس جماعت سے ہے جنہوں نے اپنا تمام مال وزر ایک مشترکہ فنڈ میں جمع کردیا ہے اور اپنا مال اپنا نہیں بلکہ جماعت کا سمجھتے ہیں۔ وہ " اسرائیل کے اونچے پہاڑ" کے وارث ہوں گے (حزقی ایل ۱۷: ۲۳) جو لعنتی لوگ کاٹ ڈالے جائیں گے وہ ظالم غیر اقوام ہیں جنہوں نے اسرائیل پر ظلم و ستم برقرار رکھے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے کاٹ ڈالے جائیں گے۔

آیات ۲۳، ۲۴: اس کاہن کا ذکر ہے جو شریعتِ خدا کی صحیح تفسیر کرتا ہے اور لوگوں کو خدا کے احکام کی تعلیم دیتا ہے تاکہ وہ خدا کے لئے ایک ایسی جماعت کی عمارت کھڑی کرے جس کی محکم بنیاد سچائی پر قائم ہو۔

آیات ۳۲، ۳۳: یہاں اس "شریر کاہن" (سکندر جینیس) کی پیشین گوئی ہے جو شریعت کو صحیح تعلیم دینے والے (یعنی "ہادی صادق") کی تاک میں رہتا ہے اور اس کے خلاف منصوبے باندھتا ہے تاکہ اس کا کام تمام کردے اور کتاب اللہ اور خدا کے عہد کا خاتمہ ہوجائے۔ لیکن گو "شریر کاہن" جماعت کے "ہادی صادق" پر حملہ بھی کردے تاہم خدا اس کو "شریر کاہن" کے ہاتھوں میں نہ چھوڑے گا۔ اس پر الزام لگایا جائے گا لیکن اس پر فتویٰ نہ لگے گا۔ جب اس کو عدالت میں لایا جائے گا تو اس کو مجرم نہ ٹھہرایا جائے گا۔

ناظرین نے خود بھانپ لیا ہوگا کہ مذکورہ بالا آیات "ہادی صادق" اور "شریر کاہن" وغیرہ اوران کے زمانہ کے واقعات کی پیشین گوئیاں نہیں ہیں لیکن یہ جماعت ان اور دیگر کُتبِ مُقدسہ کے مقامات کو خواہ مخواہ اس طرح پیشین گوئیاں قرار دے دیتی تھی جس طرح دورِ حاضرہ کے بعض مسلمان عالم کتاب اللہ کے بعض الفاظ و مقامات کو رسول عربی کی بعثت کی پیش خبریاں قرار دیتے ہیں۔ ہم اس موضوع پر اپنی کتاب "توراتِ موسوی اور محمد عربی" کے پہلے حصہ میں مفصل بحث کی ہے۔

کنارِ بحرِ مُردار کے طُومار

بحرِ مُردار کو کتابِ مقدس میں "دریائے شور" (پیدائش ۱۴: ۳) "یردن پار دریائے میدان جانب مشرق" (استشنا ۴: ۴۹) اور "مشرقی سمندر" (حزقی ایل ۴۷: ۱۸) کے نام دئیے گئے ہیں۔ یہ سمندر قریباً ۴۸ میل لمبا ہے جس میں چار دریا گرتے ہیں۔ یہودیہ کے کنارے پر اس بحر کا پانی پایاب ہوجاتا ہے اور پھر "نمک زار" (صفنیاہ ۲: ۹) میں جا کر جذب ہوجاتا ہے۔ اس کے پانی میں مچھلیاں مرجاتی ہیں۔ سیدنا مسیح کی پیدائش سے پہلے یہ بحرِ ملکِ یہودہ اور اس کے آس پاس کے ممالکِ موآب اور ادوم کے درمیان حد بندی کا کام دیتا تھا۔ (۲۔ تواریخ ۲۰: ۱ تا ۳۰)۔

۱۹۴۷ء کے موسمِ گرما کے اوائل کا ذکر ہے کہ بدوی قبیلہ تعمیرہ کا ایک لڑکا محمد نام بحرِ مردار کے شمالی مغربی ساحل کے نزدیک پہاڑیوں کے تہِ دامن (جہاں قدیم شہر یریحو آباد تھا) اپنی بکریاں چرارہا تھا۔ اس کی ایک بکری چرتی چرتی بھٹک گئی۔ محمد ان ڈھلوان پہاڑیوں کی چٹانوں پر اس کو تلاش کرتا ایک پہاڑی کی کھوہ کے پاس پہنچا جس کا منہ گول تھا۔ بدیں خیال کہ شاید بکری اس میں گر گئی ہو۔ اس نے جھک کر دیکھا تو اس کو تاریک غار نظر آیا۔ اس نے پتھر اٹھا کر پھینکا تو اس کو کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کہ شائد اس میں کوئی جن یا بھوت پریت رہتا ہے۔ وہ ڈر کے مارے وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھا۔ اگلے روز وہ ایک اور لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر بدیں خیال واپس وہاں گیا کہ شائد اس غار میں کوئی خزانہ چھپا ہے۔ جب دونوں غار میں اترے تو کیا دیکھتے ہیں وہاں چند بڑے بڑے مرتبان فرش پر رکھے ہیں جن میں ایک محمد کی ضرب ٹوٹا پڑا ہے۔ یہ مرتبان رال سے سر بمہر نہائت حفاظت اور احتیاط سے بند کئے ہوئے تھے۔ ان مرتبانوں میں ان کو خزانہ کی بجائے چمڑے کے ایک درجن طومار ملے جو کسی غیر مانوس زبان میں لکھے ہوئے تھے اور کپڑے میں لپٹے اور رال سے سر بمہر بند کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے چند طومار لئے تاکہ ان کو چوری چھپی فروخت کرکے منافع اٹھائیں۔

یہ بدوی لڑکا محمد ایک عرب تھا اور اس کا تعلق ایک ایسے قبیلہ سے تھا جس کا پیشہ یہ تھا کہ وہ بکریوں اور دیگر ممنوعہ اشیاء کو یردن پار کنعان میں چوری چھپی لے جا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ حکومتِ یردن نے سخت حکم دے رکھا ہے کہ جو اشیا غاروں میں ملیں وہ حکومت کے حوالے کردی جائیں۔ پس انہوں نے دیگر ممنوعہ اشیا کو اوران

طوماروں کو لے کر بیت اللحم کا رخ کیا تا کہ وہاں سب ممنوعات کو فروخت کریں ۔ گرفتاری کے ڈر کے مارے وہ دریائے یردن کے پُل کو چھوڑ کر دُور جنوب کی جانب چلے گئے تا کہ محصول کی چوکیوں کے پہرہ دار ان کو نہ دیکھ پائیں۔انہوں نے نالہ کو پایاب عبور کیا اور بحرِ مُردار کی جانب آئے کیونکہ اس کے مضافات کے تمام خشک ویرانہ میں صرف ایک ہی پانی کا چشمہ تھا اور ان کو اپنے لئے اور جانوروں کے لئے پانی درکار تھا۔ یہ مقام ان کے لئے محفوظ بھی تھا کیونکہ ویرانہ میں کوئی شخص آتا جاتا نہ تھا ۔ بیت الحم پہنچ کر انہوں نے پہلے دوسری ممنوعہ اشیاء کو فروخت کیا اور پھر ایک سوداگر کی تلاش کرنے لگے جو ان طوماروں کو خریدے ۔ اتفاق سے یہ سوداگر ملک شام کا رہنے والا مسیحی تھا۔ اس نے بایں خیال کہ شاید طوماروں کی تحریر قدیم سریانی زبان ہے ، ان کو مقدس مرقس کی خانقاہ میں شامی کلیسیا کے میٹروپالی ٹن مارا تھاناسیس یشوع سموئیل کے پاس لے گیا۔ یہ میٹروپالی ٹن یعقوبی شامی کلیسیا کا تھا جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا سلسلہ سیدھا انطاکیہ کے پیٹریارک کے ساتھ ہے جس کی بنیاد مقدس پطرس نے ڈالی تھی ۔ میٹروپولیٹن نے تحریر کو دیکھا تو وہ قدیم سریانی نہ تھی بلکہ عبرانی زبان تھی۔ طوماروں کی قدامت دیکھ کر میٹروپولیٹن نے ان کو خرید لیا۔

PHOTOGRAPH OF ANCIENT GREEK MANUSCRIPTS:
(From Westwood's *Palaeographia Sacra Pictoria.*)

1. Scrap of a famous Greek Manuscript of Genesis (Codex Geneseos Cottonianus).
2. Portions of its writing, full size.
3. Facsimile of the Alexandrian Codex in the British Museum.
4. A portion of a Ninth Century Manuscript.
5. Beginning of 29th Psalm on Papyrus in the British Museum.

ان طوماروں کی دستیابی کا زمانہ نہایت پرآشوب تھا۔ برطانوی گورنمنٹ نے ارضِ مقدس کو عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کرکے ملک سے ہاتھ دھولئے اور اعلان کردیا کہ ہم ۱۴ مئی کے روز تمام کنعان کو خالی کردیں گے۔ ارض مقدس کی سرزمین اُردن حکومت اور اسرائیلی حکومت کی باہمی خونریزیوں اور جنگوں کی وجہ سے لالہ زار ہوگئی۔ تمام ملک کے طُول وعرض میں امن کا دور اور نظم ونسق کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ دونوں نئے ممالک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ برطانیہ نے ارضِ مقدس کا انتظام کسی کے ہاتھ میں نہ چھوڑا تھا۔ یہود ہرطرف سے سات عرب ممالک سے گھرے ہوئے تھے جوان کے دشمنِ جان تھے۔ یہ ممالک یہود کو تباہ کرنے اور کنعان سے نکال کر دم لینے پر تلے ہوئے تھے۔ انگریزی فوج کا برگیڈئر گلب Glubb عرب ممالک کے لشکروں کا کمانڈر تھا۔ اس نے شہر یروشلیم کے یہودی حصہ پر گولہ باری کردی جس کے نزدیک میٹروپالیٹن کی خانقاہ مقدس مرقس تھی جس کو عرب اوریہود افواج کی گولہ باری سے سخت نقصان پہنچا۔ پس بیچارہ میٹروپولیٹن وہاں سے مجبوراً نکل گیا اور چندے ملکِ شام میں رہ کر امریکہ چلاگیا اور اپنے ساتھ وہ طومار بھی لے گیا۔ ۱۹۴۹ء میں جنوری کے آخر میں امریکہ پہنچ گیا۔ اگر میٹروپولیٹن ان طوماروں کو امریکہ نہ لے جاتا تو یہ طومار تباہ وبرباد ہوجاتے کیونکہ ان ایام میں نہ کوئی حکومت تھی اور نہ کہیں قانون کا راج تھا۔

یہ طومار اس علاقہ سے دستیاب ہوئے جہاں پہلی صدی مسیح سے قبل یہود قمران بستے تھے۔ پس ان طوماروں کو بعض اوقات " قمران کے طورما" کہتے ہیں۔ جب میٹروپولیٹن نے یہ طومار امریکہ میں فروخت کئے اور مسیحی فضُلا نے ان کا مطالعہ کیا اور اخباروں میں مضامین لکھے تو ادبی اور مذہبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا کیونکہ طوُمار عہدِ عتیق کی کُتبِ مقدسہ کے قدیم ترین عبرانی نسخے تھے جو سیدنا مسیح سے صدیوں پہلے لکھے گئے تھے۔ جب اخباری دنیا میں ان قدیم ترین عبرانی نسخوں کی دھوم مچی تو حکومت اُردن بھی جاگ اٹھی اور بدوی عرب ان کی قدروقیمت سے واقف ہوگئے۔ قبیلہ کے افراد نے نجی متعدد مقامات سے انہوں نے اور نسخے برآمد کرلئے۔ انہوں نے متعدد نسخوں کو فروخت کردیا اور ہر نسخہ اور پارہ کے لئے ایک پونڈ فی مربع سینٹی میٹر[1] کے حساب سے زرِ کثیر حاصل کرلیا۔ حکومت اُردن نے ان بدوی مثلاً خربت[2] قمران، مربعات، خربت مرد وغیرہ سے بھی طومار حاصل کئے۔ بدویوں نے طمع زر کی خاطر بعض طوماروں کو پارہ پارہ کردیا اور جو پارے دستیاب ہوئے تھے ان کے بھی کاٹ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کردئیے تاکہ زیادہ رقم وصول کرسکیں حتیٰ کہ بعض ٹکڑے ناخنوں کے برابر کردئیے۔ علما نے نہایت دیدہ ریزی سے ان ٹکڑوں کو جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور پاروں کو بہزار دقت جوڑ کر یک جا کیا اور بھی ہزاروں ٹکڑے باہمد گر پیوست کرنے کو پڑے ہیں اور ہزاروں ایسے ہیں جو چھاننی سے چھان چھان کر یک جا کئے جارہے ہیں تاکہ بعد میں پیوست کئے جائیں۔ کھدائیوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ قمران کے فرقہ یہود نے ایک کُتب خانہ جمع کررکھا تھا جس میں پانچ سو سے زائد کتابیں محفوظ تھیں۔ ان پانچ سو طوماروں میں ایک سو طومار کتبِ عہد عتیق کے نسخے ہیں۔ ان ایک سو طوماروں میں کُتبِ عہد عتیق کی تمام کتابیں (بااستثنائے آستر) موجود ہیں اور بعض کُتب کے ایک سے زائد نسخے ہیں۔ ان کُتبِ مقدسہ کے علاوہ اس کُتب خانہ میں ترجمہ سبیعنیہ کے نسخے اور کتب " تراجم " (جن کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے) کے نسخے بھی ملے ہیں۔ ایک ارامی زبان کا " ترجم " بھی دستیاب ہوا ہے۔ ان تمام طوماروں میں اہم ترین نسخے وہ ہیں جو ۱۹۴۷ء میں وادی قمران کے قرب وجوار کے گیار غاروں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں کتاب استثنا کا ایک نسخہ ملا جو سیدنا مسیح سے تین صدیاں پیشتر لکھا گیا تھا اور دوہزار تین سو سال کا ہے۔ ایک اور طومار میں

---

[1] ایک انچ = ۲، ۵۴ سینٹی میٹروں کے برابر ہوتا ہے۔ اس حساب سے ایک سینٹی میٹر = ۳۹۳ . ۰ حصہ ایک انچ کا ہوتا ہے یعنی ایک انچ کا ۱ / ۵۴، ۲ حصہ، اب ناظرین اس زرِ خطیر کا خود اندازہ کرسکتے ہیں جو حکومت یردن اور امریکی فضلا نے ان طوماروں پر خرچ کیا۔ (برکت اللہ)

[2] خربت بمعنی کھنڈرات۔

مزامیر ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۴۵و۱۴۸ لکھے ملے۔ ایک نسخہ میں ایوب کی کتاب کا" ترجم" نقل کیا ہوا ہے۔ قمران کے طوماروں میں بھی بعض ارامی زبان کے نسخے تھے۔ بعض تفاسیر تھیں اور متعدد پارے اور نسخے ایسے تھے جو دورِ حاضرہ کے عبرانی نسخوں سے ایک ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ قدیم زمانہ کے ہیں۔

قمران کے پہلے غار سے سات طومار برآمد ہوئے ہیں جن میں یسعیاہ کی کتاب کے دو نسخے ہیں۔ یہ نسخے نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ ایک نسخہ میں یسعیاہ کی کتاب مکمل لکھی ہے اور دوسرے میں اسکا تیسرا حصہ محفوظ ہے۔ علماء ان دونوں نسخوں کے متن کا مروجہ عبرانی میں متن سے مقابلہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ تینوں متن حیران کُن طور پر متفق اللفظ ہیں۔ ان میں اگر کوئی فرق ہے تو قرات کا ہے کتابت کا نہیں۔ ان دونسخوں سے ہم کو اس صحیح تلفظ کا بھی پتہ لگ جاتا ہے جو سیدنا مسیح سے صدیوں پیشتر مروج تھا۔ دونوں نسخوں میں سہو کاتب بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ایک نسخہ میں الفاظ" خداوند کے پہاڑ" (۲: ۳) میں نہیں ہیں (۶: ۳) میں لفظ" قدوس" دوبار لکھا ہے (۷: ۲) میں الفاظ " اس کے دل " نہیں پائے جاتے۔ لیکن دوسرے طومار میں تو اس قسم کے خفیف سہو بھی نہیں پائے جاتے۔ حتیٰ کہ الفاظ کے ہجا اور حروف کے اعراب تک میں کہیں فرق نہیں ملتا۔

سموئیل کی کتاب کے بھی دو طومار ہیں جن میں سے ایک طومار دوسرے سے زیادہ قدیم نسخہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ نسخہ قمران کے ان تمام نسخوں سے زیادہ قدیم ہے۔ جواب تک دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ نسخہ سیدنا مسیح سے تین صدیاں قبل کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرینک کراس نے ان دونوں طوماروں کا اور مروجہ عبرانی متن کا غائر مطالعہ کیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ان میں وہی عبرانی متن موجود ہے جو سیپٹواجینٹ کے ترجمہ کے مترجمین کے سامنے تھا اور کہ یہ تینوں متن ایک دوسرے کے موافق ہیں [1]۔

پادری سیکھن [2] کتابِ استثنا اور زبور کے طوماروں کا مروجہ عبرانی متن سے مقابلہ کرکے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ان نسخوں کے مروجہ عبرانی سے جو اختلافات ہیں وہ نہایت خفیف ہیں جو زیادہ تر سہو کتابت ہیں۔

ان طوماروں نے آفتابِ عالم تاب کی طرح کُتبِ عہدِ عتیق کے متن کی صحت کو عالم وعالمیان پر روشن کردیا ہے۔ اور یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ ان عبرانی کُتب مقُدسہ کے الفاظ اور حروف بعینہ انہی اعراب کے ساتھ لکھے جاتے رہے ہیں جو مروجہ عبرانی کُتبِ مقدسہ کے ہیں۔

وادی قمران میں دس ایسے غار تھے جن میں مندرجہ بالا اور دیگر خزانے دفون تھے۔ کتابوں کا سب سے بڑا ذخریہ غار نمبر ۴ میں تھا جہاں سے نسخے اور ہزارہا پارے اور ٹکڑے برآمد ہوئے جو قریباً تین سو تیس کتابوں کے پارے تھے۔ قمران کے طوماروں کے مطالعہ نے یہ بھی ظاہر کردیا ہے کہ سامری نسخہ (جس کا ہم ذکر چکے ہیں) کا متن پانچویں صدی قبل از مسیح کا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یہودیوں اورسامریوں میں جدائی کی خلیج واقع ہوچکی تھی۔ دوسری صدی مسیحی کے بعد توراتِ سامری کے متن میں کسی قسم کی تبدیلی کا ہونا غیر ممکن ہوگیا تھا۔

قمران کے کتابِ گنتی کے طوُمار کامتن وہی ہے جوسامری نسخہ گنتی کا ہے۔ اور سیپٹواجنٹ کے اس عبرانی متن کے موافق ہے جو مترجمین کے سامنے تھا۔ دانی ایل کی

---

[1] F.M Cross. The ancient library of Qumran and Modern Biblical studies (London 1958)

[2] Patrick Skehan.

کتاب کے طومار کا متن بھی مروجہ عبرانی متن کے مطابق ہے۔ اور جہاں کوئی خفیف اختلاف پائے جاتے ہیں وہ سیپٹواجنٹ اور تھیوڈوشن ترجموں کے عبرانی اصل کے مطابق ہیں۔

وادی مربعات سے بنی تعمیرہ کے بدوؤں نے ۱۹۵۲ء میں ایسے نسخے کھود نکالے جو عبرانی اور یونانی زبانوں میں لکھے تھے محکمہ آثار قدیمہ نے ان بدوؤں کی امداد حاصل کرکے چار غار ایسے دریافت کئے جن میں سات آٹھ صدی قبل مسیح کے نسخے مدفون تھے ۔ بعض نسخے رومی سلطنت کے زمانہ کے تھے جو دوسری صدی قبل از مسیح کے تھے اور چمڑے پر لکھے تھے۔ ان میں سے چار طوماروں کے پاروں پر کتابِ پیدائش ایک پارہ، کتابِ خروج دو پاروں پر اور کتاب استثنا ایک پارہ پر لکھی تھیں۔ ان پاروں پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے پتہ چل جاتا ہے۔ کہ رومی افواج کے سپاہیوں نے فتح کے بعد ان کتابوں کو پھاڑ ڈالا تھا۔ ان پاروں میں سے ایک پر یسعیاہ نبی کے صحیفہ کی ۴: ۱ تا ۱۴ لکھی تھیں۔ ایک پر عبرانی بائبل کے چار مقامات (خروج ۱۳: ۱ تا ۱۰ - ۱۳: ۱۱ تا ۱۶۔ اور استثنا ۶: ۴ تا ۹ - ۱۱: ۱۳ تا ۲۱) کی آیات کے متن متوازی قطاروں میں لکھے ہیں ۔ اس کو ایک چمڑے کے تعویذ میں ڈال کر بحکم استثنا ۶: ۶ تا ۸، ماتھے پر اور بائیں بازو پر باندھا جاتا تھا۔ قمران کے غاروں سے بھی اسی قسم کے تعویذ پائے گئے ہیں جن پر مذکورہ بالاآیات کے علاوہ دس احکامِ تورات بھی لکھے تھے۔

وادی مربعات قمران سے بارہ میل جنوب کی طرف اور یروشلیم سے قریباً ۱۵ میل جنوب مشرق کی جانب واقع ہے۔ وادی قمران سے قریباً پونے میل کے فاصلہ پر بحر مراد کے مغرب کی جانب ایک جگہ ہے جس کو خربت قمران کہتے ہیں ۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت یشوع کے زمانہ میں شہر نمک بستا تھا۔ (یشوع ۱۵: ۶۱) اب خراب وویران ہوجانے کی وجہ سے خربت (بمعنی اجاڑ) کھلاتا ہے۔

دیگر نسخے

یہ نسخے اہلِ یہود نے نقل نہیں کئے تھے بلکہ مسیحی کلیساؤں کے علماُ نے نقل کئے تھے۔ کیونکہ ۱۳۵ء میں رومی افواج نے قمران کے یہود اوران کی بستیوں کو ویران برباد کردیا تھا۔ مشہور انگریز عالم بروس ہم کو بتلاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی ان وادیوں کے غاروں سے نسخے برآمد ہوئے تھے چنانچہ وہ لکھتا ہے[1] کہ ۲۱۷ء کے قریب اس مقام کی بعض کتابیں مسیحی عالم اوریجن کے ہاتھ آئیں جو عبرانی اور یونانی زبانوں میں لکھی تھیں۔ ان قدیم نسخوں میں کتاب زبور کا ایک ترجمہ یونانی زبان میں تھا جو سیپٹواجنٹ کی نقل نہ تھا۔ یہ نسخہ اس کو "یریحو کے قریب ایک مرتبان" میں ملا تھا۔ اوریجن نے اس ترجمہ کو اپنی کتاب ہیکسپلامیں شامل کرلیا تھا۔

ہال Halle یونیورسٹی کے پروفیسر آؤٹوآئسفلیٹ Outo Eissfeldt نے اپنے مضامین میں مغرب کے فضُلا کی توجہ اس واقعہ کی جانب منعطف کی ہے جس کا تعلق سلوکیہ کے پیٹر مارک ٹموتھیوس سے ہے جو نسطوری کلیسیا کا ایک زبردست عالم تھا اور ۷۸۰ء سے ۸۲۳ء تک خلیفہ مہدی ، ہادی اور ہارون کے عہدِ خلافت میں زندہ تھا۔ خلیفہ مہدی (سبیسا کہ ہم اپنی کتاب " قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسیائیں " کے حصہ اول کے باب ششم میں ذکر کرچکے ہیں) اس عالم پیٹر پارک سے بحث ومباحثہ بھی کیا کرتا تھا۔ اس پیٹر پارک نے اپنے عہدِ حکومت میں کلیسیائے ہند میں فرقہ بندی کا بھی خاتمہ کردیا تھا۔ (دیکھو "صلیب کے ہراول" از برکت اللہ باب چہارم) خیر آمدم بر سر مطلب ، مذکورہ بالا جرمن فاضل آوٹو ہم کو بتلاتا ہے کہ اس پیٹر یارک کو معلوم ہوا، کہ ۸۰۰ء کے قریب بحر مردار کے مضافات میں چند قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں ۔جو کسی غار سے ملے ہیں جن پر عہد عتیق کی کُتب لکھی تھیں اوران کے علاوہ دیگر کتابیں بھی ملی ہیں۔ پس اس پیٹر یارک نے

[1] F.F. Bruce, Second thoughts on the dead sea scrolls (1956)

ایلم کے میٹروپولیٹن سر جنیس Sergius کو لکھا " ہم کو معتبر یہود سے جو مسیحیت کی تعلیم حاصل کررہے ہیں یہ معلوم ہوا ہے کہ دس سال کا عرصہ گذرا چند کتابیں یریحو کے نزدیک ایک غار سے دستیاب ہوئی ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک عرب ان اطراف میں شکار کررہا تھا کہ اس کا کتاب شکار کے پیچھے ایک غار میں گھس گیا جہاں سے وہ واپس نہ آیا۔ کتے کا مالک غار میں اترا تو کیا دیکھتا ہے کہ غار میں بہت سی کتابیں ہیں۔ شکاری نے یروشلیم میں جا کر یہود کو اس واقعہ کی خبر دی۔ یہود فضُلاء غار کے اندر گئے تو دیکھا کہ کُتب عہد عتیق کی کتابوں کے نسخے اور دیگر کتابیں وہاں پڑی ہیں جو عبرانی میں لکھی ہیں۔" آگے چل کر پیٹر یارک لکھتا ہے کہ یہودی خبر دینے والے نےکہا کہ " ان میں ایک زبردست فاضل بھی تھا جو یہودی کُتب مقدسہ کا عالم اور یہودی علم وادب کا فاضل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا عہد عتیق کی کُتب کے وہ تمام مقامات جن کا ذکر انجیل میں ہے یا جن کا انجیل میں اقتباس کیا گیا ہے فی الواقع ان کتابوں میں موجود ہیں۔ اس نے مجھے یہ جواب دیا کہ وہ تمام مقامات کُتبِ عہد عتیق میں موجود ہیں اور ان نسخوں میں بھی پائے جاتے ہیں جو اب ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔" پھر پیٹر یارک اپنے میٹروپولیٹن کو اپنے اس خط کے آخر میں لکھتا ہے ۔"ہم نے اس یہودی کے بیان کی صحت معلوم کرنے کے لئے دوسرے یہودیوں سے اس کی غیر حاضری میں اس بات کی پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے بھی اس کے بیان کی تصدیق کی ۔ پس ہم نے وہاں کے چند اصحاب کو لکھا کہ تم خود جا کر ان نسخوں کا ملاحظہ کرو لیکن تادم تحریر ان کی جانب سے ہم کو کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ یہاں ہمارے پاس کوئی ایسا قابل اور معتبر شخص بھی ہے جس کو ہم حقیقتِ حال دریافت کرنے کے لئے بھیج سکیں۔" یہ خط نویں صدی کے اوائل میں لکھا گیا تھا۔

آٹھویں صدی مسیحی میں شہر بغداد میں اہلِ یہود کے بد عتی فرقہ کا آغاز ہوا جو تلمود کو رد کرتا تھا۔ یہ فرقہ کریت کہلاتا ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم کو صرف موسیٰ کی کُتبِ شریعت اور صحائف انبیاء پر اعتقاد رکھنا چاہیے اور بزرگوں کی روایات کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ یہ فرقہ صدیوں تک جاری رہا لیکن ہٹلر Hitler نے دوسری عالمگیر جنگ میں اس کی بیخکنی کردی۔ اس فرقہ کا ایک یہودی عالم قرقصانی Qirqisani بھی پیٹر یارک ٹموتھیس کے نسخوں کا ذکر کرتا ہے اور یہودی فرقہ قمران کا ذکر داؤد ابنِ مردان کی سند سے کرکے کہتا ہے کہ یہ لوگ غاروں میں بدوباش کرتے تھے اور ائریس سے چار صدیاں قبل کے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ نیکایاہ کی کونسل نے ائیریس کو ۳۲۵ء میں بدعتی قرار دے کر مسیحی کلیسیا سے خارج کردیا تھا۔ مذکورہ بالا یہودی مصنف قمران کے یہودی فرقہ کو" مفاریہ " نام سے موسوم کرتا ہے۔ مسلمان مورخ البیرونی (تاریخ وفات ۱۰۴۸ء) اور شہرستانی (تاریخ وفات ۱۱۵۳ء) بھی اپنی تصانیف میں اس فرقہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان دونوں موخر الذکر مصنفوں کا ماخذ ایک کتاب "تاریخ المذاہب " تھی جو نویں صدی مسیحی میں لکھی گئی تھی، لیکن اب وہ صفحہ ہستی سے ناپید ہوگئی ہے۔

یہودِ قمران اور کُتبِ مقدسہ کی حفاظت

ہم نے یہودِ قمران کے فرقہ کا حال کسی قدر تفصیل اور طوالت کے ساتھ کیا ہے تاکہ ناظرین پران کے پس منظر اور تاریخ کے اوراق سے اہلِ قمران کی کُتبِ مقدسہ سے شیفتگی اور وابستگی سے واقف ہوجائیں اور خود معلوم کرسکیں کہ ان حالات میں تحریف کُتبِ مقدسہ کا نظریہ کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اس گروہ کی لائبریری میں جیسا کہ ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں پانچ سو طومار تھے جن میں سے اکثر طومار یا تو کُتبِ مقدسہ کی نقلیں تھیں اور یا ان کی تفسیریں تھیں۔ چنانچہ جیسا ہم بیان کرچکے ہیں کہ اس کُتب خانہ میں سوائے آستر کی کتاب کے باقی تمام کُتبِ مُقدسہ کی نقلیں ملی ہیں اور تفاسیر میں سے چند مزامیر کی تفسیریں اور ناحوم اور حبقوق کی کتابوں کی تفسیریں تاحال دستیاب ہوئی ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ کُتبِ مُقدسہ کے عاشق زار تھے اور ۱۱۹ زبور لکھنے والے کی طرح کلام اللہ اور شریعت کے قوانین کے دالدہ تھے۔ ان کی زندگی کا واحد نصب العین ہی یہ تھا کہ وہ اپنی انفرادی اور قومی زندگی خدا

کے احکام کے مطابق بسر کریں جو کتاب اللہ میں موجود ہیں۔ پس مکابیوں کے زمانہ اور سیدنا مسیح کے زمانہ کے درمیانی عرصہ میں کُتبِ مُقدسہ کا محرف ہونا محالات میں سے ہے۔ بحرِ مُردار کے کناروں کے ان طوماروں سے صاف ثابت ہوجاتا ہے کہ ان کے لکھے جانے سے مدتوں پہلے کُتبِ مقُدسہ کا معیاری متن قائم ہوچکا تھا اوران تمام طوماروں کا وہی معیاری متن ہے جو دورِ حاضرہ میں ہرجگہ مروج ہے۔

دریافتوں کے نتائج

(۱۔) ان طوماروں کے دستیابی کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمارے ہاتھوں میں قدیم ترین نسخے موجود ہوگئے ہیں جو اصل عبرانی میں سیدنا مسیح سے صدیوں پہلے لکھے گئے تھے۔ ان سے پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سامری نسخہ تورات قدیم ترین ہے لیکن اب ہمارے پاس نہ صرف تورات شریف کے بلکہ باستثنائے آستر تمام کُتبِ مُقدسہ کے قدیم ترین نسخے موجود ہیں جن میں وہ متن محفوظ ہے جو سیدنا مسیح سے صدیوں پہلے مروج تھا۔

(۲۔)اب سے بیس سال پہلے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مروجہ عبرانی متن کی صحت کو معلوم کرنے کے لئے ہم صرف ترجمہ سبعینہ کی جانب ہی رجوع کرسکتے ہیں اور یہ سوچ کر کہ اس ترجمہ کا اصل کیاہوگا اس مفروضہ اصل سے مروجہ عبرانی متن کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کار کوئی یقینی طریقہ نہ تھا۔ لیکن اب ہمارے ہاتھوں میں ترجمہ سبعینیہ سے بھی قدیم نسخے اصل عبرانی زبان میں موجود ہیں۔ ان کے وجود کا کسی عالم کو خواب وخیال بھی نہ تھا۔ سب فضُلا یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ اب اصل عبرانی کے قدیم نسخے روئے زمین پر سے مفقود ہوگئے ہیں۔ چنانچہ سر فریڈرک کینین[1] جیسے زبردست عالم اور نقاد نے ۱۹۳۹ء میں لکھا تھا کہ " اب یہ اغلب نہیں کہ ہم کو کسی زمانہ مستقبل میں ایسے عبرانی نسخے دستیاب ہوں جو ان نسخوں سے زیادہ قدیم ہوں کی بناء پر مسوراہی متن نے قیام حاصل کیا ہے۔" لیکن موجودہ دریافتوں نے اس کی پیشین گوئی کو غلط ثابت کردیا ہے۔اب وادی قمران کے عبرانی نسخے کُتبِ عہد عتیق کے صحیح ترین متن کو معلوم کرنے کےقدیم ترین ذرائع ہیں۔ کیونکہ ان عبرانی نسخوں کا متن سیدنا مسیح سے کم ازکم صدیاں پہلے کا ہے لیکن مسوراہی متن کے نسخے متن کے نسخے سیدنا مسیح سے نو اور دس صدیاں بعد کے ہیں اور دونوں قسم کے نسخوں کے درمیان کم ازکم بارہ صدیاں کا فاصلہ ہے۔ اب ان قدیم طوماروں نے بارہ صدیاں کا فاصلہ حرفِ غلط کی طرح مٹا کر محود کردیا ہے۔

(۳۔) ان قدیم ترین نسخوں کے غائر مطالعہ نے ثابت کردیا ہے کہ ان کا متن وہی ہے جوماسوارہی متن ہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ قمران کے نسخے ثابت کردیتے ہیں کہ اب ہمارے ہاتھوں میں انبیاء کے صحائف اور تورات کے وہ اصل الفاظ موجود ہیں جو انبیاء اللہ نے اپنی زبان سے نکالے تھے۔ ان کے ذریعہ ہم خدا کی آواز سن کر اپنی انفرادی ، ملی اور قومی زندگیوں کو سدھارسکتے ہیں۔ جوں جوں نئے نسخے دریافت ہوتے جاتے ہیں ۔ کتبِ عہد عتیق کے عبرانی متن کی تصدیق ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ ابھی دوران تحریر میں بحرِ مُردار کے مغربی کناروں کی طرف کھدائی کی گئی ہے۔ وہاں دو طوماروں کے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک پارے پر خروج ۱۳: ۱، ۱۶ آیات اور دوسرے پارے پر زبور ۱۵ کی سات سطریں لکھی ہیں۔ ان دونوں پاروں کا متن مروجہ عبرانی متن سے لفظ بلفظ متفق ہے۔

(۴۔) ان طوماروں کے وجود نے بعض عُلما کا یہ خیال غلط ثابت کردیا ہے کہ جلاوطنی کے زمانہ کے بعد ارضِ مقدس کے یہودی حلقوں میں عبرانی زبان قطعی مروج نہ تھی اور عبرانی زبان سیدنا مسیح کی بعثت سے پہلے بالکل مردہ ہوچکی تھی۔

---

[1] Sir Frederick Kenyon

(۵-) قمران کے طوماروں نے سامری نسخہ کے متن کی عظمت کو از سرِ نو بحال کردیا ہے اور ثابت کردیا ہے کہ سامریوں نے بھی اپنی تورات کے نسخہ میں تحریف کرنے کا کبھی ارتکاب نہیں کیا۔

(۶-) قدیم نسخوں کے متن میں اور مروجہ عبرانی متن میں جو خفیف اختلافات ہیں ان کو کسی قسم کی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ان کے وجود کی بناء پر کوئی نقاد یاعالم یہ نہیں کہہ سکتا کہ دونوں میں سے کونسا متن زیادہ بہتر[1] ہے۔

فصل سوم

اہلِ یہود کی پارٹیاں اور مسئلہ تحریف

ہم فصلِ دوم میں بتلاچکے ہیں کہ مکابیوں کے زمانہ میں مختلف حالات کی وجہ سے اہلِ یہود میں دھڑے بازیاں شروع ہوگئیں اور یہ مخاصمت اس قدر بڑھ گئی کہ آپس میں ان کی سر دھڑکی بازی لگ گئی ۔ قومِ یہود مختلف گروہوں ، پارٹیوں اور جماعتوں میں تقسیم ہوگئی ۔ سیدنا مسیح سے ایک صدی قبل اہلِ یہود میں خانہ جنگی کے باعث ارضِ مقدس کنعان خون سے سرخ ہوگئی ۔یہودی قوم فریسیوں اور صدوقیوں میں بٹ گئی جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان کی مخاصمت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ فریقین کا کسی بات پر بھی متفق ہونا ایک ناممکن الوقوع امر ہوگیا تھا ۔ لیکن ان میں سے کسی فریق نے دوسرے پر باوجود حد درجہ کے عناد، بغض اور عداوت کے کُتبِ مقُدسہ کو محرف کرنے کا الزام نہ لگایا حالانکہ ان دونوں فریقوں کے عقائد میں سخت اختلاف تھا(مرقس ۱۲: ۱۸، متی ۲۲: ۲۳۔ لوقا ۲۰: ۳۷ اور اعمال ۲۳: ۸ وغیرہ)۔ اگر ان کے دلوں میں کُتبِ مقدسہ کی واجبی عزت وتکریم نہ ہوتی تووہ کتاب مقُدس کو اپنے اعتقادات کے مطابق محرف کرسکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا ہر گز نہ کیا۔ فریقین میں سے کسی نے بھی دوسرے پر تحریف کا الزام نہ لگایا۔ اس کے برعکس دونوں کی کتاب مقدس ایک ہی تھی۔ ان دونو کی مثال ایسی ہے جس طرح جماعت شیعہ اور فرقہ اہلِ سنت کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شیعہ اہل سنت پر تحریف قرآن کا الزام لگاتے ہیں اور رکھتے کہ صحیفہ عثمانی سے وہ تمام آیات خارج کردی گئی ہیں جو اہلِ بیت کے فضائل اور خلفائے راشدین کے خلاف تھیں۔ چنانچہ سید امجد حسین رسالہ تحریف القرآن و تصحیف الفرقان میں لکھتے ہیں ۔" سنی اور شیعہ میں مدُت سے نقص وتحریفِ قرآن کی چھیڑ چھاڑ شعارِ خاص ہوگیاہے۔ اہلِ سنت والجماعت اس کو بدنامی خلفائے ثلاثہ سمجھ کر برافروختہ ہوجاتے ہیں------ قرآن کا یہ حیثیتِ نظم وترتیب ناقص ہونا تو بدیہات سے ہے---- خود قرآن اور فریقین کی کتبِ معتبرہ قرآن کے محرف ہونے کی گواہ ہے۔ علمائے شیعہ اس واسطے انکار کرتے ہیں کہ ان میں تقیہ جائز ہے اور علمائے اہلِ سنت کا انکار حفظ دین وملت خلفائے ثلاثہ کی وجہ سے ہے ۔"(صفحہ ۲۔ نیز دیکھو مرزا احمد سلطان کا رسالہ تصحیفِ کاتبین ونقصِ آیات کتابِ مبین وغیرہ)۔

لیکن یہودی قوم کی تمام تاریخ میں ایسا الزام کہیں بھی نہیں ملتا باوجودیکہ فریسی اور صدوقی اور دوسرے یہودی فرقے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اور انہوں نے سرزمین کنعان کو ایک دوسرے کے خون سے رنگین کردیا تھا۔ تاہم وہ ہمیشہ کتابِ مقدس پر متفق ہی رہے اور دونو اس کی حفاظت میں کوشاں اوراس کی صحت کے قائل رہے۔ کیا یہ امر ثابت نہیں کرتا کہ عبرانی کُتبِ مقدسہ میں کسی قسم کا فتور واقع نہیں ہوا اور کہ وہ درحقیقت اب بھی ویسی ہی قابلِ اعتبار ہیں جیسی وہ انبیاء کے زمانہ میں تھیں۔

[1] Allegro, The dead scrolls p.73

فصلِ چہارم

اہلِ یہود کے مختلف مسالک اَور مَدرسے

سیدنا مسیح کی طفولیت کے زمانہ میں ربی حلیل اور شمعی کے مدرسے اور مسالک قائم تھے۔ان مدرستوں میں یہ دو نو حریف ربی کُتبِ مقُدسہ کو پڑھاتے اوران کی تفاسیر کرتے تھے۔ ربی شمعی کا مسلک نہایت قدامت پسند تھا۔ وہ شریعت کے ہر لفظ کی گویا پرستش کرتا تھا اور اس کے پیرو حددرجہ کے مقلد تھے۔ ان کے ہاں کُتبِ مُقدسہ کی تفسیر وتاویل میں تفسیر بالرائے کو ہر گز دخل نہ تھا۔ لیکن ربی حلیل کا مذہب زیادہ آزاد روتھا۔ ہر صاحبِ فکرودانش پر ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کُتبِ مقدسہ میں کسی قسم کا فتورواقع ہونا ایک موہوم امر ہے۔ فتو توالگ رہا کُتبِ مُقدسہ میں کسی قسم کا تغیر وتبدل ایک ناممکن بات تھی۔ کیونکہ اگر کسی قسم کا تغیر وتبدل واقع ہونے کا احتمال بھی ہوتا تو یہ حریف ربی ایک دوسرے پر فوراً تحریف کا الزام لگادیتے اور یوں تحریف کا راز طشت ازبام ہوجاتا ۔ لیکن ان حریف ربیوں نے ایک دوسرے پر کبھی تغیرو تبدل اور تحریف وفتور کا الزام نہ لگایا۔

اس کی مثال دَورِ حاضرہ کے مذہبی رسائل سے مل سکتی ہے۔ مثلاً اہل حدیث امر تسر بابت ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء صفحہ ۷ پر لکھا ہے ۔" شبلی مرحوم نے بھی حمایت مذہب نعمانی میں اسی طرح ایک وقت قرآن کی آیت میں ی ومن باللہ فلیعمل صالحاً اپنی طرف سے بنائی تھی"۔ پھر اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ " اخبار اہلِ حدیث مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء صفحہ ۵ عنوان " تحقیق الکلام" کے ذیل میں مولوی نور الہیٰ صاحب گھر جاکھی، مولوی عبدالجبار صاحب نعمانی نامہ نگار العدل کا تعاقب فرماتے ہوئے اعلان کرتےہیں کہ " نعمانی صاحب پیش کردہ آیت قرآنی کو قرآن سے ثابت کرکے پانچ سو روپیہ انعام حاصل کریں ۔" اسی طرح اہل حدیث بابت ۳۰ نومبر صفحہ ۴، ۵ میں ہے کہ مولوی حکیم عبیداللہ صاحب بسمل احمدی کی خیانت ملاحظہ کیجئے ۔آپ نے (جلال الدین سیوطی کی تفسیر درمنثور کی)عبارت یوں لکھی ہے۔فانا کنا نحدث ان ابن مریمہ خارج فان خرج فقد کان بعدہ ۔ لفظ قبلہ (جوبعد سے پہلے تفسیر میں لکھا تھا)آپ نے نقل نہ کیا۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ مسئلہ حیاتِ مسیح علیہ السلام ثابت ہوکر مرزا صاحب قادیانی کے دعوئے مسیحیت ونبوت پر پانی نہ پھر جائے۔"

فرقہ اہلِ حدیث کا مشہور مناظر بابو حبیب اللہ آنجہانی مرزائے قادیانی کی کُتب کی پیش کردہ قرآنی آیات کی چھان بین کرکے اس نتیجہ پر پہنچا ہے ، کہ " مرزاصاحب نے تقریباً چار درجن آیات اپنی کتابوں میں غلط لکھی ہیں ---اگر کوئی مرزائی مولوی یہ کہے کہ سہو کاتب ہوگیاہے توعرض ہے کہ ایک آیت مرزاصاحب نے پانچ یا چھ جگہ لکھی ہے اور سب جگہ غلط لکھی ہے۔ مرزا صاحب نے خود ترجمہ کیا ہے پس سہوِ کاتب کا بہانہ غلط ہے۔" (مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی قرآن دانی صفحہ ۱ ۔)

اس قسم کے الزامات یہودی حریف پارٹیوں نے ایک دوسرے پر کبھی نہ لگائے۔ اہل یہود کا دامن عبرانی کُتبِ مقدسہ کی تحریف کے الزام سے بالکل پاک رہا ہے۔ اس باب میں ان کی تمام پارٹیوں کی خاموشی نہایت معنی خیز ہے۔ مثل مشہور ہے کہ

ع "خموشی معنی دارد کہ در گفتن نے آید"

پس ثابت ہوگیا کہ یہودی کُتبِ مقُدسہ میں اس زمانہ میں کبھی قسم کا تغیر وتبدل یا فتور پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کے برعکس اہلِ یہود کی تاریخ کے ہر زمانہ میں کُتبِ مقُدسہ درحقیقت اسی حالت میں تھیں جس طرح انبیاء اللہ نے چھوڑدی تھیں۔

فصلِ پنجم

حضرت کلمتہ اللہ کی تصدیق

ہم ذکر کرچکے ہیں کہ سیدنا مسیح نے عبرانی کُتُبِ مقدسہ کے اقتباسات کئے اور یوں اِن کُتُبِ سماوی کی صحت پر اپنی تصدیق کی مہر لگائی ۔ جیسا قرآن میں بھی وارد ہوا ہے کہ " مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا ، کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں۔ مجھ سے آگے جو توریت ہے میں اس کا مُصدق ہوں" (صف ٦) منجئی عالمین نے انجیلِ جلیل میں بھی فرمایا ہے کہ " یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں ، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں ۔"(متی ۵: ۱۷)۔

جب کبھی حضرت کلمتہ اللہ شریعت اور انبیائے سلف کے صحائف کا ذکر اپنی زبانِ مبارک پر لاتے آپ فرماتے " الکتاب" ، کتابِ مقدس " ، "شریعت " ، انبیاء" ، شریعت اور انبیاء"یا صرف فرماتے " لکھاہے ۔" آپ صحفِ مُقدسہ کی سند کی تصدیق فرماتے ۔ بعض اوقات آپ اِن صحفِ سماوی کے الفاظ کو اپنی زبان مبارک پر لاتے(یوحنا ۸: ۱۷ ، متی ۱۹ : ۵- ۲۲: ۳۷ تا ۳۹ وغیرہ)۔ بعض اوقات آپ ان کا مطلب واضح فرماتے(متی ۱۰ : ۱۱ لوقا ۷: ۲۷)دیگر اوقات آپ ان صحفِ مُقدسہ کے مقامات کی تاویل کرتے (یسعیاہ ۲۹: ۱۳ ، متی ۱۵: ۹، یسعیاہ ٦: ۹، متی ۱۳: ۱۴ - ۱٦ ، ہوسیع ٦: ٦ ، متی ۹: ۱۳ وغیرہ)"پہاڑی وعظ " میں ابن اللہ تورات مقدس کی جانب اشارہ کرکے اہلِ یہود کو مخاطب کرکے بار بار فرماتے ہیں۔" تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا۔"یا کہا گیا ہے۔" آپ اہلِ یہود ے علماء سے مختلف اوقات پر سبت کے احکام کے متعلق بار بار بحث میں الجھے اور ہر موقعہ پر آپ نے کُتُبِ مقدسہ کا حوالہ دے کر ان احکام کا صحیح مفہوم اس طور پر بتلایا کہ مخالفین کو بجز خاموشی کوئی چارہ نہ رہا،(یوحنا ۷: ۲۳ ، مرقس ۲: ۲۷، ۱سموئیل ۲۱: ۳ تا ٦ وغیرہ) علی ہذا القیاس آپ نے نکاح ، طلاق ،مُردوں کی قیامت وغیرہ مسائل پر بحث کرتے وقت صحف مقدسہ کی آیات کی سند پیش کرکے مخالفین کا منہ بند کرتے رہے۔ آپ مختلف اوقات پر کُتُبِ مُقدسہ کی پیشین گوئیوں کا ذکر فرماتے ہیں جو آپ کی ذاتِ پاک کے حق میں پوری ہوئیں (لوقا ۷: ۲۷۔ متی ۱۱ : ۱۰ ، ملاکی ۳: ۱۔ متی ۲۳: ۱۴تا ۴۴ ، زبور ۱۱۰ وغیرہ) مُقدس لوقا انجیل نویس ہم کو بتلاتے ہیں کہ جب کلمتہ اللہ بعثت کے شروع میں ناصرت کے عبادت خانہ میں گئے اور آپ کتابِ مُقدس کو پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو یسعیاہ نبی کے صحیفہ کا طومار[1] آپ کے ہاتھ میں دیا گیا۔ آپ نے صحیفہِ مبارک کو کھول کر ٦۱ باب کی پہلی آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا۔"(لوقا ۴: ۱٦ ، ۲۱ ، یسیعاہ ٦۱: ۱ تا ۲)۔

حضرت ابن اللہ کُتُبِ مقدسہ کے مقامات کو سند قرار دے کر اہلِ یہود کے باطل خیالات کی تصحیح فرمایا کرتے تھے ۔(متی ۲۱: ۳۳، الخ ،زبور ۱۱۸ ، مرقس ۱۴: ۴۹، ۹: ۱۲ متی ۲٦: ۳۱۔ لوقا ۲۲ : ۳۷وغیرہ) زبور کی کتاب اور دیگر صحائف کی بنا پر ابن اللہ نے خدا کی بادشاہی کے بادشاہ ہونے کا دعویٰ کیا(متی ۲۱: ۱٦ ، زبور ۸ : ۳، متی ۲٦: ٦۴ ، زبور ۱۱۰ : ۱ ، دانی ایل ۷: ۱۳ وغیرہ) قسی القلب یہود کی سخت دلی کا ذکر آپ انبیائے سلف کی کُتُب کے الفاظ میں کرتے ہیں (متی ۱۳: ۱۴ ، یسعیاہ ٦: ۸ تا ۱۰ وغیرہ) یہوداہ غدار کی غداری کے وقت بھی آپ کے مبارک ذہن میں زبور کی کتاب کے الفاظ آئے (یوحنا ۱۳: ۱۸ ، زبور ۴۱ : ۹) آں خداوند انہی کُتُبِ مقدسہ کی آیات کے

---

[1] یہ طومار یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے اس طومار کا سا تھا جو وادی قمران سے دستیاب ہوا ہے ۔ وہ ۲۲ فٹ لمبا ہے اور نہایت اچھی حالت میں محفوظ ہے ۔ جن آیات کی کلمتہ اللہ نے تلاوت فرمائی تھی ان کی عکسی تصویر وادی قمران کے صحیفہ سے لے کر مقابل کے صفحہ پر ناظرین کی واقفیت اور دلچسپی کی خاطر اس کتاب میں شامل کردی گئی ہے۔ (برکت اللہ)

ذریعہ شیطان کی آزمائیشوں پر غالب آئے (متی ۴باب) حتیٰ کہ آخری ایام اورجانکنی کی حالت میں بھی یہی کُتبِ سماوی آپ کی حرزِجان تھیں(مرقس ۹: ۱۲- ۱۴: ۱۹ ، یوحنا ۱۳: ۱۹- متی ۲۱: ۴۲- ۲۶: ۳۱، ۵۳ ، ۵۶- لوقا ۲۲: ۳۷ ، ۳۸و ۲۴: ۲۶- متی ۲۷: ۴۶، لوقا ۲۳: ۴۳و ۴۶ ، یوحنا ۱۹: ۲۸ تا ۳۰وغیرہ) غرضیکہ حضرت کلمتہ اللہ نے اپنی زندگی کی ہر منزل اور مرحلے میں صحفِ مُقدسہ کی سند کو تسلیم کرکے ان پر اپنی مہر تصدیق ثبت کردی[1] ہے۔

ہر انجیل خواں اِس حقیقت سے واقف ہے کہ انجیل نویسوں نے منجئی جہان کے صرف چند کلمات کو ہی قلمبند کیا ہے (یوحنا ۲۰: ۲۱، ۲۵ وغیرہ)۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کلمتہ اللہ نے اپنی ۳۳سالہ زندگی میں اور بالخصوص آخری تین سالوں میں لاکھوں دفعہ عبرانی کُتبِ مقُدسہ کا ذکر کیاہوگا اوران کی صدہا آیات کا ہزاروں مرتبہ اقتباس کیا ہوگا۔ ان میں سے اناجیل اربعہ کے لکھنے والوں نے صرف ستر ۷۰ اقتباسات محفوظ رکھے ہیں۔ اناجیل کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ آں خداوند نے ان اقتباسات کے علاوہ چار صدمرتبہ عبرانی کُتبِ مقدُسہ کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔ یہ روشن حقائق ثابت کرتے ہیں کہ حضرت کلمتہ اللہ عبرانی کُتبِ مقدسہ کو آپ کے زمانہ میں مروج تھیں خالص کلامِ الہیٰ مانتے تھے جس میں کسی قسم کے تصرف کودخل نہیں تھا۔

طومار صحیفہ یسعیاہ نبی جووادی قمران سے دستیاب ہوا۔
اس قسم کا طومار حضرت کلمتہ اللہ کو ناصرۃ کے عبادت گاہ میں دیا گیا تھا(لوقا ۴: ۱۷)

---

[1] C.F.T.Henry. Our Lord's use of scripture from Revelation and the Bible (London 1959)

سیدنا مسیح نے اہلِ یہود کو ہزاروں بار ملامت فرمائی لیکن کبھی ان پر کُتب سماوی کو محرف کرنے کا الزام نہ لگایا۔ بلکہ ان کو فرمایا کہ " تم کتابِ مقُدس میں تلاش کرو، کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ اس ہمیں ہمیشہ کی زندگی تم کو ملتی ہے اور یہ وہ ہے جو میری گواہی دیتی ہے پھر بھی تم زندگی پانے کے لئے میرے پاس آنا نہیں چاہتے"(یوحنا ۵: ۳۹) ۔پس منجئی کونین کاان کتابوں کی تصدیق کرنا ان کی صداقت کی دلیل ہے ، اور اس بین دلیل کے سامنے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہودی کُتبِ مقُدسہ پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔

فصل ششم

حضرت کلمتہ اللہ کے ملہم حواریوں کی تصدیق

انجیلِ جلیل کوپڑھنے والے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ منجئی عالمین کے حواریوں نے بھی انہی کُتبِ مقُدسہ سے استدلال کیا اور یوں ان کی تصدیق کی۔ ہم جانتے ہیں کہ حوارئین کس طرح اہلِ یہود کو صلیبی واقعہ کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بناتے تھے (اعمال ۲: ۲۳ ، ۳ :۱۳-۱۷، ۱۴: ۱۰ رومیوں ۲ باب وغیرہ) اہلِ یہود ان حواریوں کے جانی دشمن بھی ہوگئے (اعمال ۴: ۲۱، ۷ : ۵۴ تا ۶۰، ۱۲: ۲۷، تا ۳۲و۲۳ : ۱۲ وغیرہ وغیرہ) لیکن ان حواریوں نے اپنی تصنیفات میں کبھی اہلِ یہود پر کُتبِ سماوی کو محرف کرنے کا الزام نہ لگایا۔ بلکہ انہوں نے ان کی کُتب کوہمیشہ کے لئے مسیحی کلیسیا کی کُتبِ مقدسہ قرار دیا اورانہی کُتبِ مقدسہ سے منجئی عالمین کی مسیحیت کا ثبوت دیتے رہے۔ جس سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہوگیا کہ ان کی نظر میں یہ کُتبِ مقُدسہ بجنسہ وہی ہیں جن کو انبیاء اللہ نے لکھا تھا۔

کُتبِ عہد جدید میں تورات ، زبور اور صحائف انبیاء کے دو سو پچانوے مقامات کے اقتباسات موجود ہیں جو انجیل جلیل کی ۳۵۲ آیات پر مشتمل ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ اقتباسات انجیل کا قریباً بیسواں (۱/ ۲۰) حصہ ہیں اور اوسطاً انجیل کی ۲۲ آیات میں سے ایک آیت عہدِ عتیق کی کُتبِ مقُدسہ کا اقتباس موجود ہے۔ ان اقتباسات کے علاوہ مصنف یوحین ہوہن Eugen Huehn کے شمار کے مطابق تمام انجیلی مجموعہ میں چار ہزار ایک سو پانچ اشارات وکنایات بھی موجود ہیں ، جس کا مطلب یہ ہوا کہ انجیل جلیل کے کل متن کے دسویں حصہ سے زیادہ حصہ عہد عتیق کی کُتبِ مقُدسہ کے اقتباسات ، اشارات وکنایات پر مشتمل ہے۔ حضرت ابن اللہ کے کلامِ بلاغت نظام میں بھی جیسا ہم گذشتہ فصل میں بتلاچکے ہیں ۔یہی نسبت موجود ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو انجیلی مجموعہ کی بعض کُتب مثلاًعبرانیوں کے نام کا خط، مکاشفات کی کتاب وغیرہ تمام کی تمام عہدِ عتیق کی کُتبِ مقُدسہ کے خیالات ، تصورات ،جذبات اور الفاظ وفقرات سے معمور ہیں [1] ۔اس تعداد وشمار سے اظہر من الشمس ہے کہ عہد جدید کی کُتبِ کے مصنفین کی نظر میں تورات وزبور اور صحائفِ انبیاء کی سند اور پایہ اعتبار نہایت رفیع تھا چہ جائیکہ ان میں کوئی تحریف وفتور واقع ہوا ہو اور وہ ساقط الاعتبار ہو گئی ہوں۔

---

[1] See Franklin Jonshon, The Quotations of New Testament from the Old, considered in the Light of General Literature.

باب ششم
دَورِ سوم۔ تلمُودی زمانہ
(از ۷۰ء تا ۶۰۰ء)

قدیم نسخے

یروشلیم کی تباہی کے ساتھ اہل یہود کی قومی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیرونی شان وشوکت، ان کی بادشاہی کے خواب، ان کا مُقدس شہر اُن کے خدا کی ہیکل اور مقدس مقامات رومی فاتحین کے ہاتھوں پہلی دفعہ ویس پیسیئن Vaspasian کےوقت (۷۰ء) اور دوسری دفعہ قیصر ہیڈرین Hadrian کے وقت (۱۳۵ء) میں برباد اور تباہ ہوچکے ہیں تو انہوں نے اپنے قدیمی خزائن کو محفوظ رکھنے کی سر توڑ کوشش کی۔ ان کی عبرانی کُتُبِ مقدسہ ہی ان کے خزائن رہ گئے تھے۔ پس انہوں نے اپنی تمام توجہ اور کوشش کُتُبِ مقُدسہ کے مُطالعہ کی طرف لگادی۔

بیسویں صدی میں ہم کواس زمانہ کے بعض قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن کے ذریعہ ہم عبرانی کُتُبِ مقدسہ کے موجود متن کی جانچ پڑتال کرسکتے ہیں۔ یہ نسخے یونانی ترجمہ سبعینہ (سیپٹواجنٹ) کے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں ایک قبطی قبرستان سے بعض قدیم یونانی نسخے ملے جو مرتبانوں میں بند تھے۔ کیونکہ کہ پرانے زمانے میں پے پائیرس کے نسخے اکثر مرتبانوں اور بالٹیوں میں رکھے جاتے تھے۔ یہ نسخے مسٹر اے چیسٹر بیٹی A. Chester Beatty. نے (جن کو مشرق ومغرب کے قدیم نسخوں کو اکٹھا کرنے کا جنوں ہے) خرید لئے۔ یہ مشہور ومعروف صاحب امریکن ہیں، لیکن انگلستان میں مقیم ہیں۔ اس ذخیرہ کے بعض نسخے مشی گن یونیورسٹی Michigan University نے خرید لئے اور بعض نسخے دیگر اشخاص کی ملکیت ہیں۔

اس ذخیرہ میں سے گیارہ نسخے بائبل شریف کے مختلف حصوں کی نقلیں ہیں۔چنانچہ آٹھ نسخے عہدِ عتیق کی کتابوں کے ترجمہ سیپٹواجنٹ کے ہیں اور تین نسخے انجیل کی کتابوں کی نقلیں ہیں۔ یہ نسخے اس قدر اہم ہیں کہ جس طرح وادی قمران کے نسخوں اور نسخہ سینا کے ملنے کے وقت ادبی دنیا میں ہل چل مچ گئی تھی اسی طرح ان نسخوں کی دستیابی نے نقادوں میں ہلچل پیدا کردی ہے۔

(۱۔) عہدِ عتیق کی کُتب میں دو نسخے پیدائش کی کتاب کے ہیں۔ ایک نسخہ تیسری صدی کے اواخر کا اور دوسرا نسخہ چوتھی صدی کے اوائل کا ہے اور دونو نسخے اکٹھے مل کر پیدائش کی کتاب کے تقریباً تمام ابواب پر حاوی ہے اور یہ نسخے خاص طور پر قیمتی ہیں کیوں کہ نسخہ سینا اور نسخہ ویٹی کن Vaticanus میں اس کتاب کا نہایت قلیل حصہ موجود ہے۔ پس اب ہمارے پاس تمام پیدائش کی کتاب کا قدیم ترین یونانی متن موجود ہے۔

(۲۔) ایک نسخہ گنتی اور استشنا کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ جو نہایت خوش خط ہے اور ۱۲۰ء اور ۱۵۰ء کے درمیان کا لکھا ہوا ہے۔ پس اس نسخہ میں بھی تورات کی ان دو کتابوں کے یونانی ترجمہ کا قدیم ترین متن دستیاب ہوگیا ہے۔ اس کے ملنے سے ہمیں یہ یقین ہوگیا ہے کہ پہلی صدی مسیحی کے سیپٹواجنٹ کے اور نسخے انشاء اللہ مستقبل قریب میں ہم کو دستیاب ہوجائیں گے[1]۔ اس نسخے کے ایک سو آٹھ ورق تھے جن میں پچاس اچھی حالت میں اور باقی صفحوں کے ٹکڑے موجود ہیں۔

---

[1] ان سطور کے لکھنے کے بعد ہم کو قمران کے عبرانی نسخے دستیاب ہوئے ہیں جن کا مفصل ذکر باب دوم میں کیا گیا ہے اور جو سیدنا مسیح سے دو صدیاں پہلے لکھے گئے تھے۔ (برکت اللہ)

(۳۔) ایک نسخہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ کا ہے جو پھٹاہوا ہے۔ یہ نسخہ صاف اور خوش خط ہے اور اس کے حاشیہ پر قبطی زبان میں نوٹ لکھے ہوئے ہیں۔ یہ نسخہ تیسری صدی کے اوائل کا ہے۔

(۴۔) یرمیاہ نبی کے صحیفہ کے چند اوراق جو دوسری صدی کے آخر یا تیسری صدی کے شروع کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۵۔) ایک نسخہ حزقی ایل، دانی ایل اور آستر کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ کتابی پے پائرس کا ہے جس کو دو کاتبوں نے لکھا ہے۔ حزقی ایل کی کتاب کا کاتب دوسری دو کتابوں کے کاتب سے مختلف ہے۔ اس کے ایک سو اٹھارہ ورق ہیں، جن میں سے ۲۹ مسٹر بیٹی کے پاس ہیں اور ۲۱ پرنسٹن یونیورسٹی کے پاس ہیں جو بہتر حالت میں ہیں۔ یہ نسخہ تیسری صدی کے اوائل کا ہے اور بالخصوص دانی ایل کی کتاب کے یونانی ترجمہ سبعینہ کے معلوم کرنے میں بے نظیر نسخہ ہے۔

(۶۔) ایک نسخہ جو ایک پورے ورق اور دوسرے ورق کے ایک حصہ پر مشتمل ہے چوتھی صدی کا ہے۔

ترجمہ سپٹواجنٹ کی کُتبِ عہد عتیق کے ان نسخوں کے متعلق دو باتیں قابلِ غور ہیں:

اول یہ کہ پہلے دو نسخوں کی طفیل ہم کو پیدائش کی کتاب کا قدیم ترین یونانی متن مل گیا ہے۔ نسخہ سینا اور نسخہ ویٹی کن میں (جن کا مفصل ذکر آئندہ کیا جائے گا) پیدائش کی کتاب نہیں تھی۔ اور اب تک اس کتاب کے متن کے لئے ہمارا انحصار نسخہ سکندریہ پر تھا جو پانچویں صدی کا نسخہ ہے۔ لیکن یہ نسخے تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے شروع کے ہیں۔ پس اب پیدائش کی کتاب کے یونانی متن کے گواہ نہایت قدیم ہیں اور کم از کم ایک صدی پیشتر کے ہیں۔

دوم، گنتی اور استثنا کی کتابوں کی یہ یونانی نسخے قدیم ترین ہیں جو تاحال دستیاب ہوئے ہیں اور جن کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں یسعیاہ نبی کے صحیفہ کا ایک یونانی نسخہ دستیاب ہوا ہے جو ارض مقدس کی ایک خانقاہ سے ملا ہے۔ یہ نسخہ پہلی صدی مسیحی کا ہے اور اچھی حالت میں محفوظ ہے۔(Civil and Military Gazette, Lahore, April 14, 1948)

مذکورہ بالا نسخوں کے علاوہ واشنگٹن کے مجموعہ میں دو اور قابل ذکر یونانی نسخے ہیں۔ ایک نسخہ زبور کی کتاب کا یونانی ترجمہ ہے جو چھٹی صدی کا ہے اور دوسرا نسخہ استثنا اور یشوع کی کتابوں کے ترجمہ سبعینیہ پر مشتمل ہے جو غالباً پانچویں صدی کے اواخر میں لکھا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ نسخہ لکھا گیا تھا تو اس میں تورات کی پانچوں کتابیں اور قضاۃ اور روت کی کتابیں بھی شامل تھیں۔

جمنیہ کی کونسل

جب رومی افواج نے اہلِ یہود کی بغاوت کو ۷۰ء میں فرو کردیا تو جیسا ہم باب پنجم کی فصل دوم میں لکھ چکے ہیں فاتحین نے شہر یروشلیم کو تباہ و برباد کردیا اور یہود کی مقُدس ہیکل کو مسمار کردیا اور ایسا کہ ابن اللہ کی پیشین گوئی کے مطابق وہاں "کسی پتھر پر پتھر باقی " نہ رہا (متی ۲۴: ۱ تا ۲ آیات) یہود مختلف ملکوں میں منتشر ہوگئے اور قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں انتشار پیدا ہوگیا۔ اب بنی اسرائیل کے لیڈروں کے پاس صرف ایک واحد شے رہ گئی جو قوم کے پراگندہ افراد کو یکجا جمع کرسکتی تھی اور وہ تھیں ان کی کُتبِ مقُدسہ۔ اب ان قومی اور مذہبی لیڈروں کی تمام کوششیں تورات اور صحف انبیاء کے مطالعہ پر مرکوز ہوگئیں۔ جس والہانہ عقیدت سے ہیکل کو پہلے دیکھا جاتا تھا، (مرقس ۱۴: ۵۸، ۱۵: ۲۹ وغیرہ) اب انبیاء اللہ کُتبِ مقُدسہ کو بیش از پیش اسی شیفتگی کے ساتھ دیکھا جانے لگا کیونکہ اب یہی واحد قومی ورثہ ان کے پاس رہ گیا تھا۔

اِن کتُبِ مقدسہ کی حفاظت کرنا اب ان کی زندگی کا واحد مقصد ہو گیا پس ۹۰ء میں یہودی عُلما اور فضُلا کی مقام جمنیہ میں ایک مجلس منعقد ہوئی۔ جس میں کتُبِ مقُدسہ کے الفاظ کا ایک معیاری متن قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مجلس میں کتابوں کے صفحوں کی سطروں کی تعداد مقرر کی گئی ۔ ہر سطر کے الفاظ کی تعداد مقرر ہو گئی ۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ایک لفظ کے مختلف حروف کے درمیان اور مختلف الفاظ کے درمیان کس قدر فاصلہ چھوڑا جائے ۔ مقدس الفاظ لکھنے کے لئے کس قسم اور کس رنگ کی سیاہی ہو۔انہوں نے یہاں تک فیصلہ کیا کہ ان متبرک کتابوں کو لکھنے کے وقت کاتبوں کو کس قسم کے لباس میں ملبوس ہونا چاہیے۔ کاتبوں کو ہدایت کی گئی کہ ہر لفظ کو نہایت صحت کے ساتھ نقل کریں کیونکہ ہر لفظ کا تبِ ازل کے ہاتھوں نے لکھا تھا (خروج ۱۹: ۱۶ تا ۲۰: ۲۱وغیرہ)

یہودی مدرسے

۱۲۰ء کی قریب اہلِ یہود کے حلقوں میں درس وتدریس کے مدرسے جا بجا کھل گئے جن میں زیادہ مشہور مدرسے لدا، قیصریہ اوطبریاس کے مدرسے تھے۔ ان مدرسوں میں علم صرف ونحو ، علم تنقید اور علم تفسیر پڑھائے جاتے تھے ۔ موخر الذکر یعنی طبریاس کا مدرسہ جھیل کے کنارے واقع تھا اور سب سے زیادہ مشہور اور معروف تھا۔اس مقام میں نہ کوئی سامری اور نہ بُت پرست اور نہ کوئی مسیحی رہ سکتا تھا ۔ اس جگہ کا مدرسہ تمام یہودی دنیامیں مشہور تھا اور یہ جگہ اہلِ یہود کی گویا دارالعلوم تھی۔ ربی یہوداہ جس کی وفات ۲۲۰ء میں ہوئی اسی دارالعلوم میں استاد تھا ۔ اور ربی یوحنا ، ایکولا اور سمکس اسی دارالعلوم میں ربی عقیبہ کے شاگرد رہ چکے تھے۔

جب مسیحیت نے اس یہودی قلعہ کو سر کرلیا تو اس دارالعلوم کے طلبا ، دیگر ممالک کو نقل مکانی کر گئے اورجہاں گئے انہوں نے وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کردیا ایسا کہ دریائے فرات کے کنارے بابل کی سرزمین کے یہودی دارالعلوم نے طبریاس کے دارالعلوم کو بھی مات کردیا۔

تلمود کی تالیف

ان مدرسوں میں (جو ۲۰۰ء تا ۵۰۰ء تک جاری رہے) صرف یہودی کتُبِ مقدسہ اوران کے متعلقہ مضامین پر ہی درس دئیے جاتے تھے۔ یہودی استاد خاص طور پر اپنے آباؤ اجداد کی تفاسیر پر (جو پشت درپشت سینہ بسینہ چل آتی تھیں) اوران روایات پر بے حد زور دیتے تھے جن کا تعلق کتُبِ مقدسہ سے تھا۔

ان روایات اور روایتی تفسیروں کو ان یہودی استادوں اور خصوصاً ربی یہوداہ نے ۳۰۰ء کے قریب باقاعدہ طور پر ایک جگہ جمع کیا اور اس کا نام " مشنہ " (بمعنی دہرانا۔ عربی= مثنیٰ) رکھا۔ کیونکہ ان روایات کی تعلیم زبانی دہرا کردی جاتی تھی ۔ بعدہ بایں خیال کہ یہ زبانی روایات یا " مشنہ " ضائع نہ ہوجائے ۔ طبریاس کے مدرسہ کےربی یہوداہ اور دیگر اساتذہ ان کو احاطہ تحریر میں لے آئے اوران روایات کی تفسیرات (جس کا نام " گیمیرا"[1] رکھا گیا) بڑھتی گئیں ۔" گیمیرا" اس علم کو کہتے ہیں جو سینہ بسینہ چلاآیا ہو۔ مشنہ اور گیمیرا دونو کو یکجا جمع کردیا گیا اور مجموعہ کا نام "تلمُود" (بمعنی تعلیم) رکھا گیا۔ یہ مجموعہ ۵۸۰ء قبل مسیح تا ۴۰۰ء سن عیسوی کے یہودی خیالات، روایات اور تفاسیر کا آئینہ ہے، کیونکہ اس کی ابتدا زمانہ اسیری ۵۸۶ قبل مسیح) سے ہے لیکن یہ ۲۰۰ء سے ۴۰۰ء میں مکمل ہوا۔ ان کتُب کے مطالعہ پر اتنا زور دیا گیا کہ یہودی ربی کہتے تھے کہ "وہ شخص جو کتُبِ مقدسہ سے واقف ہے لیکن مشنہ کو نہیں جانتا احمق ہے "۔ مشنہ کو شریعت کی حفاظت کی باڑ سمجھا جاتا تھا۔ یہ مجموعہ یہودی ربیوں کی نظر میں اس قدر واجب الاحترام تھا کہ وہ مبالغہ سے کام لے کر کہتے تھے کہ " موسیٰ کو شریعت دن کو دی گئی اور مشنہ رات کو"۔ " تورات نمک کی طرح

[1] Gemera,Talmud, Mishna

ہے، لیکن مشنہ مرچ اور گیمیرا خوشبودار مصالحہ کی طرح ہے۔" مشنہ دوسری صدی میں اور گیمیرا چوتھی صدی مسیحی میں لکھے گئے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ تلمود، مشنہ اور گیمیرا میں کُتبِ مقُدسہ کے اقتباسات موجود ہیں کیونکہ تلمود درحقیقت کُتبِ مقدسہ کی تفسیر ہی کا نام ہے۔ یہ اقتباسات تقریباً حرف بحرف موجودہ عبرانی متن کے مطابق ہیں۔ تلمودی زمانہ میں کتاب مقُدس کی نقل کرنے کے لئے فقہیوں کو نہایت مفصل ہدایت دی جاتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کُتبِ مقدسہ کو نہایت حزم اور احتیاط کے ساتھ نقل کیا کرتے تھے۔

کُتبِ "ترجم"

اس سلسلہ میں تلمود کے علاوہ کُتبِ "ترجم[1] " کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے ہے۔ اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ ، جب بنی اسرائیل اسیری سے واپس آئے تو عزرا فقیہ نے شریعت کا عبرانی نسخہ ان کے سامنے پڑھا تھا۔ لیکن چونکہ عوام الناس عبرانی سے ناواقف تھے اور ارامی زبان ہی جانتے تھے لہذا لاوی ان کے معنی بتاتے" اور اُن پڑھی ہوئی باتوں کی عبارت ان کو سمجھاتے تھے۔"(نحمیاہ ۸: ۱ تا ۸)مابعد کے زمانہ میں یہ باقاعدہ دستور بن گیا اور چونکہ عوام الناس عبرانی سے ناواقف تھے۔لہذا عبادت خانوں میں پہلے عبرانی نسخہ کی ایک ایک آیت پڑھی جاتی تھی، پھر ایک اور شخص جو "ترجمان" کہلاتا تھا ، اس آیت کا ارامی زبان میں ترجمہ کرکے اپنے الفاظ میں اہلِ یہود کے خصوصی عقائد کے مطابق اس عبارت کو سمجھاتا تھا ۔ مترجم کو حکم تھا کہ وہ کوئی کتاب استعمال نہ کرے تاکہ لوگ الہامی عبرانی عبارت میں (جو کتاب میں لکھی ہوتی تھی) اور زبانی ترجمہ کے الفاظ میں تمیز کرسکیں۔ اس ترجمہ شدہ توضیحی

[1] عبرانی میں یہ لفظ " تارگم" ہے لیکن ہم نے اردو خوانوں کی خاطر اس کو" ترجم" لکھا ہے کیونکہ وہ الفاظ ترجمہ اور تراجم سے واقف ہیں۔(برکت اللہ) Taragum

ارامی عبارت کا نام یہودی اصطلاح میں " ترجم" (بمعنی مفصل ترجمہ) ہے ۔ بعد میں یہ توضیحی تشریحیں احاطہ تحریر میں آئیں جو کنعان وبابل کے مدرسوں کے استادوں نے لکھیں۔ ان میں زیادہ مشہور اونکیلوس یا ایکولا Ankelos or Aquila کا " بابلی ترجم" (از ۱۰۰ ء تا ۲۰۰) ہے جو زیادہ تر تورات کے اس متن کا لفظی ترجمہ ہے جو بابل کے دارالعلوم میں مستعمل تھا۔

اونطلوس کے "ترجمہ کے علاوہ " کنعانی تراجم" بہت مشہور ہیں جو اول الذکر سے زیادہ تفسیری "تراجم ہیں۔" مثلاً" یونتن کے ترجمہ" میں یسعیاہ ۵۲: ۱۳ تا۵۳ : ۱۲ میں خادم یہوواہ کو مسیح موعود کہا گیا ہے لیکن باقی آیات میں " خادم " کے دکھوں کو یا تو بنی اسرائیل کی طرف اور یا قوم اسرائیل کے دشمنوں کی جانب ان کو منسوب کیا گیا ہے ۔انجیل جلیل کے ناظرین سے مخفی نہیں کہ انجیل میں " خادمِ یہوواہ" نہ صرف مسیح موعود ہے بلکہ خادم کے دکھوں کو بھی مسیح موعود کے دکھوں کی تفصیل بتلائی گئی ہے۔

وادی قمران کے غار نمبر ۱۱ سے ایوب کی کتاب کا" ترجمہ" دستیاب ہوا ہے۔ یہ " تراجم" جیسا ہم اوپر بتلاچکے ہیں کہ عہدِ عتیق کی کسی کتاب کا مفہوم عوام کو سمجھانے کے لئے تفسیری ترجمے تھے۔ قمران کے طوُمار ثابت کردیتے ہیں کہ سیدنا مسیح کے زمانہ کے خواص اور ربی عبرانی سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے لئے عبرانی مُردہ زبان نہ تھی۔ ہم اپنی کتاب"قدامت واصلیت اناجیل اربعہ " میں اس حقیقت کی وضاحت کرآئے ہیں اور یہ بھی بتلاچکے ہیں کہ حضرت کلمتہ اللہ بھی اپنی مادری زبان ارامی میں عوام کو پندو نصائح سے مستفیض فرماتے تھے اوریہودی ربیوں سے عبرانی میں بحث کیا کرتے تھے اور کہ آپ کے مواعظ عبرانی زبان کی مختلف اقسام کی صنعتوں سے معمور ہیں (دیکھو جلد دوم حصہ پنجم باب اول ودوم)۔

قدیم قاہرہ میں ایک عمارت ہے جس کو کسی زمانہ میں مقدس میکائیل کا گرجا کہتے تھے۔ یہ گرجہ ۸۸۲ء میں یہودی عبادت خانہ بن گیا۔ اس جگہ سے کُتُبِ عہدِ عتیق کے قدیم نسخہ جات برآمد ہوئے ہیں۔ جو صدیوں سے اس میں رکھے پڑے جاتے تھے۔ ان نسخہ جات کے حالات کو پروفیسر کھلے Prof. E. Kahle نے ایک کتاب میں لکھاہے جس کانام" قاہرہ کے گینی زے" The Cairo Geniza ہے۔ جس کو حال ہی میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر مذکور نے عبرانی بائبل کے متعلق گذشتہ نصف صدی کی معلومات کا ذکر کیاہے اور عبرانی متن کی صحت پر بحث کی ہے۔ اب سے پہلے عُلماء کا یہ خیال تھا کہ یہودی " ترجم" پانچویں صدی مسیحی سے پہلے موجود نہ تھے۔ لیکن اب ثابت ہوگیاہے کہ وہ ابن اللہ کی پیدائش سے قبل موجود تھے۔ چنانچہ پروفیسر مذکور کہتے ہیں کہ " یہ یہودی روایت درست معلوم دیتی ہے۔"ترجم حضرت عزرا کے زمانہ میں شروع ہوئے اوران کی ابتدا تب سے ہے۔" اس کتاب سے ہم کو یہ بھی پتہ چلتاہے کہ آنخداوند اورآپ کے ہم عصر کس قسم کی ارامی زبان بولا کرتے تھے۔

اگر تلمود اور ترجم دونو کا مقابلہ موجودہ عبرانی کُتُبِ مُقدسہ کے الفاظ سے کیا جائے تو ان کے الفاظ کی صحت کے مسئلہ پر بہت روشنی پڑسکتی ہے۔ ان یہودی مدرسوں کے استادوں نے مختلف قراتوں کو اکٹھا کیا۔ جب وہ نسخہ میں کوئی غلطی دیکھتے تھے تو وہ متن کو درست نہیں کرتے تھے بلکہ صحیح لفظ کو حاشیہ پر لکھ دیتے تھے۔ نسخوں کو نقل کرنے کے لئے انہوں نے بہ تفصیل ہدایات لکھیں اور مشابہ حروف کی کتابت کی نسبت انہوں نے اپنے شاگردوں کو خبردار اور آگاہ کیا۔ انہوں نے کُتُبِ مقُدسہ کی ہر ایک کتاب کی آیات اور الفاظ تک کا شمار کیا تاکہ نقل کرتے وقت کسی طرح کی غلطی نسخوں میں داخل نہ ہوجائے۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی روایات کو (جو متن کے الفاظ کے متعلق سینکڑوں برس سے سینہ بسینہ چلی آتی تھی) لکھ کراپنے شاگردوں کو دیں۔

یہ ظاہر ہے کہ اہلِ یہود کے دارالعلوم میں عبرانی کُتُبِ مُقدسہ کے صحیح ترین نسخے موجود تھے کیونکہ پہلی صدی مسیحی کے اختتام سے پیشتر صحیح متن کے نسخے تیار کئے گئے تھے۔ کُتُبِ عہدِ جدید سے ہم کو پتہ چلتا ہے، کہ اہلِ یہود اپنی کُتُبِ مقُدسہ کے الفاظ اور حروف تک کو کس وقعت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ ان کے الفاظ کی صحت پر زور دے کر ان سے استدلال کیا کرتے تھے۔ ان " لفظ پرست" فاضل احبار اور فقہا کے حلقہ نے اس دارالعلوم میں اور ۹۰ء اور ۱۱۸ء کی کونسلوں میں نہایت مستند اور بہترین نسخوں سے صحیح متن تیار کیا۔ غرضیکہ وہ اپنی کُتُبِ مقدسہ کے الفاظ اور حروف کو محفوظ رکھنے کے لئے جو کچھ بھی کرسکتے تھے اپنے علم اورلیاقت کے موافق کرتے رہے۔ ان کی نظر میں ان کا کُتُب کا ایک ایک شوشہ پاک اور واجب الاحترام تھا، (متی ۵: ۱۸) لہذا انہوں نے حتی المقدور ان الفاظ کو بصحت تمام محفوظ رکھنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ جب ہم اس متن کا مقابلہ مروجہ عبرانی متن سے کرتے ہیں تو دونوں کو لفظ بلفظ تقریباً متفق پاتے ہیں۔

جب ہم تلمود اور ترجم کا مقابلہ عبرانی کُتُبِ مقُدسہ سے کرتے ہیں تو ہم پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جہاں کہیں ان کُتُب میں الہامی الفاظ کا صحیح اقتباس کیا گیا ہے وہ لفظ بلفظ موجودہ عبرانی عبارت کے ساتھ ملتاہے۔ پس ہم وثوق کےساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو عبرانی کُتُبِ مقُدسہ ہمارے ہاتھوں میں ہیں وہ درحقیقت وہی ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھیں اور ان میں کوئی ایسی تحریف واقع نہیں ہوئی جس کی وجہ سے وہ ساقط الاعتبار قرار دی جائیں۔

عبرانی کُتبِ مُقدسہ کے دیگر یونانی ترجمے

اسی زمانہ میں عبرانی کُتبِ مُقدسہ کے تین اور یونانی ترجمے بھی کئے گئے جو دوسری صدی مسیحی میں ہوئے تھے ۔ ان کے مترجم یہودی علماء تھے جو اپنے زمانہ کے یکتا عالم تھے۔ ان کے نام ایکولا اور سمیکس اور تھیوڈوشن [1] تھے۔

ان تراجم کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے لیکن ہم یہاں بغرضِ اختصار صرف ایکولا کے ترجمہ کی کیفیت درج کرتے ہیں۔ ایکولا ایک رومی بُت پرست تھا، جو حلقہ ء امرا میں سے تھا اور قیصر روم کے خاندان کے ساتھ ناطہ رکھتا تھا۔ ایک دفعہ وہ قیصر کے حکم سے سرکاری کام پر یروشلیم گیا جہاں وہ مسیحی ہوگیا۔ لیکن چونکہ اس کی زندگی مسیحی چال چلن کے مطابق نہ تھی اور وہ شرک اور اوہام پرستی میں مبتلا رہتا تھا لہذا یروشلیم کی چھوٹی سی مگر دلیر مسیحی کلیسیا نے اس کو علانیہ ملامت کی ۔ ایکولا اپنی زندگی کو سدھارنے کے بجائے غصہ سے بھر گیا۔ اس نے مسیحیت کو ترک کرکے یہودی مذہب اختیار کرلیا اور موسوی شریعت ورسوم کو جوشیلا مبلغ بن گیا۔ اس نے طبریاس کے یہودی دارالعلوم میں مشہور عالم اور مسیحیت کے جانی دشمن ربی عقیبہ کے قدموں میں بیٹھ کر یہودی علومِ دین کی تعلیم پائی۔

انہی دنوں میں یہودیوں اور مسیحیوں کے درمیان سیدنا مسیح کی آمد کی پیشینگوئیوں کی نسبت بحث ہوا کرتی تھی ۔ مسیحی یونانی ترجمہ سبعینیہ (سیپٹواجنٹ) کو اپنی حجت ثابت کرنے کے لئے پیش کیا کرتے تھے ۔ انجیل کی اشاعت سے پیشتر سوائے اہلِ یہود کے کوئی دوسرا ان کی کُتبِ مُقدسہ کا یونانی ترجمہ نہیں پڑھتا تھا لیکن اب مسیحی انہی کی کتاب کو اپنے عقائد کے ثبوت میں پیش کرنے لگے ۔ لہذا یہودی ربیوں نے اس ترجمہ کا نام " مسیحی بائبل" رکھ دیا اور اہلِ یہود نے کو اس کے پڑھنے سے منع کردیا بلکہ ایک یہودی ربی نے تو یہاں تک کہہ

[1] Aquila, Symmachus, Theadotion

دیا کہ اس ترجمہ کو معرضِ وجود میں لانے کے گناہ کے لئے تمام یہودی قوم کو سال میں ایک مرتبہ روزہ رکھنا چاہیے۔ پس اب ان کو یہ ضرورت پیش آئی کہ اہلِ یہود کے لئے ایک نیا ترجمہ یونانی زبان میں کیا جائے ۔ کیونکہ عوام عبرانی زبان سے ناواقف تھے ۔ مُرتد ایکولا نے **۱۰۰** ء کے قریب اس کام کو سرانجام دیا۔

یہ ترجمہ عبرانی کا لفظی ترجمہ ہے، جیسا قرآن کا ترجمہ شاہ رفیع اللہ نے کیا ہے اس میں عبرانی الفاظ کے ترجمہ کرنے میں یونانی قواعدِ صرف ونحو اور یونانی زبان کے محاورہ کی مطلقاً پروا نہیں کی گئی بلکہ عبرانی الفاظ کا لفظ بلفظ یونانی میں ترجمہ کیا گیا ہے حتیٰ کہ عبرانی مصدر کے مشتق الفاظ کو ان کے مطابق کے مشتق الفاظ سے ترجمہ کیا گیا۔ جس کی وجہ سے یہ ترجمہ اکثر واقات مضحکہ خیز اور بے معنی ہوجاتا ہے ۔ یہ ترجمہ اہلِ یہود میں مستند سمجھا جانے لگا۔

چونکہ یہ ترجمہ اصل عبرانی زبان کا لفظی ترجمہ ہے ۔ پس اس زمانہ کے اصل عبرانی متن کے الفاظ معلوم کرنے کے لئے ان دونوں پہلوؤں سے نہایت بیش قیمت ہے اور جب ہم اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہیں کہ ایکولا طبریاس کے یہودی دارالعلوم میں طالب علم رہ چکا تھا اور بہترین کنعانی متن سے واقف تھا تو یہ ترجمہ اس زمانہ کے مستند عبرانی متن کو معلوم کرنے کے لئے نہایت گرانقدر ہوجاتا ہے۔ جب ہم اس لفظی ترجمہ کا مقابلہ موجودہ عبرانی متن سے کرتے ہیں تو دونوں میں حیرت انگیز اتفاق پاتے ہیں کیونکہ دونوں میں بمشکل اختلافات نظر آتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ عبرانی متن لفظ بلفظ تقریباً وہی متن ہے جو اس مترجم کے سامنے تھا۔

ایکولا کا یونانی ترجمہ لفظی ترجمہ تھا۔ لیکن سیمکس کا ترجمہ **۱۷۵**ء کے قریب) بامحاورہ ترجمہ تھا جو زبان کے لحاظ سے یونانی ترجموں میں بے نظیر اوریکتا تھا۔ یہ

مترجم نسل کا سامری تھا۔ ایسا معلوم ہوتاہے کہ اس نے یہ ترجمہ (جو اس کی حین حیات میں دوبارہ شائع ہوا) غالباً سامریوں کے لئے یونانی زبان میں کیا تھا۔

تیسرے مترجم مسیحی عالم تھیوڈوشن (۱۸۵ء کے قریب) کا مقصد یہ تھا کہ یونانی ترجمہ سبعینیہ (سیپٹواجنٹ) کی مروجہ عبرانی متن کے ذریعہ نظر ثانی کرے۔ جس طرح ایکولا کے ترجمہ نے اہلِ یہود کے دلوں میں گھر کرلیا اسی طرح اس ترجمہ نے مسیحی کلیسیا میں عام مقبولیت حاصل کرلی۔

ہرسہ تراجم مختلف پہلوؤں سے اس زمانہ (دوسری صدی) کے عبرانی متن کے الفاظ کو معلوم کرنے کے لئے نہایت کارآمد ہیں۔ جب ہم موجودہ عبرانی متن کا ہرسہ تراجم سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم پر ظاہر ہوجاتاہے کہ موجودہ عبرانی متن باستثنائے معدودے چند الفاظ وفقرات وہی عبرانی متن ہے جو طبریاس کے دارالعلوم میں مستند مانا جاتا تھا کیونکہ ان ترجموں کے الفاظ تورات سامری اور ترجمہ یونانی سیپٹواجنٹ سے بھی کہیں زیادہ موجودہ عبرانی متن کے الفاظ سے ملتے ہیں۔

عبرانی کُتبِ مقُدسہ کا سرُیانی ترجمہ

مُلکِ شام کی مسیحی کلیسیا نے بھی اسی زمانہ میں یہودی کُتبِ مُقدسہ کا سریانی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس کا مفصل ذکر اسی رسالہ کے حصہ دوم میں آئیگا۔ یہ ترجمہ غالباً پہلی صدی میں ہی کیا گیا تھا۔

خاندان ادیابین کے بادشاہ نے ۴۰ء کے قریب یہودی مذہب اختیار کرلیا۔ اب شاہی خاندان کے بچے تعلیم حاصل کرنے کے لئے یروشلیم بھیجے جانے لگے۔ پس یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کُتبِ مقدسہ کا ترجمہ سرُیانی زبان میں کیا جائے اور پہلی صدی مسیحی کے نصف میں تورات اور چند دیگر کُتب کا اور کُتب کے حصوں کا ترجمہ سریانی زبان میں کیا گیا۔ لیکن جب شام کے ملک میں کلیسیا کی اشاعت ہوئی تو بزرگانِ کلیسیا نے اس کو ناکافی سمجھ کر عبرانی

زبان سے سیکھا۔ سرُیانی زبان میں خود ترجمہ کیا، شامی کلیسیا (جیسا ہم اپنی کتاب "تومارسول ہند" میں بتلاآئے ہیں کہ پہلی صدی کے اواخر میں ادیابین کے دارالسلطنت میں قیام پکڑ چکی تھی، اور دوسری صدی سے اڑیسہ جو بالائی فرات کے مشرق کی جانب تھا۔ تمام مسوپوتامیہ کی مسیحی کلیسیاؤں کا مرکز ہوگیا تھا۔

ترجمہ سبعینیہ کے بعد کُتبِ مُقدسہ کا یہ سریانی ترجمہ نہ صرف قدیم ترین ترجمہ ہے بلکہ سب سے زیادہ اہم شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے متن کی نسبت مشہور نقاد ایس۔ آر۔ ڈرایئور کہتا ہے کہ یہ ترجمہ ثابت کردیتا ہے کہ اس کا اصل متن وہی تھا جو ماسوراہی متن کہلاتاہے۔

یہ ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ محاورہ سلیس اور سادہ سریانی زبان میں کیا گیاہے۔ یہ ترجمہ کم از کم ۱۵۰ء تک رائج ہوگیا تھا۔ یہ مسیحی کلیسیا کا قدیم ترین ترجمہ پشیتہ[1] (بمعنی سادہ) ہے اور عبرانی زبان سے سیدھا سریانی زبان میں کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ترجمہ بڑے اعلیٰ پایہ کا ہے لہذا پہلی صدی مسیحی کے عبرانی متن کے الفاظ کو معلوم کرنے کے لئے نہایت کارآمد ہے۔ جب ہم اس مسیحی ترجمہ کے عبرانی متن کا موجودہ یہودی کُتبِ مقُدسہ سے عبرانی متن سے مقابلہ کرتےہیں تو باستثنائے چند الفاظ وآیات دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لفظ بلفظ متفق پاتے ہیں، جس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ موجودہ عبرانی متن وہی ہے جو منجئی عالمین سیدنا مسیح کے دنوں میں رائج تھا۔

اَوریجن کا ترجمہ

اَوریجن مسیحی کلیسیا میں ایک نہایت زبردست اور جیّد عالم گذرا ہے۔ کُتبِ مُقدسہ کے علم میں وہ یکتائے زمانہ اور وحید العصر تھا۔ اس نے ۲۴۰ء میں مروجہ عبرانی متن اور

[1] The Peshitta

سپٹواجنٹ کے ترجمہاور ایکولا، سمیکس اور تھیوڈوشن کے تراجم کو اور اپنے ترجمہ کو (جس میں اس نے سپٹواجنٹ ترجمہ کی نظر ثانی کی تھی) ایک ہی صفحہ میں ایک دوسرے کے مقابل سطوُر میں ترتیب وار لکھا تھا۔ ایسا کہ پہلی قطار میں اس نے عبرانی متن کو نقل کیا۔ اس کے مقابل دوسری قطار میں اس عبرانی متن کا یونانی حروف تہجی میں منتقل کیا۔ تیسری قطار میں ایکولا کے ترجمہ کو اور چوتھی قطار میں سمیکس کے ترجمہ کو نقل کیا۔ پانچویں قطار میں اس نے ترجمہ سبعینیہ کی نظر ثانی کرکے اس کو نقل کیا۔ چھٹی اور آخر قطار میں اس نے تھیوڈوشن کا ترجمہ نقل کیا۔ یہ عظیم الشان کام ۲۴۵ء میں ختم ہوا۔ یہ ضخیم نسخہ ارضِ مُقدس کے شہر قیصریہ میں رکھا گیا۔ جہاں مقُدس جیروم نے اس کا مطالعہ کیا تھا۔ جب عرب نے ۶۳۸ء میں ارضِ مقُدس کو فتح کیا تو اسکے بعد یہ قلمی نسخہ لاپتہ ہوگیا۔

اَوریجن نے ان مختلف تراجم کو مقابل سطور میں لکھا تاکہ ان کا مقابلہ کرکے ان کے اختلافات کو جانچے۔ اس کتاب کا نام ہکسپلا[1] ہے۔ یہ زبردست عالم اس نتیجہ پر پہنچا کہ باستثنائے چند الفاظ وآیات ان چاروں یونانی ترجموں کے عبرانی اصل میں اوراس کے زمانہ کے عبرانی متن میں فرق نہیں تھا۔ ناظرین اس مسیحی عالم کی محنت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ ہم کو یہ بھی بتلاتا ہے کہ اس کے اپنے زمانہ کے تمام عبرانی نسخہ جات قریباً لفظ بلفظ ایک دوسرے سے متفق تھے جس سے ہم پر یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ اہلِ یہود کس احتیاط سے نسخوں کو نقل کرتے تھے۔

قدیم لاطینی ترجمہ

کُتبِ عہدِ عتیق کا ایک ترجمہ یونانی سے لاطینی میں کیا گیا، جو اَوریجن کے نسخہ سے بھی زیادہ قدیم تھا۔ اس کی قدامت کی وجہ سے اس کو " قدیم " لاطینی ترجمہ کہتے ہیں۔ اس کا

[1] The Hexapla by Origen

مفصل ذکر ہم اس رسالہ کے حصہ دوم میں کریں گے۔ موجودہ زمانہ کے نسخوں میں یہ ترجمہ تمام کا تمام موجود نہیں ہے۔ گو اس کے متعدد حصے موجود ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۵۰ء کے قریب مسیحی کلیسیا میں مروج تھا اور سپرین[2] اس کا بہت استعمال کرکے اس کے متعدد حصوں کو اقتباسات کرتا ہے۔ جب ہم ان متعدد حصوں اور مقدس سپرین کے اقتباسات کا مقابلہ مروجہ عبرانی متن کے ساتھ کرتے ہیں تو ہم پر دونوں کی موافقت ظاہر ہوجاتی ہے۔

مُقدس جیروم کا لاطینی ترجمہ

مسیحی عالم جیروم[3] نے یہودی کُتبِ مُقدسہ کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ شخص عبرانی کا شہرہ آفاق عالم تھا اور اس کے استاد سرزمین کے کنعان کے یہودی مدرسوں میں تعلیم پا چکے تھے۔ پس ۳۸۲ء میں پوپ ڈیمے سس[4] نے اس کو حکم دیا کہ کُتبِ مُقدسہ کا ترجمہ عبرانی سے لاطینی زبان میں کرے۔ جیروم کا ایک استاد طبریاس کے مدرسہ کا عالم تھا جس نے عبرانی سے لاطینی میں ترجمہ کرنے میں اس کو مدد دی۔ پس مُقدس جیروم کو مستند کنعانی متن کے نسخے جو غالباً سیدنا مسیح کے زمانہ سے سینکڑوں برس پہلے کے تھے دستیاب بھی ہوسکتے تھے۔ یہ مسیحی عالم ترجمہ سبعینیہ (سپٹواجنٹ) میں چند غلطیاں نکالتا ہے اور بتلاتا ہے کہ فلاں فلاں جگہ یہ ترجمہ اصل عبرانی سے مختلف ہے اور جب ہم اس کے اصل عبرانی کے اقتباسات کو ملاحظہ کرتے ہیں تو ان کو موجودہ عبرانی متن کے موافق پاتے ہیں۔ وہ چند ایک عبرانی آیات کو لاطینی حروف میں نقل بھی کرتا ہے جس سے ہم پر ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس زمانہ کا تلفظ موجودہ اعراب کے مطابق تھا۔ اگرچہ اس زمانہ کے عبرانی نسخوں میں اعراب کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ ترجمہ ۳۹۲ء میں شروع ہوا اور ۴۰۵ میں اختتام کو پہنچا۔

[2] Cyprian

[3] Jerome

[4] Pope Damasus

مقُدس جیروم کالاطینی ترجمہ [1] (ولگیٹ) صدیوں سے صحیح اور مستند ترجمہ مانا گیا ہے اور چونکہ وہ کسی ترجمہ کا ترجمہ نہیں ہے ۔ بلکہ سرُیانی ترجمہ کی طرح سیدھا اور اصل عبرانی سے ترجمہ کیا گیا ہے ۔ لہذا نہایت اعلیٰ پایہ کا ہے یہاں تک کہ مقُدس آگسٹین [2] جیسا عالم بھی اپنے آخری دنوں میں اسی ترجمہ کو مستند مان کر استعمال کرنے لگ گیا تھا۔ اس ترجمہ کا قرونِ وسطیٰ میں بڑی قدرو منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا یہاں تک کہ بعض اشخاص سیپٹواجنٹ کی طرح اس ترجمہ کو بھی الہامی سمجھنے لگ گئے تھے۔ دَورِ حاضرہ میں بھی یہ ترجمہ رومی کلیسیا کی نظر میں نہایت مستند اور معتبر ترین ترجمہ ہے۔ اس کلیسیا نے دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کردیا ہے اور صرف اسی کے ترجموں کو مستند قرار دیا ہے۔ جب ہم اس لاطینی ترجمہ کا مقابلہ موجودہ عبرانی متن سے کرتے ہیں تو ہم پر یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ مستند کنعانی متن جس کا یہ ترجمہ ہے باستثنائے چند الفاظ وفقرات وآیات موجودہ عبرانی متن سے حرف بہ حرف متفق ہے۔

کنعانی متن کے مستند ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صدیوں سے ارضِ مقُدس کنعان کے ربیوں اور فقیہوں کا مستند متن تھا جو نہایت احتیاط سے صحت کے ساتھ نقل کیا کرتے تھے ۔ ان کو حکم تھا کہ نقل کرتے وقت نہ کسی حرف کو گھٹائیں اور نہ بڑھائیں ۔ یہودی مورخ یوسیفس بڑے فخر سے کہتا ہے کہ " یہ متن ایسا مستند ہے کہ تمام صدیوں میں کسی شخص کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ کتُبِ مقُدسہ میں الفاظ کو کم وبیش کرے یا تبدیل کردے۔" خواہ ان فقیہوں کو مجنوں اور دیوانہ کہو خواہ لفظ پرست کہو۔ خواہ ان کو عقیدہ کو (جو اہل اسلام کا سا ہے) کہ ان کی کتُبِ مقُدسہ کے ہر شوشہ میں پوشیدہ مطالب نہیں ہیں عقل کے خلاف قرار دو۔ لیکن ان کے ان جذبات وخیالات نے یہودی کتُبِ مقُدسہ کے اصل متن کو نہایت صحتِ کے ساتھ

[1] Vulgate

[2] Augustine

محفوظ رکھا ہے۔ اور ہم وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ موجودہ عبرانی متن باستثنائے چند الفاظ وفقرات وآیات بجنسہ وہی ہے جو ہزاروں سال پہلے موجود تھا۔

سیپٹواجنٹ کے نسخے

وادی قمران سے بعض دوسری اور تیسری صدی کے پارے دستیاب ہوئے ہیں جو یونانی ترجمہ سبعینیہ کے قدیم ترین نسخوں کے پارے ہیں۔ یہ پارے حضرت میکاہ، یونا، ناحوم، حبقوق، صفنیاہ، اور زکریا انبیائے سلف کی کتُب کے پارے ہیں۔ علمائُ نے اِن قدیم ترین یونانی نسخوں کے پاروں کے متن کا موجودہ سیپٹواجنٹ کے متن سے مقابلہ کرکے دونوں کے متنوں میں حیرت انگیز مطابقت پائی ہے۔ ان پاروں کی دستیابی سے بھی یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ترجمہ سبعینیہ نہ صرف قبل از مسیح اور سیدنا مسیح کے زمانوں میں اہلِ یہود میں مروج تھا بلکہ سیدنا مسیح کی ظفریاب قیامت کے بعد بھی ایک صدی سے زائد عرصہ تک قوم یہود میں مستعمل ہوتا رہا تھا اور کہ اس کا متن صدیوں تک یہودی حلقوں کے اندر اور باہر وقعت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ اہل یہود اس ترجمہ سبعینیہ کے اس قدر عاشق تھے اوران کی اس ترجمہ سے اس قدر لگن اور عقیدت تھی کہ ان میں یہ روایت جاری ہو گئی کہ اس کے مترجمین ملہم اشخاص تھے اور ترجمہ کے الفاظ الہام کئے گئے تھے لیکن جب مسیحی علماء نے اس ترجمہ کی بنا پر اپنے دلائل مبنی کرکے یہودی فضُلا کا ناک میں دم کردیا تو انہوں نے مبصداقً تنگ آمد بجنگ آمد" اس ترجمہ کے خلاف پراپگینڈا کیا اور ایکولا اور سمیکس کے ترجموں کو ترجیح دینے لگے۔

وادی قمران کے مذکورہ بالا نسخوں کے علاوہ ترجمہ سبعینیہ (سیپٹواجنٹ) کے نسخے جو تیسری ، چوتھی اور پانچویں صدی مسیحی (یعنی از ۲۰۰ ء تا ۴۰۰ء) کے ہیں ہم کو دستیاب ہوئے ہیں۔ ان یونانی نسخوں کا ذکر مفصل طور پر عہدِ جدید کی کتُب کی صحت کے تذکرہ میں کیا جائے گا ۔ یہ نسخے نہایت معتبر اور اعلیٰ درجہ کے مستند نسخے ہیں۔ حوادثِ زمانہ

کے ہاتھوں عہدِ عتیق کی کُتب کے بعض حصص ان نسخوں میں ضائع ہوگئے ہیں ، لیکن جو موجودہ ہیں وہ اس امر کو ثابت کردیتے ہیں کہ موجودہ عبرانی متن سوائے چند ایک اختلافات کے وہی ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے۔ مثلاً کوہ سینا کے نسخہ کے بہت سے اوراق ضائع ہوگئے ہیں، لیکن نسخہ سکندریہ میں عہدِ عتیق کی تمام کُتب محفوظ ہیں۔ نُسخہ ویٹی کن میں سے پیدائش کی کتاب کے پہلے چھیالیس باب اور زبور ۱۰۵ تا ۱۳۷ نہیں ہیں۔ لیکن باقی حصص من وعن محفوظ ہیں۔ علی ہذا القیاس دیگر نسخوں مثلاً افرائیمی سے بھی عہد عتیق کی کُتب کے بہت سے حصص ضائع ہوگئے ہیں لیکن باقیماندہ حصص کا موجودہ عبرانی مَتن سے جب مقابلہ کیا جاتا ہے تو یہ امر ہر محقق پرروشن ہوجاتا ہے کہ کُتبِ عہدِ عتیق میں کسی شخص نے عمداً تحریف کرنے کا ارتکاب نہیں کیا۔

مذکورہ بالا تین مشہور ومعروف نسخوں کے علاوہ گذشتہ چند سالوں میں چند قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں جو سیپٹواجنٹ کے جزو اور پارے ہیں۔ یہ پارے دوسری اور تیسری صدی مسیحی کے ہیں ۔ ان دریافتوں نے یونانی ترجمہ سیپٹواجنٹ کا تواتر اور تسلسل قائم کرکے اس وقفہ کو مٹادیا ہے جو اصل مترجمین سیپٹواجنٹ اور نسخہ سینا کے درمیان واقع تھا۔

ترجمہ پشتیہ کے علاوہ ایک اور سرُیانی ترجمہ کیا گیا ہے جو عبرانی متن کا ترجمہ نہیں تھا۔ بلکہ یونانی ترجمہ سبعینیہ کا ترجمہ تھا۔ ان تراجم کے علاوہ ، قبطی، افریقی، گاتھک، آرمینی اور عربی زبانوں میں بھی عہدِ عتیق کی کُتب کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ ان مختلف تراجم کا احوال ہم شرح اور بسط کے ساتھ اس رسالہ کے حصہ دوم میں کرینگے۔ یہاں پر عرض کردینا کافی ہے کہ محققین اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ ان تراجم میں اور موجودہ عبرانی متن میں ایسا اتفاق ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ خدا نے اپنی کُتبِ سماوی کو کس طرح محفوظ رکھا ہے۔

قرآن کی شہادت

تلمودی زمانہ کے آخر میں عبرانی کُتب مُقدسہ کے متن کے صحت کی شہادت ہمیں ایک ایسی جانب سے ملتی ہے جس کی ہم کو توقع نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اہلِ یہود کے دشمنوں نے دی ہے۔لہذا یہ شہادت بڑی زبردست شہادت ہے۔ اس شہادت کے سامنے صدیوں سے کروڑوں اشخاص سر بسجود رہے ہیں۔ ہمارا مطلب رسولِ عربی کی شہادت سے ہے جو قرآن میں مندرج ہے ۔ اہلِ یہود رسول عربی کے سخت دشمن تھے۔ یہودی ہمیشہ آپ کو ستاتے رہے۔ قرآن میں کئی دفعہ اہلِ یہود کو باغی اور سرکش کہا گیا ہے لیکن رسوعربی کی خدا ترسی اور راست روی نے ان کی کُتبِ مقُدسہ کو ہمیشہ تعظیم اور احترام کی نظر سے دیکھا۔ آپ ان کے تمام انبیاکے قائل رہے اور ان کی کُتبِ مقُدسہ کی شان میں بہترین اورپاک ترین الفاظ کو ہی استعمال کرتے رہے۔ مشتے نمونہ ازخروارے مثال کے طور پر ذیل کی چند آیات ملاحظہ ہوں:

"کتابِ موسیٰ امام اور رحمت ہے۔" (احقاف) اس میں " صاف نشانیاں موجود " ہیں ۔وہ نور دینے والی کتاب" ہے (فاطر)۔ وہ " کتاب راہ دکھلانے والی اور سمجھ والوں کو یاد دلانے والی " ہے (مومن) وہ " کتاب جوموسیٰ لایا لوگوں کی روشنی اورہدایت " ہے(انعام)وہ" احسن بات پر کامل ہے اور ہرشے کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت ہے"(انعام)۔" وہ بنی نوع انسان کے لئے بصیرت اور ہدایت اور رحمت ہے"(قصص)"موسیٰ اور ہارون کے فرقان میں روشنی اور نصیحت خدا پرستوں کے واسطے ہے۔"(انبیاء) وغیرہ وغیرہ۔ تفصیل کے لئے ناظرین ضمیمہ ملاحظہ کریں۔

عبرانی کُتبِ مقُدسہ کے متن کے نقل کرنے والوں اور اُستادوں کی شان میں قرآن عربی ذیل کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔"بیشک ہم (ہی) نے توریت نازل کی جس میں (ہرطرح کی)ہدایت اور نورِ (ایمان) ہے ۔ خدا کے فرمانبردار (بندے) انبیاء۔(بنی اسرائیل) اسی کےمطابق یہودیوں کو حکم دیتے چلے آئے ہیں اور (انبیا کے علاوہ یہودیوں

کے) ربی (یعنی مشائخ) اور علماء (بھی) کیونکہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور (وہ) اس کی محافظت کرتے بھی رہے۔" (مائدہ ترجمہ نذیر احمد) اس آیت کے متعلق بیضاوی لکھتا ہے ۔ ومھمنا علیہ ورقیباً علی سائر الکتب یحفظہ عن التغیر ویشھد ھا بالصحۃ والثبات یعنی اور اس پر محافظ کلُ کُتُب ربانی کا جو محفوظ رکھتا ہے ۔ان کی تغیر سے اور شہادت دیتا ہے ان کی صحت اور ثبات پر۔"

قرآن عربی میں دو جگہ عبرانی کُتُبِ مقدُسہ کے الفاظ نقل ہوئے ۔ اول "ہم نے زبور میں لکھا ہے کہ میرے بندگانِ صالح زمین کے وارث ہونگے ۔"(انبیاء) اور دوم۔" اور ہم نے تورات میں یہود کو تحریری حکم دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ "(مائدہ) جب ہم اِن دوآیات کا مقابلہ زبور ۳۷: ۲۹ اور خروج ۲۱: ۲۴ ، احبار ۲۴: ۲۰ ۔استثنا ۱۹: ۲۱ اورمتی ۵: ۳۸ سے کرتے ہیں تو ان کُتُبِ مُقدسہ کی صحت میں چون وچرا کی مطلق گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اتقان نوع ۱۹ میں لکھا ہے " ابن ابی حاتم نے قتادہ سے روایت ہے کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم یہ کہا کرتے تھے کہ زبور میں ایک سو پچاس سورتیں ہیں، جو سب کی سب مواعظہ اور ثنا میں ہیں اوران میں حلال وحرام اور فرائض اور حدود (یعنی سزاؤں) کا کہیں ذکر بھی نہیں اور لوگوں نے بیان کیا کہ سورت کا نام سورۃ الامثال ہے" کیا یہ بیان کتاب زبور کے مضامین اور امثال پر لفظ بلفظ صادق نہیں آتا۔ پس قرآن وحدیث کُتُبِ عہد عتیق وجدید کی صحت کے شاہد ہیں ۔یہی وجہ تھی کہ قرآن خود اپنی صداقت کی تائید میں ان کتب کے مصدق ہونے کا بار بار دعویٰ کرتا ہے۔اہلِ کتاب کے لئے قرآن اور رسول عربی کے پاس صرف یہی ایک دلیل تھی اوریہی وجہ تھی کہ رسولِ عربی اپنی اُمت کو حکم دیتے ہیں کہ (مسلمانو، تم یہود اور نصاریٰ کو یہ)کہو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور قرآن جو ہم پر اترا، اور صحیفے)جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب پر اترے (ان پر) اور موسیٰ اور عیسیٰ کو (جو

کتاب) ملی (اس پر)۔ اور جو دوسرے)۔پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملا(اس پر۔ ہم ان پیغمبروں) میں سے کسی ایک میں بھی (کسی طرح کی)جدائی نہیں سمجھتے اورہم اسی (ایک خدا) کے فرمانبردار ہیں۔" بقر۔ ترجمہ نذیر احمد)اور رسولِ عربی نے اپنی اُمت کو تنبیہ کی اورکہا " مسلمانو ! اللہ پر ایمان لاؤ اوراس کےرسول (محمد) پر اوراس کتاب (قرآن) پر جو اس نے اپنےرسول (محمد) پر اتاری ہے۔ اور اُن کتابوں پر جو (قرآن سے) پہلے دوسرے پیغمبروں پر) اتاریں اور جو شخص اللہ کا منکر ہوا اور اس کے فرشتوں کا اوراس کی کتابوں کا اوراس کے رسولوں کا اور روزِ آخرت کا تو وہ (راہ راست سے) بڑی دور بھٹک گیا۔"(نساء۔ ترجمہ نذیر احمد)

رسولِ عربی یہودی ربیوں اور فقیہوں کو ایسا ثقہ راوی خیال کرتے تھے ، کہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے اپنی اُمت کو حکم دیا تھا کہ جو یہودی ربی اور استاد تعلیم دیں اور روایت کریں ان کو نقل کریں اور دوسروں تک پہنچائیں ۔

(مشارق الانوار ۱۸۹۷ء)

کہاں قرآن شریف کی یہ شہادت اور حضرت رسولِ عربی کا یہ قول اورکہاں علمائے اسلام کا بے بنیاد اور خلافِ واقعہ قول کہ " تورات یہودیوں کی عدم احتیاط اغراضِ ذاتی اورزمانہ کے انقلابات سے سرتا پا مسخ ہو گئی ہے۔" اور خصوصاً پیغمبر خاتم کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں یہود کےدستِ تصرف نے ان کو بالکل برباد کردیا ہے۔(شبلی نعمانی سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۲۷)۔

ع به بیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

مسئلہ تحریف کے موضوع کو مکمل کرنے کی خاطر ہم نے اس کتاب کے ضمیمہ میں قرآنی زاویہ نگاہ سے اس خار دار سوال پر مرحوم مسٹر اکبر مسیح کی مفصل بحث درج کی ہے۔ لہذا ہم یہاں ناظرین کی توجہ اس ضمیمہ کی جانب مبذول کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

نتیجہ

پس مختلف جوانب سے یعنی یہودی مدرسوں ، مسیحی مصنفوں اور اسلامی کُتب سے یہی ایک صدا سنائی دیتی ہے کہ عبرانی کُتبِ سماوی درحقیقت وہی ہیں جو انبیاء اللہ پر نازل ہوئی تھیں اور مختلف ادوار میں نہایت صحت کے ساتھ نقل ہوتی چلی آئی ہیں۔

باب ہفتم

دَورِ چہارم

مَسُوراہی زمانہ

(از ۶۰۰ء تا ۱۵۰۰ء)

مَسُورہ

ہم نے سطورِ بالا میں دیکھا ہے کہ حضرت عزرا کے زمانہ اور تلمودی زمانہ میں صحیح قراتوں کی نسبت ایسی روایات موجود تھیں جو یہودی ربیوں اور فقیہوں میں پشت در پشت اور سینہ چلی آتی تھیں۔ تلمودی زمانہ کے آخر میں اہلِ یہود کے قومی اور ملی حالات نے ان کو مجبور کیا کہ ان روایات کو احاطہ تحریر میں لے آئیں ۔ یوں تحریر "مسورہ[1]" (بمعنی روایت) کی ابتدائی ہوئی۔ جن اشخاص نے ان صحیح قراتوں کو جمع اور ترتیب دے کر لکھا ان کو "مسوراہی" یعنی رواۃ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اوران کے صحیح متن کا نام "مسوراہی متن" ہے۔ یہ وہی عالم اور فاضل اشخاص تھے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔ والربانیون ولاجار بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانو علیہ شھدا ۔ یعنی ربی اور علماء جو کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور وہ اس کی محافظت کرتے بھی رہے (سورہ مائدہ ع ۷) ان مسوراہی علماء اور فقیہوں نے قدیم زمانہ کہ مختلف نسخہ جات کو فراہم کرکے ان کا باریک اور تنقیدی نگاہ سے مطالعہ کیا۔ اوراس فن کو کمال تک پہنچادیا ۔ وہ عبرانی زبان اوراس کی

---

[1] Massora.

صرف و نحو۔ اور عبرانی کُتبِ مقدسہ اوران کے علم التفسیر کے ماہر تھے۔ انہی فقہا نے عبرانی زبان کے اعراب ایجاد کئے اور مستند تلفظ کے مطابق حروف وسکنات کو مقرر کیا۔

مسوراہی علماء " سوفوریم [1] " کے جانشین تھے اور کُتبِ مقُدسہ کے متن کی ایک ہزار سال تک حفاظت کرتے رہے۔ وہ گویا" موسیٰ کی گدی " پر بیٹھ کر ان کُتب کے ایک ایک "لفظ اور شوشہ " (متی ۵: ۱۸) کی دیکھ بھال میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ ان علماء میں سب سے زیادہ ہارون بن آشر کا نام ہے جو ۹۲۵ء میں تھا۔ اس عالم کا خاندان اس سے پہلے پانچ پشتوں سے عبرانی متن کے ایک ایک حرف کا قدیم نسخوں کے متن کا غوروتدبر کے ساتھ نہایت جانفشانی سے غائر مطالعہ کرتا چلاآیا تھا تاکہ صحیح ترین متن کہ جس کا ایک ایک نقطہ اور شوشہ صحیح ہو تلاش کرکے لکھا جائے۔ چھ پشتوں کے مطالعہ کے بعد ہارون کے زمانہ میں یہ مبارک کام سرانجام پایا۔ ان چھ پشتوں کی مساعئی جمیلہ کا متن اب ملک اسرائیل میں محفوظ ہے۔

یہ معیاری متن نہایت کاوش کے بعد قائم کیا گیا۔ اس متن کی صحت ایسی بے مثال ہے کہ اب جو وادی قمران کے طومار دستیاب ہوئے ہیں (جوہارون بن آشر سے صدیوں پیشتر زیرِ زمین مدفون پڑے تھے) اورجن کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس لئے حقیقت آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو گئی ہے کہ ان مسوراہی علماُ کے متن میں وادی قمران کے نسخوں کے متن میں کلی مطابقت پائی جاتی ہے۔

مسوراہی علماء کے دو بڑے فریق تھے۔ ایک فریق بابلون میں تھا جو صدیوں سے یہودی علم وفضل کا مرکز تھا۔ دوسرا فریق کنعان میں تھا جس کا مرکز طبریاس تھاجہاں مسورہ کا مطالعہ صدیوں تک جاری رہا۔ عبرانی کُتبِ مقُدسہ کے مطالعہ میں دونوں فریق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ دونوں کی قراتوں میں چند ایک اختلافات تھے جو نہایت باریک تھے۔

اور جو" مشرقی اور مغربی" قرائتیں کہلاتی ہیں۔ لیکن یہ اختلافات ایسے معمولی قسم کے تھے کہ ان سے کسی لفظ کے معنی میں فرق نہیں پڑتا تھا، ناظرین خودہی دیکھ سکتے ہیں کہ جب یہ علما خفیف سے خفیف اختلافات پر(جن سے کسی لفظ کے معنی میں فرق نہیں پڑتا تھا) اس قدر زور دیتے تھے تو وہ بھلا عبرانی کُتبِ مقدُسہ کے متن کی صحت کے کس قدر عاشق اور دلدادہ نہ ہوں گے ؟ ربی عقیبہ کا قول ہے کہ " مسوراہ کُتبِ مقُدسہ کی صحت کی محافظ ہے" اور یہی قرآن کا قول بھی ہے جوہم سورہ مائدہ ع ے سے اوپر نقل کرآئے ہیں۔

مسوراہی علماء مختلف عبرانی کُتبِ سماوی کے ابواب ، آیات ، الفاظ ، حروف ، اعراب وغیرہ پر نہایت مبسوط طور پر نظر کرتے تھے ۔ مثلاً ان فقہا نے شریعت کے تمام احکام کا شمار کرکے بتلایا ہے کہ وہ تعداد میں چھ سو تیرہ ہیں۔ انہوں نے مختلف نسخہ جات کا مقابلہ کرکے جہاں کہیں کتابت کی غلطیاں دیکھیں درست کردیں، اورجہاں کہیں الفاظ کا ادل بدل پایا، یا غیر معمولی الفاظ کو دیکھا تو ان کو قلم بند کرکے ان کا خالص لحاظ رکھا۔ انہوں نے اختلافِ قرات کا خیال رکھ کر اس کو بھی قلم بند کیا۔ لیکن خاص عبرانی متن میں کسی دوسری قرات کوجگہ نہ دی۔ بلکہ جس قرات کووہ درست یا بہتر خیال کرتے تھے۔ وہ اس کو حاشیہ میں لکھ دیتے تھے۔ اس حاشیہ کی قرات کووہ " قری" (یعنی پڑھنا) کہتے تھے، اورمتن کی قرات کو "کتب" (یعنی لکھی ہوئی) کہتے تھے۔ یوں قراتوں کو الگ رکھ کر، پڑھتے وقت وہ حاشیہ کی قرات پڑھتے تھے۔ لیکن نقل کرتے وقت وہ صرف متن کی قرات کوہی متن میں جگہ دیتے تھے۔ ان مسوراہی فقہاء نے اس کام کو ایسی تن دہی، جاں فشانی اور عرق ریزی سے سر انجام دیا کہ انہوں نے عبرانی کُتبِ مقُدسہ کی مختلف کتابوں اور اُن کتابوں کے مختلف حصوں کی آیات اور الفاظ کی تعداد شمار کرنے پرہی قناعت نہ کی بلکہ ہر ایک کتاب کے حروُف تک گن ڈالے اور ان اعداد کو حفظ کرنے کے لئے اشعار بنائے جن کو وہ زبانی یاد کرلیتے تھے۔ وہ یہ بتا سکتے تھے کہ فلاں لفظ کتنی مرتبہ کس کس کتاب کی آیات کے شروع

---

[1] اہلِ یہود کی کتاب تلمود میں لکھا ہے کہ کُتبِ مقدسہ کے کاتبوں " کوسوفوریم" کا نام دیا گیا تھا کیونکہ وہ تورات شریف کے ایک ایک حرف کا شمار کیا کرتے تھے (Qiddushin 30a)

درمیان، یا آخر میں مستعمل ہوا ہے۔ وہ مختلف کتابوں کی درمیانی آیت، درمیانی لفظ اور درمیانی حرف تک کا حساب رکھتے تھے۔

ابتدا میں مسوراہ علیحدہ کتابوں میں تحریر کیا جاتا اور فقہا ان کتابوں کا استعمال درس کے وقت کیا کرتے تھے لیکن بعد میں وہ عہدِ عتیق کے نسخوں کے حاشیہ میں ذیلی حواشی کے طور پر لکھا جاتا تھا۔ مسوراہی فقہا بالخصوص دو امور کا خیال رکھتے تھے۔ اول یہ کہ نسخوں کی کتابت میں کیا لکھا ہے۔ دوم یہ کہ صحیح قرات کیا ہونی چاہیے۔

مسوراہی فقہا ان الفاظ اور حروف کا جو کُتبِ مقُدسہ میں تھے خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں کُتبِ مُقدسہ کا ایک ایک حرف اور شوشہ پاک اور نہانی اسرار سے پُر تھا۔ انہوں نے بڑی محنت اور کاوش سے ایک ایک حرف گنا اور یوں یہ معلوم کیا کہ احبار ۱۱: ۴۲ کے عبرانی لفظ کا واؤ تورات شریف کے تمام حروف کا درمیانی حرف ہے اور احبار ۱۰: ۱۶ کا عبرانی لفظ جس کا اردو ترجمہ " بہت تلاش کیا " ہے تورات شریف کا درمیانی لفظ ہے۔ احبار ۳: ۳۳ تورات شریف کی درمیانی آیت ہے۔ زبور ۷۸ : ۳۸ کتابِ زبور کی درمیانی آیت ہے اور زبور ۸۰: ۱۴ کا حرف عین اس کتاب کا درمیانی حرف ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انہوں نے تمام کُتب کے الفاظ حروف اور آیات کو شمار کرکے ان کے لئے علامات اور نشانات مقرر کئے ۔ مثلاً پیدائش کی کتاب کے حصہ " ہیرشتھ" میں ۱۴۶ آیات ہیں۔ لہذا انہوں نے اس حصہ کا نام " عمیزیاح" رکھا کیونکہ ان حروف کی تعداد ابجد کے لحاظ سے ۱۴۶ ہوتی ہے۔

اِن مسوراہی فقہا نے عبرانی کُتبِ مقُدسہ کے حروف کو شمار کرکے ہمیں یہ بھی بتلایا ہے کہ فلاں حرف کتنی دفعہ تمام کُتبِ مُقدسہ میں استعمال کیا گیا ہے ۔ مثلاً حرف، " الف" بیالیس ہزار تین سو ستتر (۴۲۳۷۷) مرتبہ اور حرف " ب " پینتیس ہزار دو سو اٹھارہ (۳۵۲۱۸) مرتبہ کُتبِ مقُدسہ میں مستعمل ہوا ہے اور اس بات کو یاد کرنے کے لئے فلاں حرف کتنی مرتبہ مستعمل ہوا ہے انہوں نے اشعار بنائے اور ان کو حفظ کیا۔ مثلاً اس بات کو یاد کرنے کے لئے حرف " الف" ۴۲۳۷۷ دفعہ کتبِ مقُدسہ میں لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے عبرانی میں شعر بنائے جن کے ابتدائی حروف کی میزان بحساب ابجد ۴۲۳۷۷ ہوتے ہیں اور مباداشعر کسی کو فراموش ہوجائے ۔ انہوں نے یاد دہانی کی خاطر اس شعر کے ساتھ ہی دو آیات بھی لکھ دیں ، یعنی نحمیاہ ۷: ۶۶ اور گنتی ۷: ۱۷ جو حسب ذیل ہیں ۔" ساری جماعت کے لوگ سب کے سب مل کے بیالیس ہزار تین سو ساٹھ تھے" اور سلامتی کی قربانی کے لئے دو بیل ، پانچ مینڈھے اور پانچ بکرے ، پانچ برے ۔" ان دونوں آیات کے اعداد کو جمع کریں تو میزان ۴۲۳۷۷ ہوتی ہے۔ اسی طرح عبرانی حروف تہجی کے ہر حرف کے لئے اشعار اور آیات مقرر تھیں۔ اس طریقہ سے ان مسوراہی فقہا نے کُتبِ مقُدسہ کے الفاظ اور حروف کو محفوظ رکھا اور عبرانی متن کو حتی المقدور غلطیوں سے اور ہر قسم کی لغزشوں سے پاک رکھا۔

علاوہ ازیں یہ مسوراہی فقہا نے بعض الفاظ پر علامات اور نشانات لگا کر حاشیہ میں ان پر نوٹ لکھ دیا کرتے تھے مثلاً اگر کوئی لفظ صرف ایک ہی جگہ کُتبِ مُقدسہ میں مستعمل ہوتا تو وہ نوٹ میں الفاظ" اور کہیں پایا نہیں جاتا" درج کردیتے تھے۔ اگر وہ سات مرتبہ مستعمل ہوتا وہ الفاظ " یہ لفظ سات مرتبہ وارد ہوا ہے۔" تحریر کرکے ساتھ ہی حوالے بھی لکھ دیتے تھے۔ ان کے چند ایک نوٹ ملاحظہ ہوں ۔

"تورات شریف میں دو آیات حرف " م " سے شروع ہوتی ہیں " تورات شریف میں گیارہ آیات حرف" ن " سے شروع اور ختم ہوتی ہیں۔" آٹھ الفاظ جن کے آخر میں واؤ ہے حرف ھ کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ چودہ الفاظ جن کے آخر میں ھ ہے واؤ کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ ۔ بخوف طوالت ہم زیادہ مثالیں دینے سے معذور ہیں۔ لیکن ان کی

باریک بین نظر ہم کو یہ بھی بتادیتی ہے کہ فلاں فلاں فعل فلاں فلاں اسم کے ساتھ متعلق ہے۔" فلاں فلاں لفظ کے فلاں جگہ پر فلاں معنی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہم ان فقہا کے نوٹ کی ایک اور مثال دیتے ہیں تاکہ ناظرین مسئلہ تحریف کا خود فصیلہ کرلیں اور معلوم کرسکیں کہ فقہا کیسی ایمانداری، خلوصِ نیت، محنت، جانفشانی، اور خدا ترسی سے اپنی کُتبِ مقُدسہ کی صحت کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ یشوع ۹: ۱ میں ہے۔" جب ان سب بادشاہوں نے جو یردن کے اس پار (یعنی) حتی اور عموری، کنعانی، فرزی، حوی اور یبوسی تھے سنا۔" اس کی آیہ شریفہ میں چھ بادشاہوں کے نام ہیں۔ لیکن حرفِ عطف " اور" صرف دوجگہ یعنی دوسرے اور چھٹے بادشاہ کے نام کے پہلے آیا ہے۔ اب ان فقہا کے دل میں یہ خیال آیا کہ شاید کوئی کاتب نقل کرتے وقت حرفِ عطف کو رفع کرنے کے لئے حاشیہ میں الفاظ " بادشاہوں کے لئے سونا" لکھ دیئے اور گنتی ۱۳: ۳۲ کا حوالہ دے دیا۔ جہاں یہ لکھا ہے " فقط" سونا اور روپا، پیتل، لوہا، رانگا اور سیسہ " یہاں پر بھی چھ نام ہیں اور حرفِ عطف " اور" صرف دوجگہ یعنی دوسرے اور چھٹے نام سے پہلے واقع ہوا ہے۔ لہذا کاتب اس آیت کو دیکھ کر حرفِ عطف کی ٹھیک جگہ کو معلوم کرسکتا تھا اور یوں لغزش سے بچ سکتا تھا۔

ہم یہاں ایک اور مثال دیتے ہیں جس سے ناظرین پر واضح ہوجائے گا کہ عبرانی کُتبِ مقُدسہ کے نقل کرنے میں یہ فقہا کس قدر احتیاط کو کام میں لاتے تھے۔ عبارت خانوں کے نسخے حاصل احتیاط کے ساتھ نقل کئے جاتے تھے۔ نقل کرنے والوں کو حکم تھا کہ وہ قدیم اور صحیح ترین نسخوں سے نقل کریں اور صرف خالص سیاہ روشنائی کا استعمال کریں جو شہد، کوئلہ اور کاجل سے بنی ہوتی تھی۔ یہ نسخے صرف ایسے حیوانات کے چمڑوں پر لکھے جاتے تھے جو حلال اور پاکیزہ تھے۔ نقل کرنے والوں کو حافظہ سے کسی ایک لفظ، حرف یا شوشہ کو نقل کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ ان کو ہدایت تھی کہ ایک ایک لفظ کو دیکھ کر لکھیں اور لکھنے سے پہلے اس کو پڑھیں۔ جب خدا کے نام لکھنے لگے تو پہلے دعا مانگیں اور ان اسماء کو لکھنے سے پہلے اپنے قلم کو دھو کر خوب صاف کریں۔ بالخصوص یہوواہ (جواہل یہود کی نظر میں خدا کا خاص نام تھا) لکھنے سے پہلے وہ غسل کریں۔

ہزار بار بشوئم وہن بشک وگلاب
ہنوز نام تو بردن کمال بے ادبی است

یہ حکم تھا کہ حرف کے درمیان نقل کرنے والے صرف بال برابر جگہ چھوڑیں اور الفاظ کے درمیان ایک چھوٹے حرف کے برابر جگہ چھوڑیں۔ ہر پیرا گراف کے بعد (۹) نو حروف کی جگہ چھوڑ کر نیا پیرا گراف لکھیں۔ ہر کتاب کے خاتمہ کے بعد تین سطریں چھوڑدی جائیں اور پھر دوسری کتاب لکھنی شروع کی جائے۔ جب تورات شریف کی آخری کتاب استثنا کی نقل ختم ہونے پر آئے تو اس کے آخری الفاظ اس طور پر نقل کئے جائیں کہ آخری سطر ختم ہوجائے۔ نقل کرنے والا کاتب پورا یہودی لباس زیب تن کرکے نقل کرے۔ ہر نسخہ کی جانچ پڑتال، لکھے جانے کے تیرہ دن کے اندر اندر اچھی طرح سے کی جائے اور اگر کسی نسخہ میں دو سے زیادہ غلطیاں ہوں تو اس نسخہ کو زیرِ زمین دفن کردیا جائے۔ اسی قسم کے بیسیوں دیگر احکام تھے جن کو ہم بخوفِ طوالت نقل نہیں کرتے۔ ان تمام احکام (اور بالخصوص آخری حکم) کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبرانی کُتبِ مقُدسہ کے نسخے مقابلتاً کم دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کتابوں کے الفاظ اور حروف نہایت صحت اور احتیاط کے ساتھ نقل ہوتے تھے۔

ان چند مثالوں سے ہم اندازہ لگاسکتے ہیں کہ کس محنت، عرقریزی اور خدا ترسی سے ان مسوراہی فقہا نے اپنی کُتبِ مقُدسہ کے الفاظ اور حروف کو محفوظ رکھا۔ بعض اوقات انہوں نے اپنے نسخوں میں نقل کرنے والوں کی کتابت کی غلطیاں بھی پائیں لیکن وہ ایسے خدا ترس واقع ہوئے تھے اور کُتبِ سماوی کے مقُدس حرُوف کے لئے ان کے دل میں اتنی وقعت تھی کہ غلطیاں معلوم کرنے پر بھی انہوں نے متن کے غلط الفاظ کو صحیح نہ کیا، بلکہ صرف حاشیہ میں

ذیلی حواشی کے طور پر صحیح الفاظ تحریر کرکے صحیح قرات کو بحال کردیا۔ مثلاً بعض اوقات نقل کرتے وقت ایک ہی غلطی سے دوبارہ لکھا جاتا ہے۔ اس غلطی کو رفع کرنے کے لئے یہ فقہا اس لفظ پر نشان لگا کر حاشیہ میں ذیل کے الفاظ لکھ دیتے تھے " کتابت میں آیا ہے، لیکن قرات میں نہیں" یعنی اگرچہ یہ لفظ لکھا گیا ہے تاہم ۔ اس کو پڑھنا نہیں چاہیے ۔ مثلاً یرمیاہ ۵۱: ۳ میں الفاظ " جو کمان کھینچتا" عبرانی متن میں دوبارہ لکھے گئے اور اس عبرانی لفظ پر مسوراہی فقہا نے ذیل کا نوٹ دیا ہے۔" کتابت میں آیا ہے لیکن قرات میں نہیں۔" یہ فقہا ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ کُتبِ مقُدسہ میں کل آٹھ ایسے الفاظ ہیں جو دوبارہ لکھے گئے ہیں اور وہ ان کے حوالے بھی دیتے ہیں۔

عبرانی کُتبِ مقدُسہ کے نقل کرنے والے کاتب اس قدر کاوش دیانت اور ایمان داری سے نقل کرتے تھے کہ اگر ان کے پیش نظر نسخہ میں کسی لفظ کا کوئی حرف بڑا اور باقی حروف چھوٹے لکھے ہوتے تو وہ ان کو بجنسہ نقل کردیتے تھے یا اگر کسی لفظ کا کوئی حرف نسخہ میں سطر سے باہر لکھا ہوتا تو وہ نقل کرتے وقت اس سطر کے الفاظ کو اس طرح لکھتے کہ وہ خاص حرف سے سطر سے اتنا ہی باہر لکھا جاتا جتنا اُن کے پیشِ نظر نسخہ میں ہوتا تھا۔ اگر کسی نسخہ میں ان کو تحریر کی کوئی اور بے قاعدگی نظر آتی تو وہ اس کو درست کرنے کی بجائے بجنسہ ویسا ہی لکھ دیا کرتے تھے۔

بعض اوقات نقل کرتے وقت کاتبوں سے کوئی لفظ رہ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان فقہا کو یہ جرات نہ ہوئی کہ اس لفظ کو متن میں درج کریں۔ لہذٰا انہوں نے متن میں اس لفظ کی جگہ خالی چھوڑ کر اس کو حاشیہ میں لکھ دیا اور ذیل کا نوٹ دے دیا۔" قرات میں آیا ہے کتابت میں نہیں" یعنی گویہ لفظ لکھا نہیں گیا لیکن اس کو پڑھنا چاہیے۔ مثلاً ۲ سموئیل ۸: ۳ میں لفظ "فرات" کاتب کی غلطی سے رہ گیا تھا۔ ان کاتبوں کی دیانت داری اور حزم واحتیاط کی یہ ادنیٰ مثال ہے کہ انہوں نے اس آیت کو نقل کرتے وقت لفظ" نہر" کے بعد لفظ" فرات" نقل نہ کیا بلکہ لفظ" نہر" کے بعد لفظ" فرات" کی جگہ خالی چھوڑ کر اس کو حاشیہ میں لکھ دیا اور ساتھ ہی نوٹ دے دیا۔" قرات میں آیا ہے لیکن کتابت میں نہیں۔" یہ فقہا ہم کو بتاتے ہیں کہ کُتبِ عہدِ عتیق میں کل دس ایسے الفاظ ہیں اور ان کے حوالے بھی دیتے ہیں۔

پس ان مسوراہی فقہا نے نہ صرف متن کے الفاظ کی ہی نگہداشت کی اور ان کو صحت کے ساتھ نقل کیا بلکہ صحیح قراتوں کو بھی مختلف اور قدیم نسخوں کا مقابلہ کرکے بہم پہنچایا اور ساتھ ہی انہوں نے یہ دانشمندی کی کہ ان الفاظ کو جو ان کے خیال میں صحیح تھے متن جگہ نہ دی بلکہ حاشیہ تک ہی محدود رکھا ۔ انگریزی ترجمہ کی نظر ثانی کرنے والوں نے عموماً ان الفاظ کو جو حاشیہ میں تھے صحیح قرات ہونے کی بجائے غلط قرار دیا ہے اور متن کے الفاظ کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ گو بعض اوقات ان حاشیہ کی قراتوں کو انہوں نے صحیح بھی مانا ہے ۔ اردو ترجمہ کی نظر ثانی کرنے والوں کا (جن میں اس کتاب کا مولف بھی شامل تھا) بھی یہی طریق عمل تھا ۔ وہ بھی یہ خیال کرتے تھے کہ عموماً متن کے الفاظ حاشیہ کے الفاظ کی نسبت زیادہ صحیح ہیں۔

اعراب کی ایجاد

مسیحی کلیسیا کی دیکھا دیکھی مسوراہی فقہا نے چھٹی اور آٹھویں صدی کے درمیان شامی مسیحی کلیسیا کی دیکھا دیکھی حروفِ علت وحرکت اور صوت اور چھوٹے بڑے اعراب کو ایجاد کرکے عبرانی کُتبِ سماوی کے الفاظ کے اس تلفظ جو قدیم زمانہ سے اہلِ یہود میں سینہ بسینہ چلاآتا تھا ہمیشہ کے لئے قائم اور برقرار کردیا۔ یہی اعراب اس زمانہ کے تمام نسخوں میں موجود ہیں۔ ان اعراب کے وجود کی وجہ سے ہم عبرانی کے مختلف الفاظ اور ہمشکل الفاظ کے تلفظ اور ہم آواز الفاظ کے معانی میں تمیز کرسکتے ہیں۔ ان فقہا نے مختلف الفاظ پر وقف اور لہجہ کی علامات بھی لگائیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم عبرانی الفاظ کا تلفظ اہلِ یہود کی اس قدیم طرز پر کرسکتے ہیں جو سیدنا مسیح سے صدیوں پہلے علماء اسرائیل میں رائج تھی اور عبارت کو اسی لب

ولہجہ اور توقف کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں جس طرح قدیم فقہا پڑھا کرتے تھے ۔ ان مسوراہی علماء کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ چھپے ہوئے عبرانی نسخوں میں وہ متن محفوظ ہے جو ہمارے مبارک مولاکے زمانہ میں مروج تھا۔ ایک مستند مصنف [1] لکھتا ہے کہ جو موجودہ عبرانی نسخے ہمارے ہاتھوں میں ہیں وہ اس نسخہ کی نقل ہیں جو قیصر ہیڈرئین، Hadrian(از ۱۰۲ء تا ۱۰۷ء) کے زمانہ میں لکھا گیا تھا۔ جب اس نے اہلِ یہود کو ایذائیں دی تھیں ۔ علماء کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ مسوراہی متن کم ازکم اس زمانہ سے متعلق ہے۔

مسوراہی کوششوں کے نتائج

بلآخر اہلِ اسلام اور قبائلِ عرب کے حملوں نے اہلِ یہود کو ارضِ پاک کنعان سے نکال دیا اور ان کے ملک بدر ہونے سے اس مسوارہی زمانہ کا اختتام ہوگیا۔اس زمانہ کے اختتام کے وقت فقیہہ اعظم ہارون بن آمشر طبریاس کے یہودی دارالعلوم کا پرنسپل تھا اور یعقوب بن نفتالی بابل کے یہودی مدرسہ کا پرنسپل تھا۔ ان دونوں مسلم الثبوت استادوں نے حتی المقدور کوشش کی کہ ان کے مدرسہ کے نسخہ جات ہر قسم کی غلطیوں اور لغزشوں سے پاک ہوں اور انہی نسخہ جات (۹۸۹ء) سے موجودہ عبرانی متن نقل کیا گیا ہے اور موجودہ نسخہ جات ایک ایک حرف شوشہ اور نقطہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متفق ہیں ۔ کیا کوئی سلیم الطبع شخص اس سے زیادہ صحت کی توقع کرسکتا ہے۔

پس ثابت ہوگیا کہ یہودی فقہا کُتبِ سماوی کو نقل کرتے وقت ہر طرح کی احتیاط کو کام میں لاتے تھے۔جہاں تک ان سے بن پڑا انہوں نے ابتدائی زمانہ سے ہی حتی المقدور یہ کوشش کی کہ ان کی کُتبِ سماوی ہر طرح کی انسانی آلائش اور لغزش اور سہوسے پاک رہے۔ مثل مشہور ہے کہ لیس للانسان الاما سعیٰ ۔ ان کُتب کی قدامت اور ضخامت کے سبب متعدد الفاظ ، فقرات اور آیات کا اختلاف ان میں باقی رہا ہے۔ لیکن یہ اختلافات نہایت معمولی قسم کے ہیں اور ایسے اہم نہیں کہ کوئی صحیح العقل شخص ان کی وجہ سے عبرانی کُتبِ سماوی کو محرف گردان سکے یا ان کو پایہ اعتبار سے ساقط خیال کرسکے ۔علاوہ ازیں مختلف زمانوں اور ملکوں کے نسخہ جات اور مختلف زبانوں سے ساقط خیال کرسکے ۔علاوہ ازیں مختلف زمانوں اور ملکوں کے نسخہ جات اور مختلف زبانوں کے تراجم کی مدد سے ہم اصول تنقید کے ذریعے آسانی سے یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ان مختلف قراتوں میں سے جو مختلف نسخوں میں ہم کو ملتی ہیں کونسی قرات صحیح ہے۔ اس مطلب کے لئے تمام تراجم اور بالخصوص وہ تراجم جو قدیم ترین ہیں نہایت کارآمد ہیں ۔ ہم مختلف نسخوں کے اختلافات کا یونانی ترجمہ سبعینیہ اور سریانی ترجمہ پشیتہ اورلاطینی ترجمہ ولگیٹ کی عبارتوں سے مقابلہ کرکے معلوم کرسکتے ہیں کہ کونسی قرات قدیم اور صحیح ہے ۔ اس کام کے لئے ہمارے پاس ان ترجموں اور نسخوں کی کافی سے زیادہ تعداد موجود ہے اور اب جو نیا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے ۔ اس میں ان تراجم اور نسخہ جات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ غلطی اور خطا سے توصرف خدا کی ذات ہی مبرا ہے ، لیکن جہاں تک انسانی طاقت سے ہوسکتا ہے یہ کوشش کی گئی ہے کہ اردو کا نیا ترجمہ اس عبارت کا مفہوم ادا کرے جو عبرانی کُتبِ مقُدسہ کے ملہم مصنفین نے لکھی تھی۔

نتیجہ

ہم نے نہایت مختصر طور پر گذشتہ ساڑھے تین ہزار سال کو ایک تاریخی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جب سے یہودی کُتبِ مقُدسہ احاطہ تحریر میں آئیں ۔ اس زمانہ سے چھاپے کے استعمال (۱۴۷۷ء) تک ان کی حفاظت اور نگہداشت کی گئی ۔پہلے پہل وہ قدُس الاقداس اور ہیکل میں محفوظ رہیں۔ پھر انبیاء زادے ان کے محافظ اور مفسر رہے۔ پھر انبیاء اللہ اورشاہانِ اسرائیل نے کُتبِ مقُدسہ کی حفاظت ، کتابت اور صحت کا ذمہ اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ بعد ازاں یہودی ربی اور مشائخ اور احبار یہ کام نہایت محنت استقلال اور

---

[1] Renyon,Our Bible and Ancient Manuscripts p.39

عرق ریزی سے کرتے رہے یہ سب اسی ایک دھن میں رہے کہ کُتبِ مقدسہ ہر ممکن انسانی کوشش سے تمام سہووخطا سے پاک رہے ۔ اوران کامتن ہر قسم کی عمداً غلطی سے مبرا رہے ، اور وہ اس کوشش میں اس قدر کامیاب ہوئے کہ روئے زمین کی ضخیم اور قدیم کُتب میں سے کتابِ مقُدس ہی ایک ایسی کتاب ہے ۔ جس کا متن صحیح اور مستند سمجھا جاسکتا ہے۔ اس دعوےٰ کی تصدیق توراتِ سامری ۔ ترجمہ سیپٹواجنٹ وپشیتہ اور ولگیٹ ودیگر تراجم اور تلمود اور ترجم وغیرہ کرتے ہیں۔ منجئی عالمین سیدنا مسیح اورآپ کے حوارئین اور مسیحی کلیسیا اور رسولِ عربی اور قرآن شریف تصدیق کی مہر اس پر ثبت کرتے ہیں۔ کیا تواتر کی دلیل زیادہ کامیابی سے اور زیادہ واضح طورپر کسی اور کتاب پر چسپاں ہوسکتی ہے؟ لہذا ظاہر ہے کہ عبرانی کُتب مقُدسہ نہایت مستند کُتب ہیں اور ان میں کسی شخص نے عمداً تحریف کسی زمانہ میں بھی نہیں کی جس سے ان میں کوئی فتور واقع ہوگیاہو۔اس کے برعکس وہ ایسی صحت کے ساتھ نقل کی گئی ہیں کہ فنِ تنقید کے ماہرین کھتے ہیں کہ " روئے زمین کی کوئی کتاب عبرانی کُتبِ مقدُسہ کی مانند کامل صحت اور دیانت داری کے ساتھ نقل نہیں کی گئی ۔ ان کتابوں کے کسی معمولی نسخہ میں بھی غلطیوں کا اتنا شمار نہیں ملتا جتنا آج کل کی چھپی ہوئی کتاب میں ہوتا ہے جس کے پرُوف نہایت احتیاط سے پڑھے گئے ہوں[1]۔"

پس گذشتہ ساڑھے تین ہزار سالوں کے طویل عرصے میں کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جس میں کسی شخص کے خواب وخیال اور وہم وگمان میں بھی یہ بات کبھی آئی ہو کہ وہ عبرانی کُتبِ مقُدسہ میں تحریف کرنے کا ارتکاب کرے ۔ تاریخ (جو کسی شخص یا مذہب کی طرف داری نہیں کرتی) ان تمام لوگوں کو کاذب او رجھوٹا قرار دیتی ہے جوکھتے ہیں کہ " تورات یہودیوں کی

عدمِ احتیاط ۔ اغراضِ ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتا پا مسخ ہوگئی ہے "(شبلی نعمانی سیرۃ جلد اول صفحہ ۱۲۷)۔

----

[1] Qeserley and Robinson, Introduction to the books of the Old Testament p.13

حصہ دوم

صحتِ کُتبِ عہدِ جدید

باب اول

تصحیفِ کاتبین کی حقیقت

اگر ناظرین تصحیفِ کاتبین کی حقیقت اور سہو کاتب کی مختلف اقسام سے کماحقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ وہ خود کسی کتاب کے دس بیس صفحے نقل کریں اور اپنی کو کسی دوسرے شخص کو نقل کرنے کے لئے دے دیں ، اور اس کی نقل کسی تیسرے شخص سے نقل کروائیں۔ علیٰ ہذا القیاس پچاس مختلف قابلیتوں اور مختلف پایہ کے لوگوں کو نقلیں نقل کرنے کے لئے دیں۔ پھر آخری شخص کی نقل کا اصل کتاب کی عبارت کے ساتھ مقابلہ کریں ۔ اس طرزِ عمل سے ناظرین پر نہ صرف سہو کاتب کی حقیقت ظاہر ہوجائے گی بلکہ اس طریقہ کار کا بھی علم ہوجائے گا جس سے فنِ تنقید کے ماہر انجیل جلیل کے اصلی متن کو معلوم کرتے ہیں۔

ہمارے مسلمان بھائی تحریفِ انجیل کے ثبوت میں عموماً یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ انجیل کی فلاں ایڈیشن میں فلاں آیت موجود ہے اور فلاں ایڈیشن سے وہ آیت خارج کردی گئی ہے حالانکہ یہی بات اس امر کی بدیہی دلیل ہے کہ مسیحی صرف اسی انجیل کی تلاوت کرنا چاہتے ہیں جس میں صرف وہی آیات ہوں جن کو الہامی کُتب کے مصنفین نے تحریر کیا تھا۔ اور جو الفاظ مختلف وجوہ کے سبب سے انجیل کے متن میں مابعد کی صدیوں میں داخل ہوگئے ہیں اور جن کو اصلی مصنفوں نے نہیں لکھا تھا، وہ کتابت اور قرات دونوں سے خارج کئے جائیں، تاکہ انجیلی کُتب کے مجموعہ کی اصلی عبارت جو ان کے مصنفین کے ہاتھوں نے لکھی تھی ہمارے ہاتھوں میں بھی موجود ہو۔

انجیلِ جلیل کو تحریر ہوئے انیس سو سال ہوگئے ہیں۔ اگر اس کے مصنفوں کے وہ نسخے جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے اس وقت تک محفوظ ہوتے تو ہمیں انجیلِ جلیل کی اصلی عبارت کے معلوم کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ پڑتی۔ لیکن یہ ایک انہونی بات ہے کیونکہ آخر یہ اشیا فانی ہوتی ہیں۔ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں وہ نسخے نہ بچ سکتے تھے اور نہ بچے۔ لہذا ان نسخوں کی نقلوں کے ذریعہ ہم کو معلوم کرنا پڑتا ہے کہ انجیلی مصنفین کے اصلی الفاظ کیا تھے۔ چونکہ کاتب انسان تھے اور سہو ونسیان بشریت کا تقاضا ہے لہذا گو انہوں نے کمال حزم اور احتیاط سے کام لیا تاہم اصلی نسخہ کو نقل کرتے وقت کاتبوں سے کتابت کی غلطیاں واقع ہوئیں لیکن چونکہ مختلف نسخہ جات کو مختلف کاتبوں نے مختلف اوقات اور مختلف ممالک میں لکھا تھا اور یہ لازم نہیں آتا کہ جو غلطی ایک شخص کرے وہی دوسرا بھی کرے لہذا مختلف نسخہ جات کا مقابلہ کرنے سے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ کس کاتب نے کونسی غلطی کی، اور چونکہ بے شمار انجیلی نسخہ جات ہمارے پاس موجود ہیں لہذا ظاہر ہے کہ بحثییت مجموعی ان میں انجی کے مصنفین کی اصلی عبارت ضرور محفوظ ہوگی۔ کیونکہ اگر ایک کاتب نے ایک صفحہ میں کسی لفظ کو نقل کرتے وقت کوئی غلطی کی ہے تو کسی دوسرے کاتب کے نسخہ سے وہ غلطی ظاہر ہوجاتی ہے اور اصلی لفظ معلوم ہوسکتا ہے ہاں اگر نسخے تعداد میں ایک یا دو یا دس، بیس ہوتے تو اس امر کا احتمال باقی رہتا کہ کسی کاتب کی غلطیاں جو اس نے کسی ایک نسخہ میں کی ہوں معلوم نہ ہوسکیں ۔ لیکن عہدِ جدید کی کُتب کے نسخوں کا یہ حال نہیں ہے۔ اس کے نسخے ہمارے پاس پانچ ہزار کی تعداد میں موجود ہیں، جیسا آئندہ ابواب میں واضح ہوجائیگا

پس ظاہر ہے کہ مختلف نسخہ جات ایک دوسرے کی غلطی کی تصحیح کرتے ہیں ، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو انجیل کا نسخہ ہمارے ہاتھوں میں اب موجود ہے۔ وہ بجنسہ اس کی نقل ہے جو انجیل کے مصنفوں نے لکھا تھا۔

مختلف نسخہ جات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا نہایت عرقریزی جانفشانی ، دیدہ ریزی، تن دہی ، محنت ، صبر اور جفا کشی کا کام ہے۔ لیکن چونکہ مسیحی انجیل جلیل کو الہامی مانتے ہیں لہذا اس کے اصل الفاظ کو دریافت کرنے میں نہایت صبر اور محنت واستقلال سے کام لینا سعادت دارین سمجھتے ہیں۔

اگر ہم عہدِ جدید کے نسخوں کا دیگر قدیم کُتب کے نسخوں کے ساتھ مقابلہ کریں تو ہم پر یہ امر ظاہر ہوجائے گا کہ ہم انجیل کے اصلی الفاظ، ان دیگر کُتب کے الفاظ سے زیادہ آسانی سے معلوم کرسکتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس انجیل شریف کے ہزاروں قدیم نسخے موجود ہیں۔ مثلاً ایس کلس [1] کے ڈراموں کے موجودہ زمانہ میں صرف پچاس نسخے موجود ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مکمل نہیں۔ سوفوکلیس [2] کے قریباً سو نسخے ہیں جن میں سے صرف سات کسی کام کے ہیں۔ کیٹیلس [3] شاعر کی نقلیں صرف تین نسخوں ہیں محفوظ ہیں اور وہ نسخے بھی چودھویں صدی کے ایک نسخہ کی نقل ہیں۔ مشہور کتاب گیلک جنگیں Gallic Wars انجیلی مجموعہ سے قریباً ایک سو سال زیادہ قدیم ہے لیکن موجودہ زمانہ میں اس کے صرف نو یا دس نسخے موجود ہیں اور ان میں سے قدیم ترین نسخہ کتاب کے لکھے جانے کے ایک ہزار سال بعد لکھا گیا تھا۔ رومی مورخ لوی Livy کی "تاریخ روم" ۱۴۲ حصوں پر مشتمل ہے لیکن اس کے صرف ۳۵ نسخے موجود ہیں۔

ان میں جو نسخے قدیم ہیں وہ صرف ٹکڑوں پر مشتمل ہیں جن پر صرف ۳، ۴، ۵، ۶ حصے لکھے ہیں۔ یہ مصنف ۵۹ قبل مسیح پیدا ہوا اور ۱۷ ء میں فوت ہوا۔ مورخ ٹیسی ٹس Tacitus کی تاریخ چودہ حصوں پر مشتمل تھی لیکن اب اس تاریخ کے صرف ۴ ۱/۲ حصے موجود ہیں۔ اسی مصنف کی ایک اور کتاب " تاریخ " Annals ہے جس کے سولہ حصے تھے لیکن اب اس کے مکمل حصے صرف دس ہیں۔ اس کی دونوں تصانیف کے متن کا انحصار صرف دو نسخوں پر ہے جو نویں اور گیارہویں صدی مسیحی کے ہیں اور حیرت کا مقام یہ ہے کہ یہ دونوں تصانیف انجیلی مجموعہ کے بعد لکھی گئیں ! مورخ تھوسی ڈایئڈیز Thucydides از ۴۶۰ قبل مسیح تا ۴۰۰ قبل مسیح کی تاریخ کا قدیم ترین نسخہ نو سو سال بعد از مسیح کے زمانہ کا ہے۔ یہی حال ہیروڈوٹس Herodotus (از ۴۸۸ قبل مسیح تا ۴۲۸ قبل مسیح) کی تاریخ کا ہے لیکن دورِ حاضرہ کا کوئی صحیح العقل مورخ ان کی کتابوں کی صحت پر شک نہیں کرتا حالانکہ ان کے موجودہ نسخے ان کی تصنیف کے تیرہ سو سال بعد کے ہیں۔

"قرآن کے صرف معدودے چند نسخے ہیں اور وہ بھی عباسیہ خاندان کی فتح کے دس بیس سال بعد کے ہیں یعنی دوسری صدی ہجری سے زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر رسالہ معارف ۱۹۲۵ ء میں موجود ہے۔ مثنوی مولانا روم کی ابتر حالت کا ذکر ہم حصہ اول عہد عتیق کی کُتب کے سلسلہ میں کرچکے ہیں اور وہ صرف سات سو سال کی پرانی کتاب ہے۔ دُور کیوں جائیں ، خود ہندوستان کو لے لو۔ دیوانِ غالب کی نسبت مفتی محمد انوار الحق صاحب سابق ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال فرماتے ہیں کہ " غالب کا مکمل دیوان دنیا سے ناپئید ہوچکا تھا اور اس کا بظاہر آثار نام ونشان تک باقی نہ رہا تھا۔ مگر زمانہ نے غالب کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد اس صحیفے کو دنیا میں رونما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشہ خفا میں پڑا تھا اور جس کے وجود کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ غالب نے اپنے چند سخن فہم احباب کے مشورہ سے اپنے اشعار کا بڑا حصہ مشکل اور مغلق ہونے کی بنا پر قلمزد کردیا تھا اور

---

[1] Aeschylus

[2] Sophocles

[3] Catullus

مروجہ اور مطبوعہ دیوان کو یہ سروپا بریدہ غزلیں اس ضیغم دیوان کی بچی کھچی نشانیاں ہیں جو ابنائے زمانہ کی آسان پسندی سے شائع ہونے سے پہلے ضائع ہوگیا" (نسخہ حمیدیہ صفحہ ۲، ۴)ابھی کل کی بات ہے کہ حضرت غالب زندہ تھے اور آپ کے دیوان کا حال یہ ہوگیا ہے۔

اب عہدِ جدید کی کُتب کے نسخوں کا حال سنئیے۔ انجیل اوراس کے حصص کے قدیم نسخوں کی تعداد جو اصل یونانی زبان میں ہیں، پانچ ہزار سے زائد ہے۔انجیل کے لاطینی ترجمہ ولگیٹ کے نسخوں کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ ہے اور شامی قبطی ارمینی وغیرہ ترجموں کے نسخوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس انجیل جلیل کے اصل الفاظ کو معلوم کرنے کے لئے چودہ ہزار سے زیادہ نسخے ہیں۔ کیا کوئی صحیح العقل شخص کہہ سکتاہے کہ ان چودہ ہزار سے زائد نسخوں کے ذخیرہ کی موجودگی میں ہم انجیل کی کُتب کے اصل الفاظ کو معلوم نہیں کرسکتے ؟

سہو کاتب کی اقسام

ہم نے اس باب کانام "تصحیفِ کاتبین کی حقیقت " رکھا ہے۔ لغت میں لفظ" تصحیف کے معنی کتابت میں خطا کرنا ہیں۔ خوایہ خطا نقطہ کی ہو یا حرف کی یا اعراب کی ہو ہر کاتب خواہ کیسا ہی محتاط ، ہوشیار ، فاضل اوراپنے فن کا ماہر ہو آخر انسان ہوتا ہے اور اس سے غلطیاں ہوجاتی ہیں ۔ پس انجیل جلیل کے نسخے نقل کرتے وقت کاتبوں سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔انجیلی نسخوں کی غلطیوں کی سب سے زیادہ تعداد سہوِ کاتب کا نتیجہ ہے۔ہجاء کی غلطیاں اور دیگر نہایت خفیف غلطیاں اسی قسم کی ہیں لیکن یہ غلطیاں ایسی ہیں جو پڑھنے والے پر فوراً ظاہر ہوجاتی ہیں اور ان کے معلوم کرنے میں کسی شخص کو بھی کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔اس قسم کی غلطیاں ہمارے ملاحظہ میں روزانہ آتی ہیں اور ہر اخبار اور کتاب میں پائی جاتی ہیں اور ہر معمولی پڑھالکھا شخص پڑھتے وقت ان غلطیوں کو خود بخود درست کرلیتا ہے۔

بعض اوقات کاتب صحیح اور درست لفظ کی جگہ ایسا لفظ لکھ دیتا ہے جو بولنے میں یا دیکھنے میں اس صحیح اور درست لفظ کے مشابہ ہوتاہے لیکن عبارت کا مطلب اوراس کا سیاق سباق فوراً بتادیتا ہے کہ یہ لفظ غلط ہے۔ اوراس کی بجائے فلاں لفظ جو صحیح ہے ، ہونا چاہیے۔ بعض اوقات کاتب عبارت لکھتے لکھتے کوئی لفظ چھوڑ جاتا ہے لیکن ایسا لفظ دیگر نسخوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے مل جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاتب ایک لفظ کو لکھتا ہے اوراگروہی لفظ پھر دوبارہ ایک آدھ سطر آگے لکھا ہو تو اس پر کاتب کی آنکھ ٹھہر جاتی ہے اور وہ دوسری سطر کے آگے لکھنے لگ جاتا ہے۔اور سوچتا ہے کہ اس سے پہلے کے تمام الفاظ اس نے لکھ لئے ہیں اور یوں وہ اس ایک آدھ سطر کو قلم انداز کردیتا ہے اور نہیں لکھتا۔ لیکن یہ ایک دو سطریں بھی جو چھوڑی جاتی ہیں دوسرے نسخوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے مل جاتی ہیں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک مسافر سفر کرتے کرتے راہ میں اپنے مال کا تھوڑا سا حصہ بھول کر چھوڑ جائے اوراس کے ہمراہی پیچھے آنے والے مسافر اس کے مال کواپنے ساتھ لے آئیں۔ اسی طرح نقل کرتے وقت جب کاتب کسی نسخے کے کسی لفظ کو بھول کر چھوڑدیتے ہیں توباقی نسخے اس لفظ کوظاہر کردیتے ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی تین انجیلوں کے الفاظ بہت حد تک یکساں ہیں لہذا بعض اوقات کاتب ایک انجیل کو نقل کرتے وقت کسی دوسری انجیل کے الفاظ حافظہ سے لکھ دیتے ہیں۔ اگرچہ نقل کرتے وقت نسخہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی تین انجیلیں ایک ہی واقعہ کا بیان تقریباً یکساں ہیں لہذا بعض اوقات کاتب ایک انجیل کو نقل کرتے وقت کسی دوسری انجیل کے الفاظ حافظہ سے لکھ دیتے ہیں ۔ اگرچہ نقل کرتے وقت نسخہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی تین انجیلیں ایک ہی واقعہ کا بیان تقریباً یکساں الفاظ میں کرتی ہیں۔ مثلاً کاتب نے انجیل اول کے ۱۷ باب کی

۲۰ویں آیت کو نقل کرتے وقت مرقس ۹: ۲۹ کو اس کے بعد لکھ دیا۔ یا مرقس ۱۲: ۴۰ اور لوقا ۲۰: ۴۷ کو متی ۲۳: ۱۳ کے بعد لکھ دیا۔ یا لوقا ۲۲: ۳۷ کو مرقس ۱۵: ۳۷ کے بعد لکھ دیا۔ یا متی ۲۴: ۴۰ کو لوقا ۱۷: ۳۵ کے بعد لکھ دیا، یا مرقس ۱۵: ۶ کو لوقا ۲۳: ۱۶ کے بعد لکھ دیا۔ یا لوقا ۱۹: ۱۰ کو متی ۱۸: ۱۱ کے بعد لکھ دیا۔ یا متی ۱۱: ۱۹ کو لوقا ۷: ۳۵ کے الفاظ کے مطابق لکھ دیا۔ متی ۱۶: ۱۳ کے الفاظ کو مرقس ۸: ۲۷ اور لوقا ۹: ۱۸ کے مطابق لکھ دیا۔ لوقا ۶: ۴۸ کو متی ۷: ۲۵ کے الفاظ کے مطابق لکھ دیا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاتب ایک لفظ کو لکھتا ہے اور اس کے بعد کی سطر کو لکھ کر پھر اس کی آنکھ دوبارہ اسی لفظ پر پڑجاتی ہے اور یوں وہ پھر اسی سطر کو دوبارہ نقل کرلیتا ہے ۔ مثلاً مرقس ۵: ۹ کو ۷: ۱۵ کے بعد دوبارہ نقل کردیا گیا ہے ۔ رومیوں ۱۶: ۲۰ کو ۱۶: ۲۳ کے بعد نقل کردیا گیا ہے ۔ عبرانیوں کے خط کے اردو ترجمہ میں کسی کاتب نے ایسا ہی کیا ہے۔ لیکن اس قسم کی غلطی بھی سطحی ہوتی ہے اور فوراً معلوم ہوجاتی ہے۔

اب متذکرہ بالاآیات اور الفاظ کی تصحیح کی گئی ہے ۔ یہی وہ آیات اور الفاظ ہیں جن کی نسبت ہمارے مسلمان بھائی اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اب انجیل سے خارج کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ اب ناظرین پر ظاہر ہوگیا ہوگا کہ یہ خارج شدہ الفاظ وآیات اصلی یونانی انجیل کے حصے نہیں تھے بلکہ کاتبوں نے ان کو سہواً لکھ دیا تھا۔

اس قسم کی غلطی کو ہم ایک معمولی مثال سے واضح کردیتے ہیں ۔ آپ کسی مسیحی کو کہیں کہ وہ دعائے ربانی کے الفاظ لکھے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے تحریر کردہ الفاظ متی ۶: ۹ تا ۱۲ سے مختلف ہوں گے اور ان میں سے بعض لوقا ۱۱: ۲ تا ۴ کے الفاظ کے مطابق ہوں گے۔ اگر آپ اس کو کہیں کہ وہ انجیل لوقا کو سامنے رکھ کر دعائے ربانی کی کتابت کرے تو گمانِ غالب یہ ہے کہ اس نقل میں چند الفاظ متی ۶: ۹ تا ۱۲ کے الفاظ کے مطابق ہوں گے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی نسخہ کے حاشیہ میں ایسے الفاظ لکھے ہوتے ہیں جو کسی آیت کو پورا کرتے ہیں مثلاً متی ۱۰: ۴۲ میں یونانی لفظ " ٹھنڈا" کے بعد بعض یونانی نسخوں میں لفظ " پانی " لکھا ہے جو اصل متن کا حصہ نہیں ہے بلکہ کسی کاتب نے بایں خیال کے وہ لفظ پہلے کاتب سے چھوٹ گیا ہے اس کو حاشیہ کو متن میں لکھ دیا۔

بعض اوقات کسی نسخہ کے حاشیہ میں کسی آیت کے مقابل چند الفاظ بطور تشریح لکھے ہوتے ہیں اور کاتب اس نسخہ کو نقل کرتے وقت (بایں خیال کہ وہ تشریحی الفاظ متن کا حصہ تھے، جو پہلے کاتب سے نسخہ لکھتے وقت رہ گئے تھے اور حاشیہ میں درج کئے گئے تھے) ان الفاظ کو نقل کرتے وقت متن میں جگہ دے دیتا ہے لیکن اس قسم کی غلطی انجیل جلیل کے کاتبوں سے نہایت کم سرزد ہوئی ہے اور دیگر نسخوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے یہ نقص بھی رفع ہوجاتا ہے۔

مثلا انگریز عالم ایریسمس Erasmus جس نے ۱۵۱۶ء میں یونانی عہدِ جدید کو پہلی بار چھپوایا، کہتا ہے کہ اس نے اعمال ۱۵: ۳۴ کے الفاظ " مگر سیلاس نے وہاں رہنا بہتر جانا" اور اعمال ۸: ۳۷ کے الفاظ " فیلبوس نے کہا اگر تواپنے تمام دل سے ایمان لاتا ہے تو روا ہے۔ اس نے جواب میں کہا میں ایمان لاتا ہوں کہ یسوع مسیح خدا کا بیٹا ہے ۔" دو نسخوں کے حاشیوں پر پائے اور اس نے ان کو متن میں داخل کرلیا اور اس طرح یہ دو آیات جو درحقیقت کتاب اعمال الرسل کا جُزنہیں تھیں اس میں داخل ہوگئیں ۔ جب قدیم نسخوں سے مقابلہ کیا گیا تو ان آیات کو متن سے خارج کردیا گیا۔ اسی طرح ۱ یوحنا ۱: ۷ تا ۸ کے الفاظ " آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں۔ اور تین ہیں جو زمین پر" ایرسمیس کی یونانی عہدِ جدید کی پہلی اور دوسری ایڈیشن میں نہیں تھے۔ لیکن کارڈنیل ذی نیز Cardinal Ximens کی یونانی عہدِ جدید کی ایڈیشن ۱۵۱۴ء میں موجود تھے ۔ پس ایرسیمس نے ان الفاظ کو ۱۵۲۲ء میں اپنی کتاب کی تیسری ایڈیشن میں

داخل کردیا جہاں سےوہ پرانے انگریزی ترجمہ اتھورائزڈورشن اور پچھلی صدی کے پرانے اردو تراجم میں داخل ہوگئے لیکن قدیم ترین نسخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ یہ الفاظ ان نسخوں میں نہیں ہیں اور انجیل کی اصل عبارت کا حصہ نہیں ہیں۔ پس ان کو متن سے خارج کردیا گیاہے۔ ان الفاظ کے اخراج سے مسیحی علماُ کی دیانت داری اور صدق نیت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ مندرجہ بالاآیات سیدنا مسیح کی ابنیت اور عقیدہ تثلیث سے متعلق ہیں اور مسیحی علماُ ۔ اگر چاہتے توان کو متن سے خارج نہ کرتے ۔ لیکن مسیحی علماُ کی خواہش یہی ہے کہ مومنین کے ہاتھوں میں صرف وہی انجیلی عبارت ہوجو انجیل کے مصنفوں نے لکھی تھی لہذا انہوں نے ان تمام الفاظ اور آیات کو بے دریغ متن سے خارج کردیا ہے جو انجیلی مجموعہ کی کتابوں کے مصنفین کے قلم نے نہیں لکھی تھیں۔

پس مختلف نسخہ جات کے مقابلہ سے اناجیل اربعہ کے متن میں سے ایزادیاں خارج کردی گئی ہیں اور یوں حتی الوسع کاتبوں کی غلطی کا ازالہ ہوگیا ہے۔

بعض اوقات کاتب لکھتے وقت فقرے کے الفاظ کی ترتیب یا الفاظ کے حرُوف کی ترتیب کو تبدیل کردیتا ہے ایسی غلطیاں بھی مختلف نسخوں کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوجاتی ہیں ۔ لیکن ایک ایک فقرے کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک لفظ کے مختلف حرُوف کی صحیح ترتیب معلوم کرنے کے لئے نہایت صبر واستقلال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ چنانچہ مغربی ممالک کے نقادوں نے اپنی گرانمایہ عمروں کا بیش ترحصہ انجیلِ جلیل کے اصلی متن کے الفاظ کے ایک ایک حرف کی کھوج میں صرف کردیا ہے۔ ایک نقاد نے خوب کہا ہے کہ سونے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی سونا ہی ہوتا ہے ۔ انجیل کی صحیح عبارت کا ایک ایک حرف ان نقادوں کی نظر میں سونے سے زیادہ گرانقدر ہوتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عالم شخص خود نسخہ کی کتابت کرتا ہے اور وہ کسی مشکل یا غیر مانوس لفظ کی بجائے اس کا مترادف آسان لفظ لکھ دیتا ہے ۔ مثلاً ۱ کرنتھیوں ۹: ۹ میں یونانی لفظ " کیموسائیس " اور فیموسائیس" دونوں یونانی لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی " منہ باندھنا" گوایک لفظ مشکل ہے اور دوسرا آسان ہے۔

بعض اوقات کسی عالم کاتب کے سامنے چند ایک نسخے ہوتے ہیں اور وہ نقل کرتے وقت ایک مستند نسخہ مرتب کرنا چاہتا ہے ۔ اب ممکن ہے کہ نسخوں میں جب کسی ایک حرف یا لفظ میں اختلاف واقع ہو تو اس فاضل کاتب نے مختلف نسخوں میں سے کسی ایک لفظ کو صحیح یا بہتر لفظ خیال کرکے لکھ لیا ہو لیکن وہ لفظ فی الواقع صحیح اور اصل لفظ نہ ہو۔ لیکن اس قسم کی غلطی بھی نسخوں کے باہمی مقابلہ سے رفع ہوجاتی ہے۔

بعض اوقات کسی عالم کاتب کو نقل کرتے وقت یاد آجاتا ہے کہ فلاں مقام پر فلاں یونانی لفظ کے لئے سریانی یالاطینی یا قبطی ترجمہ میں فلاں لفظ آیا ہے جس کا یونانی ترجمہ متن کے یونانی لفظ کے مفہوم کو بہتر طور پر ادا کرسکتا ہے ۔ پس وہ اپنے متن کے لفظ کو ترک کرکے ایک اور یونانی لفظ لکھ دیتا ہے جو اس کے ہم معنی اور مترادف لفظ ہوتا ہے۔ لیکن مختلف نسخہ جات کے مقابلے سے الفاظ کی تبدیلی کا پتہ فوراً لگ جاتا ہے ۔ اس قسم کی غلطیاں اکثر ایسے نسخوں میں پائی جاتی ہیں جن میں اصل یونانی متن اور سرُیانی یالاطینی یا قبطی ترجمے ایک دوسرے کے مقابل لکھے ہوتے ہیں۔ آگے چل کر فصلِ دوم میں ہم نسخہ بیزائی کا ذکر کریں گے جس میں یونانی متن اور لاطینی ترجمہ نے ایک دوسرے کو متاثر کررکھا ہے۔

انجیلی اختلافات کی حقیقت

یہاں ہم ناظرین پر اُن کی انجیلی اختلافات کی حقیقت بھی جتلادیتے ہیں، ڈاکٹر ہارٹ جس نے اپنی گرانمایہ عمر اس فنِ تقنید میں صرف کردی لکھتاہے کہ عہدِ جدید کی کُتب کے وہ الفاظ جو بغیر کسی شک وشبہ کے اصلی ہیں، جن میں خفیف سے خفیف تبدیلی بھی واقع نہیں ہوئی وہ انجیل کا تقریباً ۸/۷ حصہ ہیں۔ باقی آٹھویں جزُ کا ایک بہت بڑا حصہ اُن الفاظ پر مشتمل ہے جن کے ہجا میں اختلاف ہے یا دیگر نہایت خفیف اختلافات ہیں لیکن وہ اختلافات

جو صحیح معانی میں حقیقی اختلافات کہلائے جاسکتے ہیں ۔ انجیل کے تمام متن کا ایک ہزارواں حصہ [1] ہے۔ (دیباچہ عہدِ جدید یونانی صفحہ ۲) ڈاکٹر موصوف کا "حقیقی اختلافات" سے مطلب الفاظ کے ادل بدل سے ہے۔ مثلاً اسم کی بجائے ضمائر کا استعمال وغیرہ مثلاً" اس نے کہا" کی بجائے" پطرس نے کہا" وغیرہ۔

اس ایک ہزارویں حصہ کی نسبت سر فریڈرک کینین جیسا قابل اور محتاط نقاد کہتا ہے کہ اس ایک ہزارویں حصہ میں ایک آیت یا ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کا مسیحی تعلیم پر اثر پڑسکے [2] ۔ کیا ایک کتاب سے جو دو ہزار سال پُرانی ہو زیادہ صحت کی توقع ہوسکتی ہے ؟ پس یہ اختلافات ایک محقق کی نگاہ میں جو اصلیت کا خواہاں ہے کچھ وقعت نہیں رکھتے کیونکہ وہ ان کی نوعیت سے واقف ہے۔ آنجہانی مرزا صاحب قادیانی جیسا شخص بھی مجبور ہو کر کُتبِ مقُدسہ کی صحت کا یوں اقرار کرتا ہے۔" ہمارے امام المحدثین اسماعیل صاحب اپنی صحیح بخاری میں لکھتے ہیں کہ ان کتابوں میں کوئی لفظی تحریف نہیں۔"(ازالہ صفحہ ۲۷۳)اور کہتا ہے کہ " دانشمندوں کو خوب معلوم ہے کہ عربی اور فارسی کی کوئی مبسوط تالیف سہو اور غلطی سے مُبرا نہیں ہوسکتی لیکن جبلہ جو شخص کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ گو سہو کتابت ہی سہی حجت پیش کرنے کے لئے ایک سہارا ہوسکتا ہے ۔" اور وہ " اپنے دل کو اس بازاری چال بازی سے خوش " کرلیتا ہے (کرامات الصادقین صفحہ ۵) ۔ اس رسالہ میں ہمارا روئے سخن صرف محققین اور" دانشمندوں " سے ہے ۔" حیلہ جو" اشخاص جو" بازاری چال بازی سے اپنا دل خوش " کرلیتے ہیں اور جن کا کام ابلہ فریبی ہے، ہمارے مخاطب نہیں۔

[1] New Testament in the original Greek p.2 (1882)

[2] Textual Criticism of the New Testament p.7. By Sir F.Kenyon.

باب دوم

انجیلِ جلیل کی صحت پر آثار قدیمہ کی شہادت

علمِ آثار قدیمہ کے ماہرین نے گذشتہ صدی سے ان ممالک کی طرف خاص توجہ دی ہے جن کا ذکر کتابِ مقُدس میں آیا ہے۔ان کی دریافتوں نے کُتبِ مقُدسہ کے بیانات کی تصدیق کی ہے۔ عہدِ عتیق کی کُتب کے مجموعہ کی تصدیق کا ذکر ہم حصہ اول کے باب چہارم کے آخر میں کر آئے ہیں ۔ اس باب میں ہم آثارِ قدیمہ کے ان نتائج کا ذکر کریں گے جن کا تعلق انجیلِ جلیل کے مجموعہ سے ہے۔ اس باب میں ہم صرف کتبہ جات کا ذکر کریں گے جن کا تعلق انجیل کے متن سے ہے ۔ اگلے ابواب میں ہم ان قدیم نسخہ جات کا ذکر کریں گے جو انجیلی متن کے نسخے ہیں ۔

۱۔ مقُدس مرقس (۱: ۲۱) ۔ متی (۲: ۲۳) لوقا (۴: ۳۲) وغیرہ مقامات میں کفر نحوم کے عبادت خانہ کا ذکر ہے جہاں کلمتہ اللہ عبادت خانہ میں جا کر تعلیم دیا کرتے تھے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے اس عبادت خانہ کو کھود نکالا ہے ۔ اور ان تفاصیل کی تصدیق ہو گئی ہے جو اناجیل میں اس عبادت خانہ کے متعلق پائی جاتی ہیں ۔

۲۔ مقُدس لوقا(۳: ۱) میں لکھا ہے کہ یوحنا بپتسمہ دینے والے نے اس زمانہ میں خداوند کا کلام سنانا شروع کیا جب لسانیاس ابلینے کا حاکم تھا ۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو دمشق سے ۱۸ میل شمال مغرب کی جانب مقام ابلہ سے ایک یونانی کتبہ دستیاب ہوا ہے جس نے ثابت کردیا ہے کہ ۱۴ ء اور ۲۹ ء کے درمیان لسانیاس " ٹیٹرارک" Tetrarch تھا۔ مقُدس یوحنا نے ۲۷ ء میں یہود کو پیغام الہیٰ دینا شروع کیا تھا۔

۳۔ انجیلِ جلیل لوقا ۲: ۱ تا ۴ میں مردُم شماری کا ذکر ہے۔ جو قیصر اگستس کے حکم سے ربنا المسیح کی پیدائش کے وقت ہوئی تھی جس کے مطابق " سب لوگ نام لکھوانے

کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے۔" اب ایک پے پائرس دستیاب ہوا ہے جو برٹش میوزیم میں ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ مصر کے رومی گورنر نے ۱۰۴ء میں فرمان جاری کیا کہ " چونکہ خاندان کے مطابق مردم شماری ہوا کرتی ہے لہذا حکم دیا جاتا ہے کہ جو اشخاص کسی وجہ سے اپنے ضلع کے باہر گئے ہوئے ہیں وہ واپس اپنے گھروں میں پہنچ جائیں تاکہ حسبِ دستور ان کی مردم شماری کی جائے۔" یہ حکم ثابت کرتا ہے کہ اسم نویسی کا جو طریقہ مقدس لوقا نے ۲: ۳ میں لکھا ہے وہ رومی سلطنت میں مدتِ مدید سے جاری تھا اور انجیلی بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

تمام علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سیدنا مسیح ۳۰ء کے قریب مصلوب کئے گئے تھے۔ مقُدس لوقا لکھتے ہیں کہ یوحنا دینے والے نے قیصر طبریاس کی حکومت کے پندرھویں سال میں اہلِ یہود کو خداوند کا کلام پہنچانا شروع کیا۔ یہ قیصر ۱۴ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ مقُدس لوقا نے بادشاہوں کی حکومت کے کسی سال کے آغاز کا وہی طریقہ اختیار کیا تھا جو ملکِ شام میں مروج تھا، اور ملک شام کا وہی طریقہ جو یونان کے شاہی خاندانِ سلوکی Selencid کا تھا (جس کا ذکر ہم باب پنجم کی فصل دوم میں کر آئے ہیں) اس خاندان کے بادشاہوں کے سنِ جلوُس کا آغاز ستمبر اکتوبر کے ایام میں ہوا کرتا تھا۔ قیصر طبریاس اگست ۱۴ء میں روم کے تخت پر بیٹھا تھا۔ پس اس کا دوسرا سنِ جلوس اسی سال کے ستمبر اکتوبر میں واقع ہوا۔

انجیل چہارم میں فسح کی تین عیدوں کا ذکر آیا ہے۔ تیسری عیدِ فسح ۳۰ء میں واقع ہوئی جب آنخداوند مصلوب کئے گئے تھے۔ جس میں عید فسح کا ذکر یوحنا ۲: ۱۳ الخ میں ہے وہ مارچ ۲۸ء میں واقع ہوئی تھی۔ یہ تاریخ یوحنا ۲: ۲۰ کے مطابق ہے جس کے مطابق یروشلیم کی ہیکل چھالیس سالوں میں بنی تھی۔

ہیرودیس نے ہیکل کی یہ عمارت سن بیس اُنیس میں شروع کی تھی۔ پس ۲۸ء میں اس کو تعمیر ہوئے چھالیس سال ہوگئے تھے۔ اس حساب کے مطاُبق حضرت ابن اللہ تین سال (از ۲۷ء تا ۳۰ء) خدا کی محبت کا پیغامِ خلقِ خدا کو پہنچایا اور آپ ۳۰ء میں مصلوب ہوئے، اور مختلف مورخوں کی کتُب تواریخ انجیلی بیان کی تصدیق کرتی ہیں کہ آپ کی وفات کے وقت پنطس پیلاطس یہودیہ کا گورنر تھا اور ہیرودیس اینٹی پاس صوبہ گلیل کا " ٹیٹ راک" Tetrarch تھا اور کیفاس اہلِ یہود کا سردار کاہن تھا۔

مقُدس متی لکھتا ہے کہ آنخداوند کی صلیبی موت کے دن " دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا۔" (۲۷: ۴۵)۔ مسیحیت کے ابتدائی ایام میں ۵۲ء میں ایک غیر یہود مصنف تھیلس Thallus نے اس واقعہ کو تسلیم کیا لیکن اس کی یہ تاویل کہ یہ تاریکی سورج گہن کی وجہ سے تھی اس تاویل کے جواب میں مسیحی مصنف جولیس افریقینس Africanus ۲۲۱ء میں لکھتا ہے کہ تھیلس کا نظریہ غلط ہے کیونکہ بدرِ کامل کے وقت سورج گہن کا لگنا، انہونی بات ہے۔ جس روز منجئی جہاں مصلوب ہوئے وہ چودہ ماہ نیسان تھا۔ مورخ یوسیفس ہم کو بتلاتا ہے کہ تھیلس قیصر طبریاس کا آزاد کردہ غلام تھا[1] تھا۔

۴۔ ہم حصہ اول کے باب پنجم میں بتلا آئے ہیں کہ اناجیل اربعہ کے لکھے جانے کے بعد رومی افواج نے یروشلیم کو ایسا تہ وبالا کردیا کہ اس کے کسی پتھر پر پتھر باقی نہ چھوڑا۔ اور کہ ۱۳۵ء میں اس کے مقام پر ایک نیا شہر بسایا گیا جو بُت پرستوں کے شہروں کی مانند تھا۔ پس پُرانے شہر یروشلیم کے آثارِ قدیمہ کو معلوم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام اب اور بھی زیادہ مشکل ہوگیا ہے کیونکہ موجودہ زمانہ میں شہر کی آبادی نہایت گنجان ہوگئی ہے اوراس کے مقامات کی کھدائی عمل میں نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو اس خاص مقام کا صحیح پتہ نہیں ملتا جہاں سیدنا مسیح مصلوب ہوئے تھے[2]۔ اگرچہ بعد کے زمانہ میں ۳۲۷ء میں قیصر کانسٹن ٹائن کو ایک مقام دکھایا گیا جہاں اب مقُدس قبر کا گرجا The Church of

---

[1] Josephus, Antiquities, xviii, 6–4,

[2] A. Parrot , Golgotha and the Church of The Holy Sepulchre (1957)

The Holy Sepulchre. کھڑا ہے ۔ تاہم ماہرین آثارِ قدیمہ نے چند ایک مقامات کا پتہ لگایا ہے ۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

۵: یوحنا کی انجیل ۵: ۱ تا ۲ میں ہے۔" یروشلیم میں بھیڑ دروازہ کے پاس ایک حوض ہے۔۔۔۔ جس کے پانچ برآمدے ہیں۔" آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے ۱۸۸۸ء میں اس حوض کی جگہ کو کھودا۔ اس مقام کی شمالی دیوار میں پانچ محراب ہیں اور دیوار پر ایک فرشتہ کی صورت نظر آتی ہے جو پانی کو ہلاتا ہے (آیت ۴) سیڑھیوں کے نیچے ایک حوض موجود ہے جس کے شمال کی جانب پانچ برآمدے ہیں جو مذکورہ بالا پانچ محرابوں کے عین نیچے ہیں۔ اور مقُدس یوحنا کے بیان کی زبانِ حال سے تصدیق کرتے ہیں۔ یہ مقام پرُانے یروشلیم کے شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔

۶۔ یوحنا ۴: ۶ میں " یعقوب کے کنوئیں " کا ذکر ہے۔ آثارِ قدیمہ نے اس کنوئیں کا کھوج بھی نکالا ہے ۔ یہ قدیم سکم میں بلاطہ کے قریب واقع ہے اور مقُدس رسول کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔

۷۔ مقُدس یوحنا ۹: ۱۱ میں شیلوخ کے حوض" کا ذکر کرتا ہے ۔ محکمہ آثار قدیمہ کو اس حوض کا بھی سراغ مل گیا ہے۔ یہ حوض ہیکل کی جنوب کی جانب موجود ہے۔

۸۔ مقُدس یوحنا ۱۹: ۱۳ میں لکھتا ہے کہ " اس جگہ کو جو چبوترہ اور عبرانی میں گبتا کہلاتی ہے۔" اس مقام کا بھی اب صحیح پتہ مل گیا ہے ۔ یہ جگہ قلعہ انطونیا کی کورٹ تھی۔ یہ " چبوترہ" ایک رومی فرش ہے جو قریباً تین ہزار مربع گز ہے۔

مقُدس یوحنا کی انجیل سے صاف ظاہر ہے کہ یہ انجیل نویس یروشلیم کا رہنے والا تھا اوراس شہر کی گلی کوچوں سے بخوبی واقف تھا۔ پس وہ ان بیانات کا جو اس نے اپنی انجیل میں لکھے ہیں چشم دید گواہ ہے۔ اس حقیقت نے ہمارے نظریہ کی بھی تصدیں کردی ہے۔ جو ہم نے اپنی کتاب " قدامت واصلیت اناجیل اربعہ " کی دوسری جلد کے باب ہفتم میں لکھا ہے کہ مقُدس یوحنا انجیل نویس خاص یروشلیم کا رہنے والا تھا۔

۹۔ تمام نقاد بلا استثنا اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ مقُدس لوقا انجیل نویس نہایت محتاط مورخ ہے۔ اس حقیقت پر ہم اپنی مذکورہ بالا کتاب کی دوسری جلد کے حصہ دو اور سوم میں مفصل بحث کرچکے ہیں۔ آثارِ قدیمہ نے بھی اس حقیقت پر مہرُ تصدیق ثبت کردی ہے ۔ چنانچہ سطورِ بالا میں ہم ایک مثال انجیل ۳: ۱ سے دے آئے ہیں ۔ اس کی دوسری تصنیف اعمال الرسل کی تصدیق بھی آثار قدیمہ نے کردی ہے مثلاً

۱۰۔ مقُدس لوقا انجیل اور اعمال الرسل میں بار بار رومی سلطنت کے عہدہ داروں اور عہدوں کا ذکر کرتے ہیں۔ سلطنتِ روم کے تاریخ دان اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ سرکاری عہدے تعداد میں اس قدر زیادہ تھے کہ ان کا کوئی شمار نہ تھا۔ کوئی معمولی لیاقت کا انسان ان بے شمار چھوٹے بڑے عہدوں کے اختلافات میں تمیز نہیں کرسکتا تھا۔ چہ جائیکہ وہ ان عہدوں کے ناموں کا صحیح استعمال کرے ۔ لیکن مقُدس لوقا ان عہدوں کا ذکر اس صحت کے ساتھ کرتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے ۔ چنانچہ اعمال ۱۷: ۶ میں وہ عہدہ داروں کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ " پولی ٹارک" تھے جس کا اردوں میں ترجمہ " حاکموں " کیا گیاہے۔ یہ نام کسی دوسرے مصنف نے کبھی استعمال ہی نہیں کیا۔ لیکن محکمہ آثارِ قدیمہ نے دوسری صدی قبل مسیح سے تیسری مسیحی صدی تک کے زمانہ کے سکوں پر یہ عہدہ کندہ پایا ہے۔ یہ عہدہ مقدونیہ کے شہروں کے مجسٹریٹوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ان سکوں میں سے پانچ سکے مقدونیہ کے شہر تھسلنیکے کے ہیں جہاں پہلی صدی مسیحی میں پانچ اور دوسری صدی مسیحی کے نصف میں چھ " پولی ٹارک" متعین تھے۔ مقُدس لوقا اپنی کتاب اعمال کے ۱۷ باب میں تھسلنیکے کا ذکر کرتا ہے جہاں مفسد، یاسون اور دیگر مسیحیوں کو گھسیٹ کر "پولی ٹارک"

کے پاس لے گئے تھے ۔ آثارِ قدیمہ نے حیرت ناک طریقہ سے صدیوں بعد مقُدس لوقا کے محتاط بیان اور الفاظ کی تصدیق کردی ہے۔

۱۱ - مقُدس لوقا اعمال ۱۸ باب کی ۴، ۸ آیات میں کرنتھس کے "عبادت خانہ" کا ذکر کرتا ہے۔جہاں مقُدس پولوس " ہر سبت کے روز بحث کرتا اور یہودیوں اور یونانیوں کا قائل کرتا رہا۔" اب کرنتھس کے ایک قدیم مکان کے دروازہ پر یونانی زبان کا ایک کتبہ پایا گیا ہے جس پر لکھا ہے " عبرانیوں کا عبادت خانہ " ۔ جس سے ہم کو صحیح طور پر معلوم ہو گیا ہے جس میں مقُدس پولوس وعظ فرمایا کرتے تھے۔

۱۲ - اعمال ۱۸ : ۱۲ میں ہے۔" جب گلیو اخیہ کا صوبہ دار تھا۔" اب وسط یونان سے ڈیلفی Delphi کے ایک پتھر پر قیصر کلاڈیس کا ایک فرمان کندہ ملا ہے۔ اس فرمان میں لکھا ہے کہ گلیو اخیہ کا " پروکونسل" تھا۔ یہ فرمان ۵۲ء کے پہلے سات ماہ کا ہے۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ یہ شخص ایک سال کی مدت کے لئے " پروکونسل" مقرر ہوا تھا اور کہ پروکونسل یکم جولائی سے اپنے عہدہ پر مقرر کئے جاتے تھے۔ پس ظاہر ہو گیا کہ گلیو ۵۱ء کی یکم جولائی کے روز پروکونسل کے عہدہ پر مامور ہوا تھا۔ جب مقُدس پولوس کرنتھس میں انجیل جلیل کی اشاعت میں کوشاں تھے(اعمال ۱۸ : ۱۱ تا آخر)۔ یہ کتبہ نہ صرف مقُدس لوقا کے بیان کی صحت کی تائید و تصدیق کرتا ہے بلکہ مقُدس پولوس کی تبلیغی مساعی کی ٹھیک تاریخیں مقرر کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔

۱۳ - اعمال الرسل کے ۱۹ ویں باب میں اس فساد کا مفصل ذکر موجود ہے جو شہر افسس میں ہوا۔ اس کے بیان کے الفاظ فساد کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کردیتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ مجلس کا انعقاد " تماشہ گاہ" میں ہوا۔اب ایک کتبہ افسس کے تماشہ گاہ سے دستیاب ہوا ہے ۔ جس پر یونانی اور لاطینی زبانوں میں لکھا ہے کہ ایک " رومی حاکم ویبئس سلیوٹرس Vibius Salutaris نے ارتمس دیوی کا چاند کا بُت بنوایا اور وہ دیگر چند بُت اس کو دیدئیے تاکہ وہ تماشہ گاہ میں رکھے جائیں ۔ مقُدس لوقا لکھتا ہے کہ ویمیتریس اور اس کے ہم پیشہ سنار" ارتمس کے روپہلے مندر" بنا کر اور ارتمس دیوی کی مورتیاں بنا کر "آسودگی" سے زندگی بسر کرتے تھے ۔ پس یہ کتبہ مقُدس لوقا کے بیان کا مصدق ہے۔ افسس کے تماشا گاہ کی بھی کھدائی ہوئی ہے۔ وہ اس قدر فراخ ہے کہ اس میں ۲۵ ہزار انسان بآسانی تمام سماسکتے ہیں۔

۱۴ - اعمال ۱۴ : ۸ تا ۲۰ آیات میں ایشیائے کوچک کے شہر لسترہ کے فتنہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہاں مقُدس پولوس نے انجیل کی خوشخبری دی اور ایک لنگڑے کو شفا بخشی۔ وہاں کے باشندوں نے رسول مقبول کو ہرمیس دیوتا اور آپ کے ساتھی مقُدس برنباس کو زیوس کا نام دے کر ان کے آگے بیلوں کی قربانی کرنی چاہی۔ اس زمانہ میں لسترہ کی کھدائی سے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ان دونوں دیوتاؤں ہرمیس او رزیوس کی پوُجا ہوا کرتی تھی۔ یہ کتبے مقُدس لوقا کے بیان کے مصُدق ہیں۔

۱۵ - مقُدس لوُقا اعمال (۱۴ : ۲۰) میں لکھتے ہیں کہ لسترہ کے فساد کے بعد مقُدس پولوس اور برنباس دربے کو چلے گئے ۔ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں شہر دربے کا نشان مٹ گیا۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں اس شہر کے صحیح مقام کا پتہ چلا۔ جب یہاں کھدائی ہوئی، تب اس مقام سے کتبے دستیاب ہوئے جو ۱۵۷ء کے تھے۔ ان کتبوں پر دربے شہر اور اسکے باشندوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ پس آثارِ قدیمہ نے مقُدس لوقا کے بیان کی تصدیق کردی اور صحیح مقام کا نشان بھی بتلادیا۔

۱۶ - اعمال ۲۱ : ۱۷ تا آخر میں ہے کہ جب مقُدس پولوس اپنے ہمراہ چار آدمیوں کو لے کر ہیکل میں گئے تو "آسیہ کے یہودیوں نے اسے دیکھ کر ہلچل مچائی کہ اس نے یونانیوں کو ہیکل میں لا کر اس پاک مقام کو ناپاک کردیا ہے۔" اور اس کو قتل کرنے کے لئے پکڑا۔ غیر یہود کو حکم تھا کہ ہیکل کی بیرونی دیوار تک ہی آیا کریں اور اندر مت داخل ہوں۔ اور اگر وہ

اندرونی حصہ میں جانے کی جرات کریں تووہ مستوجب ِسزائے قتل ہوں گے ۔ اور مبادا کوئی غیر یہود بے علمی کا بہانہ کرکے اندر چلاجائے اس دیوار پر جو بیرونی حصہ کو اندرونی حصہ سے جدا کرتی تھی جا بجا یونانی اور لاطینی زبانوں میں اشتہار لگادیئے گئے تھے کہ جو غیر یہود اندر آنے کی جرات کرے گا وہ بے دریغ قتل کردیا جائے گا اور وہ اپنی موت کا آپ ذمہ وار ہوگا۔

۱۸۷۱ء اور ۱۹۳۵ ء میں اس مضمون کے یونانی کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن پر لکھاہے " کسی پردیسی کو اجازت نہیں کہ ہیکل کی بیرونی دیوار کے اس پار جائے اور اندرونی اور بیرونی حصوں کے درمیان داخل ہو جو شخص ایسا کرے گا وہ گرفتار کرلیا جائے گا اور وہ اپنی موت کا خود ذمہ وار ہوگا ۔"

پس آثارِ قدیمہ کی دریافت نے اعمال کی کتاب کے بیان کو درُست ثابت کردیا ہے۔ ان کتبوں نے نہ صرف اعمال کے بیان کی تصدیق کی ہے بلکہ مقُدس پولوس کے الفاظ" مسیح یسوع نے جدائی کی دیوار کو ڈھا کر یہود اور غیر یہود کو ایک کرلیا ہے ۔" (افسیوں ۲: ۱۴)۔ کو معنی خیز بنادیا ہے اور عالم وعالمیان پر مسیحیت کی عالمگیری کوواضح کردیا ہے۔

۱۷۔ مقدُس لوقا اعمال الرسل (۷۲: ۷) میں جزیرہ مالٹا کے " سردار " کا ذکر کرتا ہے۔ جو رتبہ کے لحاظ سے تمام جزیرہ میں سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔ اب یونانی اور لاطینی سکے دستیاب ہوئے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کا عہدہ یونانی Protos اور لاطینی میں Primus تھا۔ جن کے الفاظ کے معنی کو اردو کی انجیل میں لفظ " سردار " سے ادا کیا گیا ہے۔ ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ رومی سلطنت میں بے شمار عہدے تھے جن میں ہر کس وناکس تمیز کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ یہاں مقُدس لوقا کے محتاط مصنف ہونے کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ ان عہدیداروں کے دُرست ناموں تک کو جانتے تھے اور ان باریک تفصیلوں سے کماحقہ واقف تھے۔ اس قسم کی خفیف تفصیلات تک اس کی تصانیف کی صحت کی مصُدق ہیں۔

۱۸۔ جب مقُدس پولوس کرنتھس کے شہر میں قیام پذیر تھے تو آپ نے ۵۶، ۵۷ء کے درمیان کلیسیائے روم کو خط لکھا جو انجیلی مجموعہ میں شامل ہے۔ اس خط کے آخری باب میں لکھا ہے کہ " اراستس شہر کا خزانچی " تم کو سلام بھیجتا ہے(۱۶ : ۲۳) جب ۱۹۲۹ ء میں کرنتھس کی کھدائی ہوئی تو وہاں پہلی صدی مسیحی کا ایک فرش نظر آیا۔ جس پر ایک کتبہ تھا جس پر لکھا تھا کہ " عمارت عامہ کی منتظم Curator اراستس نے یہ فرش اپنی گرہ سے بنوایا۔" اسی شہر کرنتھس کے ایک اور کتبہ میں " گوشت کی مارکیٹ " کا ذکر ہے ۔جہاں قصابوں کی دکانوں پر گوشت بکتا تھا۔ رسول اسی مارکیٹ کی جانب اشارہ کرتا ہے (۱ کرنتھیوں ۱۰ : ۳۵) اب تک آثار قدیمہ کے تمام نتائج ثابت کرتے چلے آئے ہیں کہ جو باتیں اور واقعات دو ہزار سال ہوئے انجیل نویسوں اور انجیلی مجموعہ کے مصنفوں نے لکھی تھیں ۔وہ سب کی سب مجملاً اور تفصیلاً صحیح ہیں۔ ہم یہاں چند مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ جس صاحب کو ان باتوں کے مطالعہ کا شوق ہو ہم ان کی توجہ جے۔ ایچ ۔ کیڈبری اور سر ولیم ریمزے مرحوم اور دیگر علماُ کی کُتب کی جانب مبذول کرتے ہیں۔[1]

---

[1] Josephus, Jewish Wars. Vi2.4

J. H. Cadbury. The Book of the Acts in History.

William Ramsay.

باب سوم

انجیلِ جلیل کی صحت پر تاریخ کی شہادت

عہدِ جدید کی کُتب پہلی صدی عیسوی میں احاطہ تحریر میں آئیں اور ہمارے پاس اس وقت دوسری صدی کے اوائل اور اس کے بعد کے نسخے موجود ہیں۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی فلاسفر افلاطون[1] کی تصنیفات کا اولین نسخہ جو ہمارے پاس موجود ہے اس کی وفات سے تیرہ سو سال بعد کا ہے اور یونانی مصنف سوفوکلیز[2] کے ڈراموں کا نسخہ اس کی وفات سے چودہ سو سال بعد کا ہے اور یوری پیڈیز[3] کا نسخہ اس کی وفات سے ۱۶ سو سال بعد کا ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ انجیلِ جلیل کا قدیم ترین نسخہ جو ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے انجیل کے مصنفین کی وفات کے صرف ایک سوسال بعد کا ہے۔ جب افلاطون وغیرہ کی مروجہ کُتب کی بابت باوجود تیرہ چودہ اور سولہ صدیاں حائل ہونے کے ہم وثوق کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ان کی مروجہ کُتب وہی ہیں جو ان کے ہاتھوں سے نکلی تھیں ، اوران میں کوئی ایسا فتور واقع نہیں ہوا جس کی وجہ سے وہ پایہٗ اعتبار سے ساقط ہوگئی ہیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم کُتبِ عہدجدید کی نسبت خواہ مخواہ اس قسم کا فتویٰ صادر کریں۔ یادرہے کہ ہم یہاں انجیل کے صرف اصل یونانی نسخوں کی بات کرتے ہیں ورنہ ہمارے پاس (جیسا آئندہ واضح ہوجائیگا) پہلی ، دوسری اور تیسری صدی کی مصنفین کی کُتب اوراسی زمانہ کے انجیل کے

Plato [1]

Sophocles [2]

Euripides [3]

لاطینی اور سریانی وغیرہ زبانوں کے تراجم بھی موجود ہیں جو کُتبِ عہد جدید کی صحت پر شاہد ہیں۔

اس رسالہ کے حصہ اول میں ہم نے دیکھا تھا کہ عہد عتیق کی کُتب کا متن محفوظ ہے اور درجہ اعتبار سے ہر گز ساقط نہیں۔ اگرچہ ہم حصہ اول میں بتلا چکے ہیں نسخہ تورات سامری کے علاوہ اب ہمارے پاس اِن کُتب کے قدیم ترین نسخے عبری رسم الخط میں موجود ہیں تاہم ان بائیس سو سال کے قدیم نسخوں اور کتابوں کے اصل مصنفوں کے درمیان ہمارے علم کی موجودہ حالت کے مطابق قریباً دو صدیاں حائل ہیں۔ لیکن عہدِ جدید کی کُتب کا یہ حال نہیں ہے بلکہ جیسا ابھی ذکر کیا جاچکا ہے ان کتابوں کے دوسری صدی کے اوائل کے قدیم نسخے ہمارے پاس موجود ہیں جو ان کی اصلیت کے گواہ ہیں اور جن کا ذکر شرح اور بسط کے ساتھ اس باب میں کیا جائے گا۔

نسخوں کی تاریخ کے دَور

پندرھویں صدی مسیحی میں چھاپہ کے حروف ایجاد ہوئے۔ پس انجیلی نسخوں کا زمانہ پندرھویں صدی مسیحی تک یعنی چودہ سو سال کا عرصہ ہے۔ یہ زمانہ تین حصص میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱۔) دَورِ اوّل ۔ پہلی صدی کے درمیان سے لے کر چوتھی صدی کے شروع تک۔ (از ۵۰ء تا ۳۰۰ء) اس زمانہ میں بالعموم کتابیں پے پائرس (جسے ہندی میں پیپڑا یا بردی اور عربی میں حفاء اور قرطاس کہتے ہیں) لکھی جاتی تھیں۔ جو موجودہ کاغذ کی طرح پائدار شے تھی۔ کُتبِ مقُدسہ کی کتابیں بھی اسی شے پر لکھی جاتی تھیں (یسعیا ۱۸: ۲ ، ۲ یوحنا آیت ۱۲) اور طرز تحریر بھی ایسا تھا جو اس شے کی تقطیع کے مطابق تھا۔ قرآن میں پے پائرس کے لئے لفظ قرطاس اور اس کی جمع قراطیس استعمال ہوا ہے (انعام ع ۱۱ وغیرہ)۔

(۲۔) دورِ دوم۔ چوتھی صدی مسیحی سے نویں صدی مسیحی تک (از ۳۰۰ء تا ۸۰۰ء) اس زمانہ میں کُتبِ مقُدسہ چمڑے یعنی رق پر لکھی جاتی تھیں اور تحریر تقطیع کے مطابق بڑے اور جلی حروف میں تھی۔

(۳۔) دورِ سوم ۔ نویں صدی سے پندرھویں صدی تک (از ۸۰۰ء تا ۱۴۰۰ء) اس زمانہ میں عموماً رق پر کُتبِ مقُدسہ لکھی جاتی تھیں۔ لیکن ۱۲۰۰ء سے کاغذ بھی استعمال ہونے لگ گیا تھا۔ اس زمانہ کی تحریر باریک اور چھوٹے حروف میں تھی جو ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جاتے تھے بلکہ باہم ملائے جاتے تھے۔

فصلِ اوّل

دَورِ اوّل

پے پائرس کا زمانہ

(از ۵۰ء تا ۳۰۰ء)

طوُماروں کی لمبائی

پہلی صدی مسیحی میں کتابیں پے پائرس پر لکھی جاتی تھیں۔اس شے کا ذکر ۲ یوحنا آیت ۱۲ میں آیا ہے جہاں کا اردو ترجمہ "کاغذ" کیا گیا ہے۔ یہ پودا مصر میں دریائے نیل کے کناروں پر بکثرت پایا جاتا تھا۔ مصر کی سرزمین ایسی خشک ہے کہ پے پائرس کی جو کتابیں ریت کے نیچے صدیوں سے دبی چلی آئی ہیں وہ من وعن محفوظ رہی ہیں۔ اس شے کی تقطیع ۶ انچ سے ۱۵ انچ تک ہوتی تھی اور اس کے بہت سے ٹکڑے اکٹھے لمبان میں جوڑ کر ایک طوُمار جو طویل میں عموماً تیس فٹ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا تیار کیا جاتا تھا۔ اس طومار کے کاتب نقل کرکے لپیٹ لیتے تھے۔لکھائی نستعلیق قسم کی ہوتی تھی اور کُتبِ انجیل کے کاتب حرکات وسکنات وقف کے علامات وغیرہ بھی کبھی کبھی لکھ دیتے تھے۔ بالخصوص جب کبھی کوئی ایسا لفظ یا عبارت ہوتی جہاں کاتب کے خیال میں غلطی کا اندیشہ ہوسکتا تھا وہ حرکات اور علاماتِ وقف لگادیا کرتا تھا۔ طوُمار کی لمبائی کے خط کو لکھنے کے لئے پے پائرس کا صرف ایک ورق درکار تھا فلپیوں یا کلیسیوں کے خط کے لئے پے پائرس کے صرف ۳ یا ۴ فٹ درکار تھے۔ رومیوں کے خط لکھنے کے لئے ساڑھے گیارہ فٹ لمبا طومار درکار تھا۔ مکاشفات کے لئے ۱۵ فٹ کا، مرقس کی انجیل کے لئے ۱۹ فٹ کا۔ یوحنا کی انجیل کے لئے ساڑھے تیئس فٹ کا۔ متی کی انجیل کے لئے ۳۰ فٹ کا، رسولوں کے اعمال کے لئے ۳۱فٹ کا، اور لوقا کی انجیل کے لئے ۳۲فٹ کا طومار درکار تھا۔ طوُمار کی تقطیع ۵انچ سے ۱۵ انچ تک ہوتی تھی ۔ کاتب قطاروں میں لکھا کرتے تھے جس کی سطریں عموماً ڈھائی یا ساڑھے تین انچ کی ہوتی تھیں۔ دو قطاروں میں عموماً ڈیڑھ انچ کا فاصلہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ طومار کے اوپر اور نیچے حاشیہ کے لئے جگہ چھوڑ دی جاتی تھی جہاں وہ الفاظ لکھے جاتے تھے جو کاتب سے نقل کرنے میں رہ جاتے تھے۔

طوُماروں کی مشکلات

مذکورہ بالا اندازہ سے ہم پر ایک بات واضح ہوجاتی ہے کہ چونکہ طوُمار کی لمبائی عموماً ۳۰ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ لہذا انجیل نویس اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ان کو جو کچھ لکھنا ہے وہ ۳۰ فٹ کے اندر اندر آجائے۔ لہذا وہ اختصار کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیدنا مسیح کے کلماتِ طیبات اور معجزات وغیرہ میں سے وہ صرف چیدہ چیدہ باتیں ہی لکھ سکتے تھے تکہ ضخامت طومار سے بڑھ جائے۔

ایک اور نتیجہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ چونکہ طوُمار تیس فٹ لمبا ہوتا تھا لہذا پہلی صدی میں عہدجدید کی کُتب کا ایک ہی جلد میں جمع ہونا ایک مشکل امر تھا بلکہ اناجیل اربعہ بھی ایک

ہی طوماروں میں نہیں لکھی جاسکتی تھیں۔ پس پہلی صدی میں عہد جدید کی مختلف کُتب علیحدہ علیحدہ الگ طوماروں میں ہی لکھی جاتی تھیں۔

ان کتابوں کے علیحدہ طوماروں میں ہونے سے یہ ظاہر ہے کہ مابعد کے مسیحی مصنفوں کو ان کتب کے حوالوں کی تلاش کرنے میں بڑی دقت پڑتی تھی بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ ابواب وآیات کے شمار کا وجود نہیں تھا۔ پس مسیحی مصنفین زیادہ تر حافظہ سے کام لیتے تھے۔ لہذا اگر ان کُتب سے اقتباسات کرنے میں لوگوں سے الفاظ کی صحت میں غلطیاں واقع ہوگئی ہوں تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔

انجیل کے نسخے

ابتدا ہی سے مسیحی کلیسیائیں روزانہ تلاوت کے لئے کُتبِ مقُدسہ کی نقل کرواتی تھیں۔ بعض نسخے عبادت خانوں اور گرجاؤں میں رکھے جاتے تھے تاکہ عبادت کے وقت پڑھے جائیں۔ اور بعض نسخے مختلف ممالک کے معدودے چند مالدار مسیحیوں کے کُتب خانوں میں ان کی روزانہ تلاوت کے لئے ہوتے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں بُت پرستوں کے ہاتھوں سے مسیحی کلیسیا کو سخت ترین ایذائیں پہنچتی تھیں اور شاہی حکم یہ ہوتا تھا کہ انجیل کے نسخے تلف کردیئے جائیں، لہذا اس دور کے بہت سے قیمتی نسخے تلف ہوگئے۔

گمان غالب یہ ہے کہ یہ تلف شدہ نسخے بالعموم وہ تھے جو گرجاؤں میں رکھے رہتے تھے۔ لیکن مختلف افراد کہ ذاتی نسخے بالعموم محفوظ رہ گئے۔ تاریخ کلیسیا ہم کو بتلاتی ہے کہ جب انجیل کے نسخے قسیسوں اور عالم مسیحیوں سے تلف کرنے کے لئے طلب کئے جاتے تھے تو وہ انجیل کے نسخہ کی بجائے دیگر کُتب مثلاً وعظوں کا مجموعہ وغیرہ دشمنوں کے ہاتھوں میں دے کر اس ڈھنگ سے انجیل شریف کے نسخوں کو بچالیتے تھے۔

اس دَور میں یعنی پہلی تین صدیوں میں عہدِجدید کی کُتب نہ صرف تمام رومی سلطنت میں پھیل گئیں، بلکہ جہاں جہاں مسیحی مبلغین جاسکے وہاں اپنے ساتھ انجیل مقُدس کو لے گئے۔

بعض ممالک میں مسیحیت کی اشاعت کو جرُم تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایسی جگہوں میں بہترین کاتبوں نے نہایت صحیح اعلیٰ نسخے نقل کرکے دیار وامصار میں پہنچادیئے لیکن جن ممالک میں مسیحیت کی اشاعت جرُم اور ملک سے غداری تصور کی جاتی تھی وہاں نسخے عموماً تلف کردیئے جاتے تھے۔ لیکن جیسا اوپر ذکر ہوچکا ہے بہتیرے نسخے ضائع ہونے سے بچ گئے۔

اس دور کے نسخوں کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس شے پر کُتب مقُدسہ نقل کی جاتی تھیں وہ ایسی پائیدار نہیں تھی کہ صدیوں تک، مثلاً دَور حاضرہ تک اچھی حالت میں رہ سکتی۔ آب وہوا کے اثرات نے ان نسخوں کو ضائع کردیا۔ صرف ملکِ مصر میں ڈیلٹا کے اوپر جہاں آب وہوا خُشک ہے وہی نسخے محفوظ رہے ہیں جو زیرِ زمین مدفوُن تھے اور اب ہم کو دستیاب ہوگئے ہیں۔

پے پائرس کی کتابی صوُرت کے قدیم نسخے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی مسیحی کے آخر اور دوُسری صدی کے شروع میں پے پائرس طوُماری شکل بنانے کے ساتھ ساتھ ایک اور ڈھنگ اختراع کیا گیا تھا یعنی طومار بنانے کی بجائے پے پائرس کے اوراق کی جزُو بندی کرکے اُن کو اس طور پر کرکے یک جا کردیا جانے لگا جس طرح دَورِ حاضرہ میں کاغذ کے مختلف اوراق کو کتابی صوُرت میں یک جاجمع کردیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ ایک سے زیادہ کتابیں (جو طوماری شکل میں یک جا نہیں کی جاسکتی تھیں)۔ ایک ہی جلد میں اکٹھی کرکے مجلد کی جائیں۔ مسیحی کلیسیا میں یہ نیا طرز آہستہ آہستہ رواج حاصل کرکے مقبولِ عام ہوگیا حتیٰ کہ چوتھی صدی میں یہ طریقہ ہر جگہ مروج ہوگیا۔ لیکن پہلی تین صدیوں میں اُمراء کا طبقہ طوُماروں کو ہی پسند کرتا تھا۔ ہاں غرباء میں کتابی صورت کا طریقہ مقبول خلائق ہوگیا تھا۔ چوُنکہ مسیحی بالعموم غریب طبقہ کے لوگ ہوتے تھے انجیل جلیل کے مجموعہ کی کُتب دوسری اور تیسری صدیوں میں کتابی صوُرت میں لکھی جانے لگیں۔ پس یہ اختراع انجیلِ جلیل کے نسخوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

اس اختراع کا پتہ پہلے پہل ۱۸۹۹ء میں چلا تھا جب مُقدس یوحنا کی انجیل کے دواوراق دستیاب ہوئے جن میں سے پہلا ورق اس انجیل کا صفحہ اول تھا اور دوسرا ورق اس انجیل کا آخری صفحہ تھا۔ بعدہ اس قسم کے پے پائرس کی دیگر کتابیں بھی دستیاب ہوئیں جن کی بہت بڑی تعداد مسیحی ادبیات سے متعلق تھی ۔ چیسٹر بیٹی کے پے پائرس کے مجموعہ نے (جس کا ذکر ہم حصہ اول میں کرچکے ہیں) یہ امر قطعی طور پر ثابت کردیا ہے کہ اس پہلے دور میں بھی پے پائرس کے اوراق کی جُزو بندی کرکے انجیلی مجموعہ کی کُتب کو اکٹھا ایک ہی جلد میں جمع کیا جاتا تھا۔ ان مذکورہ بالا نسخوں میں زیادہ تر تیسری صدی کے نسخے ہیں۔ گو کم از کم ایک نسخہ دوسری صدی کے پہلے نصف کا بھی ہے۔ چنانچہ ایک نسخے میں (جو تیسری صدی کے اوائل کا ہے)اناجیلِ اربعہ اوراعمال الرسل ایک جلد میں مجلد ہیں۔ ایک اور نسخہ جو دوسری صدی کے آخر کا ہے مقُدس پولوس کے تمام خطوط جمع ہیں۔ ایک اور نسخہ میں جو دوسری صدی کے اوائل کا ہے گنتی اور استثنا کی کتابیں ایک جلد میں جمع ہیں۔ایک اور نسخہ میں حزقی ایل ، دانی ایل اور آستر کی کتابیں ایک جلد میں مجلد ہیں۔ یہ امر ثابت کردیتا ہے کہ اس پہلے دَور میں بھی مسیحی کلیسیا نے دوسری اور تیسری صدی میں غالباً تمام انجیلی مجموعہ کُتب کو ایک جلد میں جمع کردیا تھا۔ چنانچہ جرمن نقاد ہارنیک کے خیال میں اناجیل اربعہ ایشیائے کوچک میں ۱۲۰ء اور ۱۳۰ء کے درمیان ایک مجموعہ میں شامل کی گئیں۔ مشہور عالم ذاہن Zahan کہتا ہے کہ ۱۸۰ء اور ۱۱۰ء کے درمیان اناجیل اربعہ اور مقُدس پولوس کے خطوط ایک مجموعہ میں جمع ہوگئے تھے اور یہ مجموعہ ملک شام کے شہر انطاکیہ سے روم تک مشرقی اور مغربی کلیسیاؤں کے گرجاؤں میں استعمال ہوتا تھا[1]۔

[1] Beginnings of Christianity vol.III By Ropes P.CCXC and CCXCI (Margin)

دَورِ اوّل کے بعض قدیم نسخے

موجودہ وقت تک جو دَورِ اول قدیم ترین نسخے دریافت ہوئے ہیں ان میں ایک ایسا پارہ ہے جو پے پائرس کوڈکس کا ہے اور مصر سے دستیاب ہوا ہے جس پرا نجیل یوحنا کے ۱۸ باب کی آیات ۳۱ تا ۳۳ و ۳۷ تا آخر لکھی ہیں۔ یہ نسخہ اب جان رائی لینڈز کُتب خانہ میں محفوظ ہے ۔ اس نسخہ میں وہ متن موجود ہے جو ملک مصر کی کلیسیا میں انجیل چہارم کی تصنیف ہونے کے بعد ماضی قریب میں مروج تھا۔[2] ۔ کیونکہ علماء کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ نسخہ ۱۳۰ء یا اس سے بھی پہلے قیصر تریجن کے وقت کا ہے اور تاحال عہدِ جدید کی کُتب کا قدیم ترین نسخہ ہے۔ جو ان لوگوں کی حینِ حیات میں لکھا گیا تھا جنہوں نے مقُدس یوحنا انجیل نویس کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عین ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں ہم کو اس سے بھی زیادہ قدیم نسخے دستیاب ہوجائیں۔

حال ہی میں پے پائرس کے بعض ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں جو ۱۵۰ء سے پہلے کے ہیں[3] ۔ یہ پارے کسی ایسے شخص کے تصنیف کردہ نسخے کے ہیں جس نے چاروں انجیلوں کو بڑے غور وتدبر سے پڑھا تھا۔ لکھتے وقت چاروں انجیلیں مصنف کے سامنے تھیں۔ اس کا یہ رسالہ لکھنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ عوام مسیحی اناجیل اربعہ کے بیانات سے کماحقہ ، واقف ہوجائیں[4] ۔ یہ کتاب آنخداوند کے سوانحِ حیات اور تعلیمات پر مشتمل تھی۔

[2] See C.H.Roberts, An unpublished Fragment of the Fourth Gospel, 1935.

[3] Fragments of an unknown Gospel and other early Christian Papyri. By Bell and Skeat. 1935

[4] The Times Literary Supplement, 25 April 1935.

۱۹۵۶ء میں انجیل یوحنا کا ایک قدیم نسخہ دستیاب ہوا جو ۲۰۰ء کے قریب لکھا گیا تھا۔ اس نسخہ میں انجیل کے پہلے چودہ باب کا اور آخری سات ابواب کے متن کا زیادہ تر حصہ محفوظ ہے۔

اسی زمانہ کا ایک اور نسخہ ملا ہے جس میں مقُدس لوقا اور مقُدس یوحنا کی انجیلوں کے حصے محفوظ ہیں، اور ایک اور نسخہ میں مقُدس پطرس کے خطوط اور یہوداہ کا خط محفوظ ہیں۔

چیسٹر بیٹی کے نسخہ جات کا مجموعہ

چیسٹر بیٹی[1] کے نادر مجموعہ کا ہم مجمل ذکر حصہ اول میں کر آئے ہیں۔ اس مجموعہ میں بعض نسخے ایسے ہیں جو عہد جدید کے پارے ہیں جو ۱۰۰ء اور ۱۵۰ء کے لکھے ہوئے ہیں اور بعض ۲۰۰ء کے قریب کے ہیں۔ ان میں مقُدس یوحنا کی انجیل بھی ہے جس کے ۱۴ تا ۲۱ ابواب کے بعض درمیانی حصے ضائع ہوگئے ہیں۔ایک پارہ ۱۲۵ء کا ہے جس پر یوحنا ۱۸ باب ۳۱ تا ۳۳ آیت، ۳۷، ۳۸ آیات لکھی ہیں۔ ان نسخوں میں اعمال کی کتاب کے ۵ باب ۳۰ آیت اور ۱۷ باب ۱۷ آیت محفوظ ہے ایک اور پارے میں اعمال ۲۳: ۱۱ تا ۲۹ محفوظ ہے جو تیسری صدی کے نسخہ کا ٹکڑا ہے۔ بعض نسخے ۲۵۰ء کے ہیں۔

چیسٹر بیٹی کے مجموعہ میں انجیل جلیل کی کُتب کے تین نسخے ہیں جو پے پائرس کی کتابی صورت میں مجلد ہیں اور نہایت اہم قسم کے ہیں۔ ایک نسخہ جو اناجیل اربعہ اوراعمال الرسل پر مشتمل ہے ۲۲۰ء کے لگ بھگ کا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نسخہ سینا اور نسخہ ویٹی کن سے بھی ایک سو سال پرانا ہے۔ اس نسخہ کے ایک سو دس ورق تھے جن میں سے تیس اور اوراق کے حصے محفوظ ہیں یعنی دو ورق مقُدس متی کی انجیل کے ہیں اور چھ ورق مقُدس مرقس کی انجیل کے ہیں اور دو ورق مقُدس یوحنا کی انجیل کے ہیں اور سات ورق مقُدس لوقا کی انجیل کے ہیں اور تیرہ ورق رسولوں کے اعمال کی کتاب کے ہیں۔

(۲۔) دوسرا نسخہ مقُدس پولوس کے خطوط پر مشتمل ہے جو نہایت خوشخط ہے اور بہت اچھی حالت میں محفوظ ہے۔ اس کے ایک سو چار ورق ہیں جن میں سے پہلے سات اور آخری چار ورق تاحال نہیں ملے۔ لیکن یہ امید کی جاتی ہے کہ کسی زمانہ میں یہ ورق بھی دستیاب ہوجائیں گے۔ اس نسخہ میں غالباً مقُدس پولوس کے پلبانی خطوط شامل نہیں تھے۔ لیکن سوائے ۲ تسلنیکیوں کے تمام دیگر خطوط کے اکثر حصے موجود ہیں۔ غالباً ۲ تسلنیکیوں اس نسخہ کے آخری صفحوں پر نقل کیا گیا تھا جو تاحال نہیں ملے۔ یہ نسخہ ۲۰۰ء میں لکھا گیا تھا۔ یعنی وہ مقُدس پولوس کی شہادت کے صرف ایک سو چالیس سال بعد نقل کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ ۱۹۲ء میں شائع کیا گیا۔

(۳۔) تیسرا نسخہ مکاشفات کی کتاب کے تہائی حصہ کی نقل ہے یعنی ۹: ۱۰ تا ۱۷: ۲۰ محفوظ ہے۔ اور دس اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ تیسری صدی کے اوائل کا لکھا ہوا ہے۔

اگر ہم چیسٹر بیٹی کے مجموعہ کے ۱۲۶ء اوراق میں سے صرف ان تین مذکورہ بالا نسخوں کو اکٹھا کریں تو ہمارے پاس انجیل جلیل کی تمام کتابوں (باستثنائے پاسبانی خطوط اور خطوطِ عام) کے اوراق موجود ہوجاتے ہیں جو دوسری صدی کے اور ۲۳۰ء کے لگ بھگ لکھے ہوئے ہیں۔ ان نسخوں کی اہمیت اس امر سے ظاہر ہے کہ جہاں اب سے سولہ سال پہلے یونانی بائبل کو جاننے کے لئے ہمارے پاس صرف چوتھی صدی کے نسخے تھے اب اس کے متن کی صحت کے گواہ ۲۴۰ء کے لگ بھگ کے بلکہ دوسری صدی کے اوائل کے گواہ بھی موجود ہیں۔ یہ نسخے کتابِ مقُدس کے متن کو معلوم کرنے کے لئے نہایت اہم ہیں۔ان کی طفیل ہم کم ازکم ایک صدی بلکہ اس سے زیادہ عرصہ کو عبور کر گئے ہیں، اور انجیل کی

[1] Chester Beatty's Biblical Papyri.

تصنیف کے زمانہ کے قریب پہنچ گئے ہیں اوراب ہمارے ہاتھوں میں انجیل جلیل کے وہ نسخے ہیں جو ۲۰۰ء میں مسیحی کلیسیا میں استعمال کیا کرتی تھیں۔

اس کے علاوہ کتابی پے پائرس کا ایک اور نسخہ ہے جو تین اوراق پر مشتمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ان لوگوں کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے جن کی بابت مقُدس لوقا اپنی انجیل کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ " بہتوں نے اس پر کمر باندھی ہے کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں۔" (۱:۱) ان تین ورقوں کے الفاظ اورمحاورات یا تو اناجیل اربعہ کے ہیں یا ان کی صدائے بازگشت ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتاہے کہ ہم پہلی صدی کے اس زمانہ کے نزدیک پہنچ چکے ہیں جب اناجیل اربعہ اوران کے ماخذ تحریر میں آرہے تھے یا آچکے تھے۔ ان اوراق میں ربنا المسیح کے سوانحِ حیات کا بیان ہے جو ہر چہار اناجیل سے لیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اناجیل سے مختلف واقعات کو لے کر ان کو اس نسخہ میں ایک مسلسل بیان کی صورت میں Harmony of the Gospels لکھا گیا ہے۔ ان میں مرقس ۱: ۴۰تا ۴۲۔ اور متی ۸: ۲تا ۳، اور لوقا ۵: ۱۲تا ۱۳ کے الفاظ میں کوڑھی کو صاف کرنے کا معجزہ لکھا ہے۔ قیصر کو جزیہ ادا کرنے کے سوال کو مرقس ۱۲: ۱۴ تا ۱۵، اور متی ۲۲: ۱۷ تا ۱۸، لوقا ۲۲: ۲۱تا ۲۵ کے الفاظ میں لکھا ہے لیکن ساتھ ہی مرقس ۷: ۶ تا ۷ اور متی ۱۵: ۷ تا ۹ کے الفاظ بھی شامل کرلئے گئے ہیں۔ انجیل یوحنا میں سے ۵: ۳۹، ۵: ۴۵، ۹: ۲۹، ۷: ۳۰و ۱۰: ۳۹آیات مسلسل لکھی ہیں۔

دَورِ اوّل کے نسخوں کی تعداد

مذکورہ بالا نسخوں کے علاوہ اس وقت دَورِ حاضرہ میں ہمارے ہاتھوں میں پہلی تین صدیوں کے پچاس سے زائد نسخے دستیاب ہوئے ہیں، یہ نسخے مختلف کُتبِ عہد جدید کے مختلف حصوں کے ہیں۔

نتیجہ

جب ہم مسیحیت کے پہلے دَور یعنی پہلی تین صدیوں کا جائزہ لیتے ہیں توہم پر ظاہر ہوجاتا ہے کہ انجیل جلیل کے مجموعہ کی تاریخ میں یہ صدیاں سب سے زیادہ اہم ہیں ۔ منجیِ عالمین کی صلیبی موت کے عین بعد کچھ مدت تک کلیسیا کو آنخداوند کی تعلیم اور سوانحِ حیات زبانی سینہ بسینہ معلوم تھے(۱کرنتھیوں ۱۵: ۳) انہی ایام میں " بہتوں " نے ان کو قلمبند بھی کرلیا تھا(لوقا ۱: ۱) ۔ان زبانی اور تحریری ماخذوں سے ہماری موجودہ اناجیل اربعہ سیدنا مسیح کی وفات کے بیس سال کے اندر تالیف کی گئیں[1] ۔ اسی دوران میں سیدنا مسیح کے رسولوں اور مقُدس پولوس نے مختلف کلیسیاؤں کو خطوط بھی لکھے۔ پہلی دو صدیوں میں اناجیل اور خطوط کی نقلیں یونانی زبان میں بکثرت کی گئیں اور مشرق ومغرب کے بیسیوں ملکوں صدہا شہروں اور گاؤں میں چاروں انجیلیں فرداً فرداً الگ الگ طوُماروں میں نقل کی گئیں اور ان کا مجموعہ کتابی صورت میں بھی جمع ہوگیا۔ رسولوں کے اعمال اور خطوط بھی ان مقامات میں الگ الگ طوُماروں میں اور مجموعہ میں نقل ہوگئے۔

انہی پہلی دو صدیوں میں اناجیل اربعہ کے اور انجیلی مجموعہ کی دوسری کتابوں کے ترجمے (جیسا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے) سرُیانی ، لاطینی اور قبطی زبانوں میں ہوگئے اور ان کی نقلیں بھی ہر چہار سو بکثرت دیارو امصار میں مشرق ومغرب میں پھیل گئیں۔ پس اِن پہلی تین صدیوں میں انجیل جلیل کی کُتب کی نقلیں ، یونانی زبان اور ان کے ترجموں کی نقلیں ہزاروں کی تعداد میں کی گئیں ۔ لیکن قیاصرہ روم کی ایذا رسانیوں اور حوادثِ زمانہ کے دستبرد سے یہ ہزارو نسخے نہ بچ سکتے تھے اور نہ بچے ۔ تاہم متعدد پارے اور نسخے جو زیرِ زمین

[1] ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب " قدامت واصلیت اناجیل اربعہ " کی دو جلدوں میں مفصل بحث کی ہے اور ناظرین کی توجہ اس کی طرف منعطف کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ (برکت اللہ)۔

مدفُون تھے دستیاب ہوگئے ہیں جن میں سے بعض پہلی صدی کے اولین زمانہ کے ہیں جب ہم ان پاروں اور نسخوں کے متن کا مقابلہ موجودہ انجیل کے یونانی متن سے کرتے ہیں تو ہم پر یہ امر عیاں ہوجاتا ہے کہ اناجیلِ اربعہ اور عہد جدید کی دیگر کتابیں بجنسہ وہی ہیں جو پہلی صدی کے مقُدس مصنفوں اور نقل کرنے والوں نے لکھی تھیں۔

فصلِ دوم

دَورِ دوم

بڑے اور جلی حُروف کا زمانہ

(از ۳۰۰ء تا ۸۰۰ء)

دَورِ دوم کی اہمیت

یہ زمانہ انجیل جلیل کی کُتب کے نسخوں کے لئے چند وجوہ سے نہایت اہم زمانہ ہے۔

اول۔ پے پائرس کی بجائے چرم لکھنے کے لئے استعمال کیا گیا اور یہ ممکن ہوگیا کہ تمام مسیحی کُتب مقُدسہ ایک ہی جلد میں مجلد ہوسکیں۔ چوتھی صدی مسیحی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس زمانہ میں عہدِ جدید کی تمام کُتب اور یونانی زبان میں تمام کُتبِ سماوی یعنی کُتب عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کے نسخے بکثرت ایک ہی جلد میں کتابی صوُرت میں مجلد ہوگئے۔ جس طرح دَورِ حاضرہ میں وہ ایک ہی جلد میں مجلد ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ دَورِ حاضرہ میں وہ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں لیکن اس زمانہ میں وہ صاف چمڑے پر (جو صرف لکھنے کی خاطر بنایا جاتا تھا) لکھے جاتے تھے (۲۔ تمیتھیس ۴: ۱۳، اور سورہ طور آیت ۳)۔

دوم۔ حُسنِ اتفاق سے اسی زمانہ کے شروع میں (۳۱۳ء تا ۳۲۵ء) مسیحی کلیسیا کو امن اور چین نصیب ہوا اور شاہنشاہ کانسٹن ٹائن نے مسیحیت کو شاہی مذہب قرار دے دیا۔ اس نے اپنی سلطنت کے بڑے بڑے گرجاؤں کے لئے چرم پر کُتبِ مقُدسہ کی پچاس جلدیں نقل کروائیں اور اس مقصد کو سرانجام دینے کے لئے قابل ترین کاتبوں کی خدمات حاصل کیں جنہوں نے قدیم ترین اور معتبر ترین نسخوں سے نہایت حزم اور احتیاط کو کام میں لا کر کُتبِ مقُدسہ کی نقلیں تیار کیں۔ شہنشاہ کی دیکھا دیکھی سلطنت کے مختلف شہروں میں بھی ہزاروں نقلیں کی گئیں۔ اب یہ خدشہ بھی جاتا رہا تھا کہ ایذا رسانیوں کی وجہ سے کُتب مقُدسہ کے نسخے تلف ہوجائیں گے۔ اب ہر جگہ نسخوں کی مانگ ہونے لگی اور کُتبِ مقُدسہ کے نسخے شہروں، قصبوں اور گاؤں کے چھوٹے بڑے گرجاؤں میں رکھے گئے۔

چُونکہ اس دور میں پے پائرس کی بجائے چرم استعمال ہوتا تھا اور کتابی صورت نے طوُماروں کی جگہ لے لی تھی لہذا عبرانی کُتب مقُدسہ اور انجیل جلیل کا مجموعہ یعنی عہد عتیق اور عہد جدید دونوں ایک ہی نسخہ میں مجلد ہونے لگ گے۔ ان بے شمار نسخوں کی طفیل مشرق ومغرب کے ممالک میں ایک ایسا مستند یونانی متن رائج ہوگیا جس کی صحت پرجُملہ کلیسیائیں متعلق تھیں اور یہی متن چوتھی صدی سے آٹھویں صدی کے اکثر نسخوں میں پایا جاتا ہے۔

سوم۔ چمڑے کے استعمال کے ساتھ طرز تحریر بھی بدل گئی۔ چمڑا پے پائرس سے زیادہ مضبوط تھا، اس لئے اب نہ تو خوف رہا کہ اگر زور سے لکھا جائیگا تو قلم دھس جائیگا اور نہ لکھنے کے لئے جگہ کی قلت کا خوف دامنگیر رہا۔ اب نسخے جلی اور بڑے حرُوف میں نہایت نفیس نستعلیق خط میں لکھے جاتے تھے۔ یہ حروف الگ الگ لکھے جاتے تھے اور ایک دوسرے سے ملائے نہیں جاتے تھے۔

نسخوں کی تعداد

یہ زمانہ تقریباً ۶۰۰ سال کا ہے۔ عہدِ جدید کے بہترین نسخے اسی زمانہ کے ہیں۔ اس زمانہ کے کلُ نسخے جو دستیاب ہوئے ہیں تعداد میں ۱۷۰ سے زیادہ ہیں جن میں سے ۵۷ نسخے ایسے ہیں جن میں مختلف کُتُبِ عہدِ جدید مکمل طور پر موجود ہیں۔ اور باقیماندہ نسخے عہد جدید کی مختلف کُتُب کے حصص ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ میں مکمل انجیل موجود ہے۔ چار نسخے ایسے ہیں جن میں عہدِ جدید کی کل کُتُب موجود تھیں۔ لیکن اب بعض اوراق کے ضائع ہوجانے کے باعث نامکمل رہ گئے ہیں ۔ نو نسخے ایسے ہیں جن میں اناجیل اربعہ تمام وکمال موجود ہیں۔ سات نسخوں میں رسولوں کے اعمال کی کتاب محفوظ ہے۔ سات نسخوں میں مقُدس پولوس کے تمام خطوط موجود ہیں۔ نو نسخوں میں دیگر باقیماندہ خطوط محفوظ ہیں اور چار نسخوں میں مکاشفات کی کتاب تمام وکمال محفوظ ہے۔ ان ۱۶۸ نسخوں میں سے سات چوتھی صدی کے ہیں۔ پچیس پانچویں صدی کے ۔ پنتیس چھٹی صدی کے ۔ پچیس ساتویں صدی کے بیس آٹھویں صدی کے۔ تنتیالیس نویں صدی کے اور بارہ دسویں صدی کے نسخے ہیں۔

ناظرین کی دلچسپی اور واقفیت کے لئے چند قلمی نسخوں کا یہاں مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

CODEX SINAITICUS—4TH CENT.
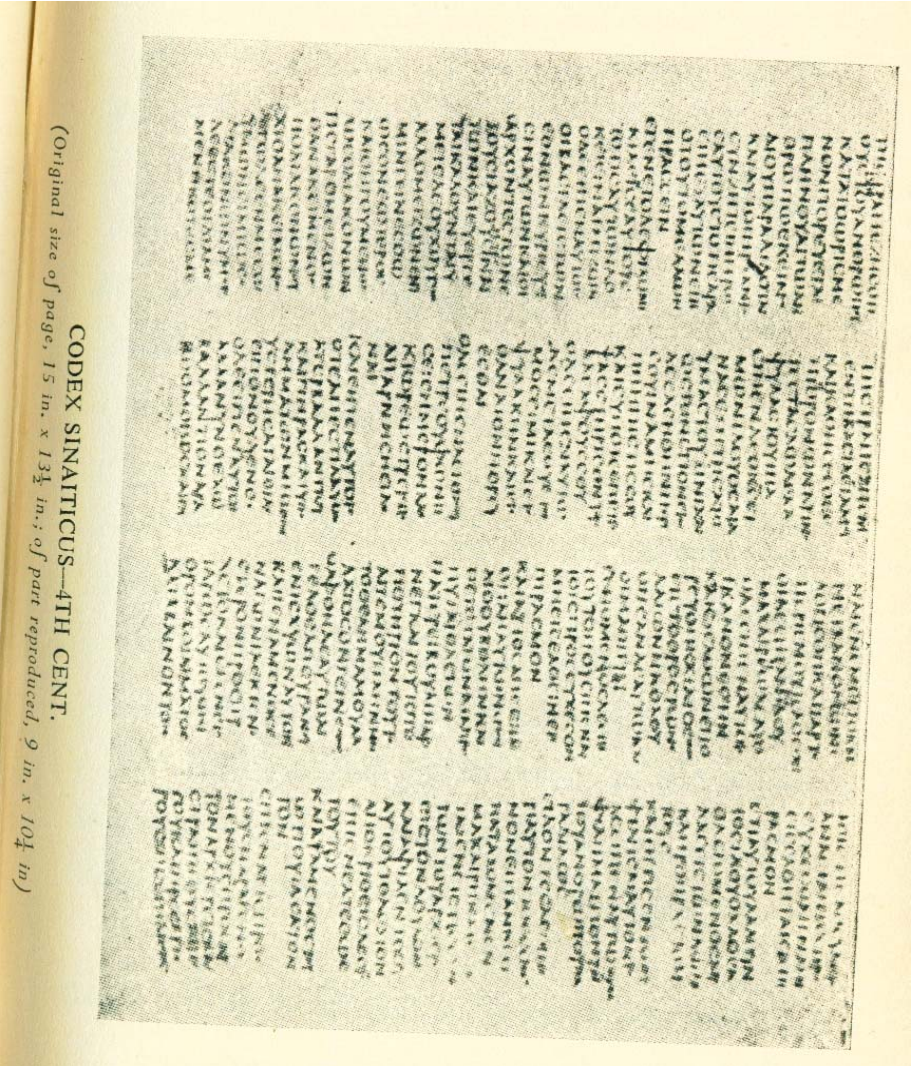
(Original size of page, 15 in. x 13½ in.; of part reproduced, 9 in. x 10¼ in)

نسخہء سینا

اول- نسخہ[1] سینا- یہ مشہور ومعروف اور نہایت معتبر نسخہ چوتھی صدی مسیحی کی پہلی چوتھائی یعنی سن ہجری سے قریب ۳۰۰ سال پہلے کا ہے- اس میں کُتبِ عہد جدید تمام وکمال محفوظ ہیں- ۱۸۴۴ء میں مشہور جرمن عالم ٹشنڈارف[2] کوہِ سینا کی خانقاہ مقُدسہ کیتھرین کو گیا- وہاں ایک ایک ردی ٹوکری میں مختلف نسخوں کے اوراق پڑے تھے- ان اوراق میں اس جرمن فاضل نے چند چرمی اور اوراق دیکھے جن پر قدیم یونانی طرز تحریر کے حروف لکھے تھے- جب اس نے ان اوراق کو غور سے پڑھا تو ان پر یونانی ترجمہ سبعینیہ (سیپٹواجنٹ) لکھا پایا- راہبوں نے اس کو بتلایا کہ ایسے بہتیرے اوراق ان کے پاس موجود ہیں- اس نے راہبوں کو کہا کہ یہ اوراق بڑی قدروقیمت کے ہیں، ان کو ضائع مت کرو، اس نے ان میں تینتالیس اوراق جن پر عبرانی کُتبِ مقُدسہ لکھی تھیں لے لئے - لیکن جب راہبوں پر ان اوراق کی اہمیت ظاہر ہوئی تو انہوں نے دیگر اوراق کو اسکے حوالے کرنے سے انکار کردیا- ۱۸۵۹ء میں وہ پھر اسی خانقاہ کو گیا- ایک راہب سے یونانی ترجمہ سبعینیہ پر گفتگو چھڑ گئی- راہب نے کہا کہ میرے پاس اس یونانی ترجمہ کی ایک قدیم نقل موجود ہے، اور ایک لال جزُدان میں سے نکال کر اس کو نسخہ دکھلایا- اس نسخہ میں نہ صرف عہدِ عتیق کا ایک بہت بڑا حصہ موجود تھا بلکہ عہدِ جدید تمام وکمال نہایت اعلیٰ حالت میں محفوظ تھا- اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، جب اس نے دیکھا کہ یہ وہی اوراق ہیں جو اس نے پندرہ سال پہلے ٹوکری میں پڑے دیکھے تھے- بصد مشکل ٹشنڈارف نے اس نسخہ کو حاصل کیا اور اپنے مربی زارروس کے پاس لے گیا- ۱۹۳۴ء میں سرکارِ برطانیہ نے اس نسخہ کو ایک لاکھ پونڈ کے عوض رُوس سے خریدا اور وہ اب برطانیہ

[1] Codex Sinaiticus

[2] Tischendorf

کے عجائب گھر میں محفوظ ہے- ۱۹۱۱ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے چھاپہ خانہ نے اس نسخہ کی عکسی تصویریں لے کر اس کو کتابی صورت میں شائع کیا، اور اب ہر ناظر اس قیمتی نادر اور معتبر نسخہ کو چند داموں کے عوض اپنے کُتب خانہ میں رکھ سکتا ہے-

یہ نسخہ غزال کے چمڑے پر لکھا ہے اور اس کا ہر قرطاس پندرہ سے ساڑھے تیرہ انچ ہے- ہر صفحہ پر چار کالم میں جو ڈھائی انچ چوڑے ہیں اور ہر کالم میں ۴۸ سطریں ہیں- اس قلمی نسخہ کا متن اعلیٰ تریں اور صحیح ترین ہے-

نسخہ ویٹی کن

دوم- نسخہ ویٹی کن[3] - یہ نسخہ بھی چوتھی صدی کا ہے- اورمذکورہ بالا نسخہ سینا سے زیادہ قدیم اور اس کی مانند نہایت صحیح ہے- یہ نسخہ غالباً مصر میں لکھا گیا تھا، اوراب روم میں ویٹی کن یعنی پوپ صاحب کے کُتبِ خانہ میں موجود ہے-اس میں تمام یونانی بائبل محفوظ ہے اور یونانی بائبل کے تمام نسخوں میں قدیم ترین اور معتبر ترین قلمی نسخہ ہے- اس کا متن وہی ہے جو نسخہ سینا کا ہے- یہی متن مصر میں چوتھی صدی کی ابتدا میں مروج تھا- یہ دونوں نسخے نہ صرف اکثر آپس میں اتفاق کرتے ہیں بلکہ دونوں کی اصل ایک ہی ہے، اگرچہ وہ کسی ایک نسخے کی نقل نہیں ہیں- اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان نسخوں کا متن وہی مستند متن ہے جو الہامی مصنفین نے لکھا تھا-

اس نسخہ میں عہدِ عتیق کا قدیم ترین یونانی متن موجود ہے - ۱۸۹۰ء میں اس بیش بہا نسخہ کی عکسی تصاویر شائع کی گئیں- اور اب یہ نسخہ ہر شخص کے کُتب خانہ کی زینت بن سکتا ہے-

[3] Codex Vaticanus

یہ قلمی نسخہ غزال کے چمڑے پر لکھا ہے، اس کی شکل مربع صورت کی ہے اور ساڑھے دس انچ ہے۔ نہایت نفیس خط میں لکھا ہے۔ ہر صفحہ پر تین کالم یا تین قطاریں ہیں۔ اس نسخہ میں تقریباً تمام عہدِجدید کی کُتب موجود ہیں لیکن صرف عبرانیوں ۹: ۱۴ تاآخر اور مقُدس پولوس کے پاسٹرل خطوط اور مکاشفات کی کتاب نہیں ہے۔

حال ہی میں پے پائرس کا ایک قدیم نسخہ دستیاب ہوا ہے جس میں عبرانیوں کے خط کا ایک بڑا حصہ لکھاہوا ہے۔ اس پے پائرس کی ایک طرف لوی Levy کی کتاب لکھی ہوئی ہے اور دوسری جانب عبرانیوں کا خط لکھا ہے جو چوتھی صدی میں نقل کیا گیا تھا۔ ہم اوپر بتلاچکے ہیں کہ نسخہ ویٹی کن میں عبرانیوں کا خط ۹: ۱۴ آیت کے بعد موجود نہیں ہے پس اس خط کے صحیح متن کو معلوم کرنے کے لئے پے پائرس کا یہ نسخہ نہایت کارآمد ثابت ہوا ہے۔

نسخہ سینا اور نسخہ ویٹی کن دونوں میں انجیل جلیل کا صحیح ترین اور معتبر ترین متن موجود ہے۔ نہایت اغلب ہے کہ یہ دونوں نسخے ان پچاس نسخوں میں سے ہیں جو بشپ یوسیبئیس[1] نے شاہنشاہ کانسٹن ٹائن کے حکم کے مطابق نقل کروا کر قسطنطنیہ بھیجے تھے۔ یوسی بیئس ہم کو بتلاتا ہے کہ ان پچاس نسخوں میں ہر صفحہ پر عبارت چار کالموں (قطاروں) اور تین کالموں میں لکھی گئی تھی۔ ہم اوپر بتلاچکے ہیں کہ نسخہ سینا کی عبارت چار کالموں میں اور نسخہ ویٹی کن کی عبارت تین کالموں میں لکھی ہے۔ پس اغلب ہے کہ یہ دونوں نسخے ان پچاس نسخوں میں سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا متن بھی اعلیٰ ترین پایہ کا ہے۔

[1] Eusebius

نسخہ سکندریہ

سوم۔ نسخہ سکندریہ[2]، یہ قلمی نسخہ یونانی بائبل کے نسخوں میں سب سے زیادہ معروف نسخہ ہے۔ یہ سکندریہ میں نہیں لکھا گیا تھا۔ گویہ نسخہ سکندریہ کھلاتا ہے۔ اسکے نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ نسخہ سکندریہ کے پیٹرپارک سرل لُوکر (۱۶۰۲ء تا ۱۶۲۱ء) کے کُتب خانہ میں تھا جس نے ۱۶۲۵ء میں اس کو جیمس اول شاہِ انگلستان کی نذر کردیا۔ اس کے آخر میں عربی زبان میں ایک نوٹ میں لکھا ہے "کھتے ہیں کہ یہ کتاب شہیدِ خاتون تھیکلہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔"

یہ نسخہ پتلے چمڑے پر لکھا ہوا ہے اور ساڑھے بارہ سے ساڑھے دس انچ کا ہے۔ اس کے ۷۷۳ اوراق ہیں۔ ہر صفحہ پر دو قطاریں ہیں۔ متن جلی کلاں حروف میں لکھا ہوا ہے۔ اس میں عہدِجدید کی کُتب میں سے متی ۲۵: ۶ تک ورق نہیں ہیں نیز یوحنا ۶: ۵۰ تا ۸: ۵۲ اور ۲ کرنتھیوں ۴: ۱۳ تا ۱۲: ۶ کے اوراق اس میں اب موجود نہیں رہے۔

یہ نسخہ غالباً قسطنطنیہ میں پانچویں صدی کے پہلے حصے میں لکھا گیا تھا۔ اس کی صحت نہایت بلند پایہ کی ہے حتیٰ کہ تواریخ، عزرا اور نحمیاہ کی کُتب میں جونام لکھے ہیں ان کو بھی ایسی صحت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ ان میں کوئی غلطی پائی نہیں جاتی۔ عہدِجدید کی کُتب میں بھی صرف معدودے چند غلطیاں ہیں۔ اس میں اناجیلِ اربعہ کا متن ایسا معتبر نہیں ہے مگر اعمال الرسل سے مکاشفات کے آخر تک کا متن نہایت اعلیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نقل کرتے وقت کاتب نے جن طوماروں سے اناجیل اربعہ کو نقل کیا تھا، ان میں کتابت کی غلطیاں موجود تھیں۔لیکن جن طوماروں سے باقی کُتب نقل کی گئی ہیں ان میں کتابت کی غلطیاں موجود نہیں تھیں۔

[2] Codex Alexandrinus

نسخہ واشنگٹن

۱۹۰۶ء میں ایک امریکن فری ار کے ہاتھ چند نسخے آئے جو اصلی جھلی نما قرطاس پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ نسخے واشنگٹن میں ہیں۔ان نسخوں میں سے ایک میں رسولوں کے اعمال، خطوطِ عام اور مقُدس پولوس کے خطوط تھے لیکن اب اعمال سے رومیوں تک کا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ اس نسخہ کا متن نسخہ ٹیسنا، نسخہ ویٹی کن اور نسخہ سکندریہ کے مطابق ہے۔ ایک اور نسخہ اناجیل اربعہ پر مشتمل ہے اور غالباً چوتھی صدی کا ہے۔ یہ نسخہ خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مختلف اناجیل اربعہ کے متن الگ الگ نسخوں سے نقل کئے گئے ہیں ۔ یہ امر کوئی حیرت کا موجب نہیں کیونکہ جیسا ہم اوپر بتلا چکے ہیں پہلے دور میں عموماً مختلف کُتب مختلف طوُماروں پر نقل کی جاتی تھیں۔ اس نسخہ میں مقُدس مرقس کی انجیل کے آخری باب کی چودھویں آیت کے بعد ایک تتمہ لکھا ہے جو بالکل نیا ہے۔ اس نسخہ میں ایک اور امر قابلِ غور ہے عام طور پر مرقس ۲: ۲۶ میں سردار کاہن کا نام "ابیاتر" لکھا ہوتا ہے جو غلط ہے (دیکھو ۱۔سموئیل ۲۱ باب) ۔ بعض اہم نسخوں میں اس جگہ کوئی نام لکھا ہوا نہیں ملتا۔ اس نسخہ میں بھی کوئی نام لکھا ہوا نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ" ابیاتر" اس انجیل کے اصل متن کا حصہ نہیں تھا بلکہ قدیم زمانہ کے کسی کاتب نے اس نام کو حاشیہ میں لکھ دیا تھا جس کا مابعد کے کاتبوں نے حاشیہ سے متن میں نقل کردیا۔

اس نسخہ میں یوحنا ۷: ۵۳ تا ۸: ۱۱ کی آیات موجود نہیں ہیں۔ بعض دیگر نسخوں میں یہ آیات دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں مثلاً فری ار کے ایک نسخہ میں یہ آیات لوقا ۲۱: ۳۸ کے بعد لکھی ہیں۔ نسخہ واشنگٹن میں جیسا ہم ابھی بتلا چکے ہیں یہ آیات نہیں پائی جاتیں۔ یہ آیات مصر کے قدیم صمیدی ترجمہ (جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا) میں بھی موجود نہیں ہیں جس سے ظاہر ہے کہ یہ آیات دراصل انجیلِ یوحنا کا حصہ نہیں تھیں۔

نسخہ واشنگٹن میں یوحنا ۹: ۳۸ کے الفاظ اور ۳۹ آیت کے ابتدائی الفاظ" یسوع نے کہا" موجود نہیں ہیں۔ اسی امر میں یہ نسخہ کوہِ سیناء کے نسخہ اور قدیم لاطینی نسخوں (جن کا ذکر آئندہ آگے گا) کے متن سے متفق ہے۔

نسخہ افرائیمی

پنجم۔ افرائیمی نسخہ۔ چونکہ ہم ناظرین کا تعارف ان ہزاروں نسخوں کی مختلف اقسام سے کرانا چاہتے ہیں لہذا یہاں ایک اور قسم کے نسخہ کا ذکر کرتے ہیں ۔ یہ قلمی نسخہ جس کا ذکر ہم اب کرتے ہیں نسخہ افرائیمی[1] کہلاتا ہے اور چمڑے پر لکھا ہے۔لیکن اس چمڑے پر یکے بعد دیگرے دو تحریریں ایک دوسری کے اوپر لکھی ہوئی ہیں۔ نچلی عبارت کُتبِ مقُدسہ کے متن کی عبارت ہے۔ چوُنکہ چمڑا مہنگا تھا اور آسانی سے دستیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ لہذا جب پہلی دو سطروں کے درمیان دوسری عبارت انہی اوراق پر لکھی جاتی تھی تو پہلی عبارت کو نرم پتھر کے ساتھ رگڑ کر تقریباً محو کردیا جاتا تھا۔ لیکن مرُورِ زمانہ سے وہ پہلی تحریر کچھ دھیمی سی نظر آنے لگ جاتی ہے، یہی حال نسخہ افرائیمی کا ہے اوراس نسخہ کی پہلی تحریر نظر آنے لگی۔ یہ نسخہ سولہویں صدی میں اطالیہ آیا جب یونانی نسخوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں اطالیہ میں پناہ لی۔ یہ نسخہ شاہی خاندان کی ملکیت تھا۔ جب کیتھرین فرانس کی ملکہ ہوئی تو وہ اپنے ساتھ اس نسخہ کو اطالیہ سے فرانس لے آئی۔ تب سے یہ نسخہ پیرس کے کُتب خانہ میں موجود ہے۔

مذکورہ بالا تین نسخوں کی طرح اس قلمی نسخے میں بھی پہلے یونانی بائبل تمام وکمال محفوظ تھی لیکن اب اس میں عہدِ عتیق کی کتب کے چند حصص ہیں اور عہد جدید کی تمام کُتب سوائے ۲۔ تسلنیکیوں اور ۲ یوحنا کے محفوظ ہیں۔

[1] Codex Ephraemi

اس نسخہ میں ۲۰۹ اوراق ہیں۔ اس کی تقطیع ساڑھے بارہ اور نو انچ ہے اور اچھے چمڑے پر لکھا ہے۔ ہر صفحہ پر صرف ایک قطار ہے۔ اور نسخہ سکندریہ کی طرح اس کے حرُوف جلی اور کلاں ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے اتنا مشابہ ہیں کہ ہم بغیر کسی تامل کے کہہ سکتے ہیں کہ دونوں نسخے پانچویں صدی کے پہلے نصف میں (یعنی از ۴۰۰ء تا ۴۵۰ء) لکھے گئے تھے۔

اس نسخہ کا متن معمولی ہے یعنی نہ تو اعلیٰ درجہ کا متن ہے اور نہ ایسا ہے کہ اس میں بہت غلطیاں ہوں۔ پس یہ نسخہ نہ تو بہت معتبر ہے اور نہ بہت غلط ہے۔

خربت مرد کے نسخہ جات

ہم حصہ اول کے باب پنجم کی فصلِ دوم میں زیرِ عنوان "کنارِ بحر مُردار کے طوُمار" خربتِ مرد کا ذکر کر آئے ہیں ۔ یہ کھنڈرات وادی قمران اور وادی مربعات کے درمیان واقع ہیں۔ یہاں پانی کا ایک نالہ النار مغرب سے بہتا ہوا بحر مُردار میں جا گرتا ہے۔ یہ نالہ وہی ہے جس کو مقُدس یوحنا اپنی انجیل میں " قدرون کا نالہ " (۱۸ : ۱) کہتا ہے جو یروشلیم اور زیتون کے پہاڑ کے درمیان واقع ہے۔ اس نالہ کے شمال کی جانب خربت مرد کے کھنڈرات ہیں جہاں سے قبیلہ تعمیرہ کے بدوؤں نے چند ایک نسخے کھود نکالے۔ ان نسخوں میں سے بعض پر کتاب مقُدس کی آیات یونانی زبان میں اور کنعانی سرُیانی زبان میں لکھی ہیں۔ یونانی زبان کے نسخوں میں انجیل مرقس، انجیل یوحنا، کتابِ اعمالرسل نقل کی گئی ہیں۔ یہ نسخے پانچویں اور آٹھویں صدی کے درمیان کے ہیں۔ کنعانی سرُیانی زبان کے نسخوں پر یشوع کی کتاب کے بعض حصے اور انجیل لوقا، انجیل یوحنا اوراعمال کی کتاب اور کلسیوں کے نام خط لکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ نسخے فرقہ قمران کے ان یہودی افراد کے ہوں جنہوں نے دوسری مسیحی صدی میں مسیحیت اختیار کرلی تھی اور ان کی نسلیں بحرِ مُردار کے مضافات میں بس گئی ہوں۔

بعض دیگر نسخے

سکندریہ کی فاروقِ اول یونیورسٹی کے پروفیسر عطیہ کو کوہِ سینا پر کی مقُدسہ کیتھرین کی خانقاہ سے بائبل کا ایک قدیم نسخہ ملا ہے جس پر یکے بعد دیگرے پانچ زبانوں میں بائبل کے ترجموں کا متن لکھا[1] ہے۔ چنانچہ اس پر پہلے قدیم یونانی حرُوف میں بائبل کا یونانی ترجمہ لکھا گیا۔ پھر ایک صدی کے بعد اس یونانی ترجمہ کو رگڑ کر ہٹا دیا گیا اور اسی قرطاس پر سریانی ترجمہ بائبل لکھا گیا۔ اس کے ایک صدی بعد پانچویں صدی کے اواخر میں پہلے ترجمہ کو رگڑ کر ایک اور سریانی ترجمہ لکھا گیا۔ ساتویں صدی میں یہ ترجمہ بھی رگڑ کر مٹادیا گیا اور اسی نسخہ پر قدیم کوفی حروف میں بائبل کا ترجمہ لکھا گیا۔ پھر ایک صدی بعد اس تحریر کو بھی مٹادیا گیا اور پانچویں بار بائبل کو ان کوفی حرُوف میں لکھا گیا جو آٹھویں اور نویں صدی میں مروج تھے۔ علماء ان پانچوں تحریروں کا " انفراریڈ"Infrared اور " الٹراوائلٹ رے " Ultra Violet Ray کے ذریعہ مطالعہ کررہے ہیں۔

نسخہ بیزائی

ششم۔ نسخہ بیزائی[2]۔ ایک لحاظ سے یہ نسخہ عہدِ جدید کے تمام یونانی نسخوں میں ممتاز۔سولھویں صدی کے فاضل تھیوڈور[3] بیزا نے شہر لائنز[4] کی ایک خانقاہ سے اس کو حاصل کیا۔ ۱۸۹۹ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے چھاپہ خانہ نے اس کی عکسی تصاویر شائع کردیں اوراب یہ قیمتی نسخہ ہر شخص اپنے کتُب خانہ کے لئے حاصل کرسکتا ہے۔ اس نسخہ میں اور مذکورہ بالا نسخوں میں کچھ فرق ہے۔ مثلاً پہلے چاروں نسخوں میں یونانی بائبل کی تمام کتُب

[1] Hindustan Times, Delhi, August 20 1950.

[2] Codex Bezae

[3] Theodore Beza

[4] Lyons

نقل کی گئیں تھیں لیکن اس نسخہ میں صرف عہدِ جدید کی کُتُب نقل کی گئیں۔ اس نسخہ میں عہدِ جدید کی کُتُب میں سے صرف اناجیل اربعہ کتاب اعمال الرسل اور خطوطِ عام یونانی زبان میں ہیں۔ اناجیل اربعہ کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ پہلے متی پھر یوحنا لوقا اور پھر ۳ یوحنا ۱۱: ۱۵ آیات لاطینی زبان میں ہیں اور سب سے بعد مرقس کی انجیل لکھی ہے۔ اس نسخہ میں نہ صرف یونانی زبان میں کُتُبِ عہدِ جدید موجود ہیں، بلکہ لاطینی زبان کا ترجمہ بھی مقابل کے صفحہ پر نقل کیا گیا ہے۔ بائیں صفحہ پر یونانی اصل عبارت نقل کی گئی ہے اور دائیں صفحہ پر بالمقابل اس کا لاطینی ترجمہ نقل کیا گیا ہے۔

اس نسخہ کی تقطیع ۱۰ سے ۸ انچ ہے۔ اور علماُء کا خیال ہے کہ یہ نسخہ پانچویں صدی کے آخر یا اوائل چھٹی صدی میں یعنی (از ۴۵۰ء تا ۵۲۵ء) میں لکھا گیا تھا۔ یہ نسخہ غالباً جنوبی فرانس میں لکھا گیا تھا اور چونکہ اس ملک میں ایشیائے کوچک کے مبلغین نے مسیحیت کی اشاعت کی تھی لہذا یہ نسخہ دو زبانوں میں یعنی لاطینی زبان میں (جو اہلِ مغرب کی زبان تھی) اور یونانی زبان میں (جو اہلِ مشرق کی زبان تھی) لکھا گیا۔ اس نسخہ کی لاطینی اور مقُدس آئرنیوس[1] کی لاطینی ایک ہی ہے۔ مقُدس آئیرنیوس کا زمانہ ۱۳۳ء تا ۲۰۳ء تھا۔ پس ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس نسخہ کا متن کس قدر قدیم اور معتبر ہے۔

اس نسخہ کا متن متعدد مقامات میں دیگر یونانی نسخوں سے قدرے مختلف ہے اور عہد جدید کے پُرانے سریانی اور پرُانے لاطینی ترجموں (جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا) کے مطابق ہے۔ اناجیل اربعہ کا متن اور بالخصوص کتاب اعمال الرسل کا متن دیگر نسخوں سے مختلف ہے۔ اس نسخہ کا مطالعہ یہ امر واضح کردیتا ہے، کہ یونانی متن اور لاطینی متن نے ایک دوسرے کو متاثر کررکھا ہے۔

[1] Irenus

فصلِ سوم

دَورِ سوم

چھوٹے حرُوف کا زمانہ

(از ۸۰۰ء تا ۱۴۰۰ء)

طرزِ تحریر اور حرُوف کی تبدیلی

دوسرا دور بڑے اور جلی حروف کا زمانہ تھا۔ لیکن تیسرے دور میں بڑے حروف کی بجائے چھوٹے حروف استعمال ہونے لگے۔ پس ان دونوں زبانوں میں نہ صرف طرز تحریر کا اختلاف ہے بلکہ مختلف حُروف کی شکلوں کا بھی اختلاف ہے۔ کیونکہ بڑے حرُوف ایک دوسرے سے الگ لکھے جاتے تھے لیکن چھوٹے حروف شکستہ خط میں ایک دوسرے کے ساتھ ملادئیے جانے لگے۔ اس طرز عمل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ بھاری اور ضخیم جلدوں کی بجائے چھوٹی تقطیع کے نسخے لکھے جانے لگے جن کو بآسانی تمام ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاسکتے تھے۔ اس زمانہ کے اوائل میں رق یعنی چمڑا استعمال کیا جاتا تھا لیکن ۱۲۰۰ء سے کاغذ کا استعمال ہونا شروع ہوگیا۔ پندرھویں صدی کے وسط میں چھاپے کے حرُوف ایجاد ہوگئے اور قلمی نسخوں کی کتابت ختم ہوگئی۔

ابواب وآیات کی تقسیم

اسی زمانہ میں کارڈینل کیروCardinal Careu نے ۱۲۳۸ء میں عہدِجدید کی مختلف کُتُب کو سہولت کی خاطر ابواب میں منقسم کیا۔ اور ۱۵۵۱ء میں یہ رابرٹ اسٹیفنسRobert Stephens نے ان ابواب کوآیات میں تقسیم کیا۔

دَورِ سوم کے نسخوں کی تعداد

اس دَور کے کل نسخہ جات جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں تین ہزار سے زائد ہیں ۔ان میں سے پانچ سوسات نسخوں میں اعمال الرسل اور عام خطوط محفوظ ہیں۔ پانچ سو پچانوے نسخوں میں مقُدس پولوس کے خطوط محفوظ ہیں، اور دو سو قلمی نسخوں میں مکاشفات کی کتاب محفوظ ہے۔

باب چہارم

اَورادِ کتُبِ مقُدسہ کے نسخہ جات کی شہادت

لفظ" اَوراد" کا مفہوم

مذکورہ بالا تینوں زمانوں کے ہزاروں نسخوں کے علاوہ ہمارے ہاتھوں میں انجیل جلیل کے اَوراد کے نسخے بھی موجود ہیں ۔ ابتدا ہی سے کلیسیا میں یہ دستور چلاآتا ہے کہ عبادت کےوقت گرجاؤں میں تمام سال کے دنوں اور مختلف تیوہاروں کے موقعوں پر انجیل کے مختلف حصص پڑھے جاتے ہیں ۔ ان حصص کو مسیحی اصطلاح میں "اَوراد" کہتے ہیں۔چنانچہ کلیسیائے ہندو پاکستان میں یہ قدیم دستوراب تک چلاآتا ہے ۔اس دستور کے مطابق روزانہ گرجا میں انجیل کا ایک خاص مقررہ حصہ جو " ورد" کہلاتا ہے پڑھا جاتا ہے۔ اس دستور کے مطابق کلیسیائے ہندو پاک کے گرجاؤں میں انجیل شَریف کی تمام کتُب سال میں دو دفعہ اور عہدِ عتیق کی کتُب سال میں ایک دفعہ پڑھی جاتی ہیں ۔ قدیم زمانہ میں ان وردوں کے نسخے گرجاؤں میں رکھے رہتے تھے۔اور حسبِ موقعہ مقررہ حصص روزانہ پڑھے جاتے تھے۔ ان نسخوں میں اناجیل اور اعمال اور خطوط محفوظ ہیں۔ یہ نسخے دوسرے اور تیسرے دوروں کے ہیں۔ جو نسخے دوسرے دور سے متعلق ہیں وہ نویں صدی (از ۸۰۰ء تا ۹۰۰ء) سے پہلے کے نہیں ہیں۔

ان اوراد کے نسخوں کا شمار تاحال ایک ہزار چھو سو نو (۱۶۰۹ء) سے زیادہ ہے اور نت نئے نسخے دستیاب ہوتے رہتے ہیں ۔ ایک سواڑسٹھ نسخے ایسے ہیں جن میں اناجیل اور اعمالرالرسل اور خطوط محفوظ ہیں اور دو سو پندرہ ایسے ہیں جن میں اعمال الرسل اور خطوط محفوظ ہیں۔

یونانی نسخوں کی کلُ تعداد

پس کتُب عہد جدید کے صحیح اور معتبر یونانی متن کو معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس انیس سو سال کے قدیم نسخے موجود ہیں ۔ ناظرین کی یاد دہانی کی خاطر ہم ان نسخوں کی تعداد یک جا کرکے لکھ دیتے ہیں تاکہ ان کی پوری اہمیت ایک ہی نظر میں ظاہر ہوجائے۔

(۱ ۔) دَورِ اول ۔ از ۵۰ء تا ۳۰۰ء ۶۰ سے نسخہ جات یونانی سے زائد ہیں ۔

(۲ ۔)دَورِ دوم ۔ از ۳۰۰ء تا ۸۰۰ء ۲۰۰ نسخہ جات یونانی سے زائد ہیں۔

(۳۔) دَورِ سوم ۔ از ۸۰۰ء تا ۱۴۰۰ء ۳۰۰۰ نسخہ جات یونانی سے زائد ہیں۔

(۴۔) اَوراد کے نسخہ جات کم از کم ۱۵۶۵ نسخہ جات یونانی سے زائد ہیں۔

کل تعداد نسخہ جات یونانی سے زائد پانچ ہزار۔

ناظرین پر مخفی نہ رہے کہ یہ پانچ ہزار سے زیادہ نسخے جواب ہمارے ہاتھوں میں ہیں صرف اصلی یونانی زبان کے ہیں۔ جس زبان میں انجیل جلیل کی مختلف کتُب لکھی گئیں تھیں۔ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ زمین مصر سے ہمیں اور نسخے بھی آئندہ زمانہ میں ہاتھ آئیں بالخصوص پہلی دو صدیوں کے قلمی نسخے جن میں مکمل انجیل کی نقل ہو۔ بہر حال ہر شخص جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں عقل ہے یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان یونانی نسخوں کے ذریعہ جو تعداد میں پانچ ہزار سے زائد ہیں ہم انجیل جلیل کی مختلف کتُب کا صحیح ترین متن معلوم کرسکتے ہیں۔

بابِ پنجم

کُتبِ عہدِ جدید کے تراجم کی شہادت

عہدِ جدید کی کُتب ایک لحاظ سے دنیا کی تمام قدیم کتابوں سے ممتاز ہیں۔ دیگر قدیم کُتب کی صحیح عبارت معلوم کرنے کے ذرائع نسبتاً محدود ہیں کیونکہ ان کتابوں کی نقلیں صرف ان کی اصل زبانوں میں ہوئی تھیں اور صرف ایسی نقلوں کے ذریعہ ہم ان کی اصلی عبارت کو معلوم کرسکتے ہیں۔ لیکن انجیلِ جلیل کی کُتب کی صحیح عبارت معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس نہ صرف ان کی اصلی زبان یعنی یونانی میں قریباً پانچ ہزار یونانی نسخے موجود ہیں (جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے) بلکہ ان کُتب کے مختلف زمانوں، ملکوں اور زبانوں کے قدیم ترین ترجمے بھی موجود ہیں جن کے ذریعہ قدیم اور مستند متن کا پتہ چل سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض ترجمے ایسے ہیں جو پہلی تین صدیوں کے موجودہ نسخوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحیت ابتدا ہی سے تبلیغی مذہب رہا ہے اور مسیحی مبلغین منجی عالمین کی آخری وصیت کے مطابق اقصائے عالم تک پہنچ گئے۔ وہ جس ملک میں گئے اپنے ساتھ انجیل لے گئے اور انہوں نے اس ملک کی زبان میں انجیل کی کُتب کا ترجمہ کردیا جس طرح دَورِ حاضرہ میں مختلف بائبل سوسائٹیوں نے انجیل جلیل کی کُتب کا ترجمہ ایک ہزار دوسو بارہ(۱۲۱۲) زبانوں میں کردیا ہے۔

پس انجیلِ جلیل کے صحیح متن کو معلوم کرنے کے لئے نہ صرف ہمارے پاس پانچ ہزار سے زائد نسخے اصلی یونانی زبانوں میں ہیں بلکہ مشرقی اور مغربی ممالک کی زبانوں کے قدیم ترین ترجموں کے نسخے ہزاروں کی تعداد میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان مختلف ترجموں کا اصلی زبان کے ساتھ مقابلہ کرکے ہم صحیح متن کو جانچ پڑتال کرسکتے ہیں۔ جو انجیل دَورِ حاضرہ میں ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ اسی جانچ پڑتال اور مقابلہ کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا متن صحیح اور مستند متن ہے۔

انجیل کی یونانی زبان کی خصوصیت

خدا کی حکمت دیکھو کہ عہدِ جدید کی کُتب کے مصنفین یہودی مسیحی تھے اور اگروہ عبرانی ارامی زبانوں میں ہی اپنی کُتب کو لکھتے تو یہ ایک فطرتی بات ہوتی۔ بالخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ مقُدس متی نے ابتدائی زمانہ میں سیدنا مسیح کے کلماتِ طیبات کو ارامی زبان میں قلمبند تھا تو اگر تمام اناجیل اور مکتوبات صرف ارامی میں فی زمانہ موجود ہوتے تو کوئی حیرت کا مقام نہ ہوتا۔ لیکن خدا کی زیرہدائت اناجیل اور مکتوبات وغیرہ نے یونانی لباس[1] پہنا۔ اگر عہدِ جدید کی کُتب صرف ارامی زبان میں ہی لکھی رہ جاتیں تو مسیحیت کنعان کی حدود سے آگے نہ بڑھتی پس الہٰی انتظام نے انجیل کو یونانی زبان کا لباس پہنایا جو پہلی صدی مسیحی سے قبل مہذب دنیا کی بین الاقوامی زبان ہوگئی تھی اورہندوستان سے روما تک بولی جاتی تھی۔ لہذا وہ انجیل جلیل کی حیرت انگیز اشاعت میں ممدومعاون ثابت ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجیل جلیل کے نسخے اور ترجمے اوائل صدیومیں اطرافِ عالم میں پھیل گئے۔

انجیل کی یونانی زبان کے متعلق ایک اور امر قابلِ غور ہے۔ کُتبِ عہد جدید کی یونانی زبان کوئی اعلیٰ درجہ کی زبان نہیں ہے۔ اس میں یونانی مصنفین مثلاً افلاطون وغیرہ کی سی فصیح اور بلیغ ٹکسالی زبان نہیں ہے۔ ان مصنفین کی یونانی اور کُتبِ عہد جدید کی یونانی میں وہی فرق ہے جو کسی مسلم الثبوت دہلوی یا لکھنوی ادیب کی زبان اور کسی معمولی لکھے پڑھے پنجابی کی اردو میں پایا جاتا ہے۔ کُتبِ عہدِ جدید کی زبان وہ ہے جوروزمرہ کی بول چال میں استعمال ہوتی تھی۔ پس انجیل کی یونانی زبان مرکب جملوں سے اور مشکل اور مغلق الفاظ

[1] ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب "قدامت اوصلیت اناجیل اربعہ" کی دو جلدوں میں مفصل بحث کی ہے۔(برکت اللہ)

سے پاک ہے اور مختصر فقروں اور سادہ الفاظ میں مصنف کے مطلب کو ادا کرتی ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انجیل جلیل کی کُتُب کی زبان دنیا کی مختلف زبانوں میں نہایت آسانی سے ترجمہ ہوسکتی ہے۔ پس یہ خدا کی عینِ حکمت تھی کہ انجیل جلیل کا پیغام نہ صرف یونانی زبان میں لکھا گیا بلکہ ایسی یونانی میں لکھا گیا جو بآسانی ترجمہ ہو کر تمام دنیا کے ممالک اور افراد تک پہنچ جائے۔ کُتُبِ عہد جدید پہلی صدی میں لکھی گئیں اور جوُں جوُں مسیحیت کی اشاعت مختلف ممالک میں ہوئی گئی انجیل کی کتابوں کے ترجمے بھی اُن ممالک کی زبانوں میں ہوتے گئے۔

ترجموں سے اصل متن کو جانچنے کے اُصول

انجیلِ جلیل کے اصل یونانی متن کو معلوم کرنے کے لئے مختلف زبانوں اور ملکوں کے ترجمے نہایت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ نقادوں نے اس مقصد کے لئے متعدد اُصول وضع کئے ہیں جن میں سے چند ایک نہایت عام فہم ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کی خاطر ہم ان کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱۔) ظاہر ہے کہ اس نقطہ نظر سے کہ کسی ترجمہ کا فائدہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب ہم اس ترجمہ کے ذریعہ اصل یونانی متن کو بآسانی معلوم کرسکیں۔ پس وہ ترجمہ زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے جو زیادہ سہولیت سے اس مقصد کو پورا کرتا ہے۔

(۲۔) اس قسم کے ترجمہ کو ہم از سرِ نو یونانی میں دوبارہ ترجمہ کرکے اس یونانی اصل یونانی کو معلوم کرسکتے ہیں جو اصل مترجمین کے سامنے تھا اور جس سے وہ ترجمہ تیار کیا گیا تھا۔

(۳۔) اگر پیشِ نظر ترجمہ لفظی ہو جس میں زبان کے محاورہ کی پروانہ کی گئی ہو تو ایسا ترجمہ اصل یونانی متن کو معلوم کرنے کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہوتا ہے ۔ اس نکتہ کو ناظرین کے ذہن نشین کرنے کی خاطر ہم قرآن عربی کی مثال لیتے ہیں۔ ہم قرآن کے عربی متن کو شاہ عبدالقادر دہلوی کے تحت اللفظی اردو ترجمہ کو از سر نو دوبارہ عربی میں ترجمہ کرکے بآسانی معلوم کرسکتے ہیں کیونکہ اس میں اردو زبان کے فقروں کی ساخت اور محاورہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ لیکن ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی کے بامحاورہ اردو ترجمہ سے ہم اصل عربی عبارت کے الفاظ کو ویسی آسانی سے معلوم نہیں کرسکتے۔

(۴۔) اگر ترجمہ ابتدائی زمانہ میں کیا گیا ہو تو قدیم اصلی یونانی متن بآسانی معلوم ہوسکتا ہے کیونکہ مترجم کے سامنے قدیم ترین یونانی نسخہ ہوگا جو نہایت معتبر ہوگا۔

(۵۔) اگر مترجم فاضل اور عالم ہو تو اس کے علم وفضیلت کی وجہ سے ترجمہ بھی نہایت قابل قدر ومنزلت ہوگا اور اس امر کا بھی یقین ہوگا کہ اس نے اعلیٰ ترین پایہ والے متن کے نسخہ سے ترجمہ کیا ہوگا۔

(۶۔) ہمیں ترجموں کے نسخوں میں سہو کاتب کے وجود کا خیال رکھنا چاہیے ۔ ظاہر ہے کہ جس اصلی یونانی نسخوں کی نقل میں کتابت کے وقت غلطیاں واقع ہوسکتی ہیں اسی طرح ان ترجموں کے نقلوں میں بھی کتابت کی غلطیاں واقع ہوسکتی ہیں اور ہوئی ہیں لیکن ایک ہی ترجمہ کے مختلف نسخوں کے مقابلہ سے ان غلطیوں کا پتہ مل جاتا ہے۔

(۷۔) مختلف زبانوں کے ترجموں کے مقابلے سے بھی سہو کاتب کا علم ہوجاتا ہے کیونکہ مختلف زبانوں کے ترجموں کی کتابت میں ایک ہی قسم کی غلطی کا واقع ہونا ایک ناممکن امر ہے۔علاوہ ازیں مختلف ترجموں میں قدرتاً ایک ہی لفظ کی غلطی واقع نہیں ہوسکتی۔ پس مختلف زمانوں ، ملکوں ، اور زبانوں کے ترجموں کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرنے سے ایک ترجمے کی غلطی یا تو اسی ترجمہ کے کسی دوسرے نسخے سے یا کسی دوسرے ترجمہ کے نسخے سے معلوم ہوجاتی ہے۔

(۸۔) مختلف زبانوں کے ترجموں کا مقابلہ انجیل کے اصلی یونانی الفاظ کو معلوم کرنے میں نہایت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ۱ تیمتھیس ۳: ۱۶ میں ہے " وہ جو جسم میں

ظاہر ہوا۔۔۔۔" اس آیہ شریفہ میں الفاظ" وہ جو کی یونانی οε ہے لیکن کتاب نے اس لفظ کو غلطی سے εθ (بمعنی خدا") لکھ دیا جس کی وجہ سے مابعد کی یونانی نسخوں میں اس مقام پر εθ نقل ہوتا ہوگیا۔یہی وجہ ہے ہمارے پرانے اردو ترجمہ میں اس آیت کا یہ ترجمہ ہے"۔خدا جسم میں ظاہر ہوا۔" جب قدیم ترین یونانی نسخے دستیاب ہوئے تو وہاں اس مقام پر لفظ οε پایا گیا۔ پس سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ دونوں لفظوں میں سے صحیح لفظ کونسا ہے۔اس کے تصفیہ کے لئے قدیم لاطینی ترجموں کو دیکھا تو وہاں لاطینی مترجمین نے لفظ Deus (بمعنی خدا) نہیں لکھا تھا بلکہ لفظ Qui (بمعنی" وہ جو") لکھا تھا۔ اس لاطینی ترجمہ یہ ثابت کردیا کہ پُرانے زمانہ میں یونانی نسخہ کے کسی کاتب نے غلطی سے οε کو εθ لکھ دیا تھا۔ پس موجودہ اردو ترجمہ میں اس آیہ شریفہ میں لفظ" خدا" کی جگہ الفاظ" وہ جو" بحال کئے گئے ہیں۔

اولین صدیوں میں انجیل جلیل کے قدیم ترجموں میں سے ہم ناظرین کی واقفیت کے لئے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ ترجمے اولین صدیوں میں مشرقی اور مغربی ممالک میں کئے گئے ہیں ۔ ہم پہلے مشرقی ممالک کے چند ترجموں کا ذکر کرتے ہیں۔

فصلِ اول

مشرقی ممالک کے تراجم

سریانی تراجم

اول سریانی ترجمے : منجئی عالمین کے زمانہ میں ارضِ مقُدس کنعان میں ارامی زبان عواماً بولی جاتی تھی ۔ یہی زبان ہمارے مبارک خداوند کی زبان تھی ، اوراسی زبان میں چند فقرے ہماری اناجیل میں محفوظ بھی ہیں جو رحمتہ للعالمین کی زبانِ معجز بیان سے نکلے تھے مثلاً "تالیتھا قومی" ایلی ایلی لماسبقتانی ، افتح وغیرہ۔ پس قدرتی طور پر جب مسیحیت کی ملکِ شام میں اشاعت ہوئی تو سریانی زبان میں (جو ارامی زبان کی ایک شاخ ہے) عہدِ جدید کی کُتُب کا سب سے پہلے ترجمہ ہوا۔ اس زبان میں انجیل جلیل کے پانچ ترجمہ ہوئے۔

ٹیشین کی ڈیاٹیسرون

(۱) ٹیشین وادی فرات کا باشندہ تھا اور جسٹن شہید (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے ۱۷۰ء میں انجیلی بیان کو انجیلی الفاظ میں مرتب کیا۔ اس نے اناجیل اربعہ کی مختلف آیات اور آیات کے حصص کو اس طور سے یکجا لکھا کہ وہ ایک مسلسل بیان ہوگیا۔ یہ کتاب[1] بڑی مقبولِ عام ہوگئی ۔ چونکہ ان ایام میں مختلف اناجیل کے لئے مختلف طوُمار درکار ہوتے تھے لیکن اس کتاب کے لئے صرف ایک ہی طوُمار درکا تھا اوراس میں چاروں انجیلوں کی آیات اور بیانات موجود تھے۔ پس پہلی پانچ صدیوں میں اس کتاب کا رواج عام ہوگیا۔ حتیٰ کہ اس کتاب کا مختلف زبانوں مثلاً آرمینی، لاطینی، عربی وغیرہ میں ترجمہ کیا گیا اوراس کی تفسیریں بھی لکھی گئیں۔ اس وقت پوپ صاحب کے کُتُب خانہ میں اس کتاب کے عربی ترجمہ کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔

علماء تاحال اس بات پر متفق نہیں ہوئے کہ ٹیشین نے پہلے پہل یہ کتاب یونانی میں ترتیب دی تھی یا سریانی میں مرتب کی تھی۔ اگر ٹیشین نے ۱۷۰ء میں اناجیل کے سریانی ترجمہ سے اپنی کتاب تالیف کی تھی توظاہر ہے کہ سریانی ترجمہ کا یونانی متن نہایت قدیم اور صحیح ہوگا جس کو ٹیشین جیسے مستند عالم نے قبول کیا تھا۔ اگر اس نے یونانی اناجیل سے پہلے پہل اس کتاب کو مرتب کیا تھا تو ان کا متن نہایت صحیح اور معتبر ہوگا۔ ۱۹۳۳ءمیں اس کتاب کا ایک پارہ یونانی زبان میں دستیاب ہوا جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کتاب پہلے پہل یونانی میں لکھی گئی تھی اور بعد میں اس کا ترجمہ سریانی زبان

[1] Tatian . Diatessaron.

میں کیا گیا تھا۔ بہر حال ظاہر ہے کہ اس نے ان معتبر یونانی نسخوں سے استفادہ کیا تھا جو اس کے زمانہ میں رائج تھے۔ اور ۱۵۱ء یا اس سے پہلے لکھے گئے تھے۔

لہذا ان کا متن نہایت مستند متن تھا۔

قدیم سریانی ترجمہ

(۲۔) قدیم سریانی ترجمہ کے (جو انجیلی مجموعہ کے تحریر ہونے کے بعد تقریباً پچاس سال کے اندر کیا گیا تھا) دو قلمی نسخے دَور حاضرہ میں ہمارے پاس ہیں۔ اس قدیم سریانی ترجمہ کا یونانی متن نسخہ سینا کے یونانی متن کے مطابق ہے۔ ایک نسخہ کیورٹن ہے جس کو ۱۸۴۸ء میں انگلستان کے عجائب خانہ کے اسسٹنٹ ڈاکٹر کیورٹن[1] نے چھپوایا تھا۔ یہ نسخہ مصر سے دستیاب ہوا تھا اور اس میں ذیل کی انجیلی عبارتیں موجود ہیں۔ متی ۱: ۱ تا ۸: ۲۲، ۱۰: ۳۲ تا ۲۳: ۲۵ - مرقس ۱۶: ۱۷- ۲۰، لوقا ۲: ۴۸ تا ۳: ۱۶ و ۷: ۳۳ تا ۱۶: ۱۲، ۱۷: ۱ تا ۲۴: ۴۲، یوحنا ۱: ۱ تا ۱: ۴۲ و ۳: ۵ تا ۸: ۱۹، ۱۴: ۱۰ تا ۱۲: ۱۴: ۱۵-۱۹، ۱۴: ۲۱- ۲۳، ۱۴: ۲۶- ۲۹ ترتیبِ اناجیل میں لوقا کی انجیل یوحنا کے بعد لکھی ہے۔ یہ نسخہ پانچویں صدی کے آخر میں لکھا گیا تھا۔ یعنی ۴۵۰ء اور ۵۰۰ء کے درمیان اس زمانہ میں لکھا گیا تھا، جب مشہور ومعروف بشپ ربلہ Rabula اس قدیم ترجمہ کی بجائے پشیتہ ترجمہ (جس کا ذکر ابھی آئے گا) کروارہا تھا۔

اس قدیم سریانی ترجمہ کا دوسرا نسخہ کوہِ سینا سے دو خواتین مسز لوئیس[2] اور مسز گبسن[3] کو دستیاب ہوا تھا۔ یہ نسخہ چرمی قرطاس پر لکھا ہے۔ نچلی عبارت انجیلی ہے جس کو نرم پتھر سے رگڑ کر دو سطروں کے درمیان اور عبارت لکھی گئی تھی۔ اس نچلی عبارت سے جو دھیمی سی نظر آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے شروع کا ہے۔ یعنی ۳۵۰ء اور ۴۲۵ء کے درمیان لکھا گیا تھا۔ اس نسخہ میں قدیم سرُیانی ترجمہ نسخہ کیورٹن کی نسبت زیادہ محفوظ ہے۔ اس نسخہ میں ذیل کی عبارتیں موجود ہیں۔ متی ۱: ۱ تا ۶: ۱۰، ۸: ۳ تا ۱۶: ۱۵، ۱۷: ۱۱ تا ۲۰: ۲۴، ۲۱: ۲۰ تا ۲۸: ۷ و مرقس ۱: ۱۲ تا ۴۴ و ۲: ۲۱ تا ۴: ۱۷، ۴: ۴۱ تا ۵: ۲۶: ۶: ۵ تا ۱۶: ۸ (جہاں یہ انجیل ختم ہوئی ہے) ولوقا ۱: ۱ تا ۱۶، ۱: ۳۸ تا ۵: ۲۸، ۶: ۱۲ تا ۲۴: ۵۳ یوحنا ۱: ۲۵: تا ۴۷، ۲: ۱۶ تا ۴: ۳۷، ۵: ۲۵، ۵: ۶ تا ۴۶: ۱۸ تا ۳۱، ۱۹: ۴۰ تا ۲۱: ۲۵۔

پشیتہ

(۳۔) پشیتہ جس طرح رومی کلیسیا کا مستند ترجمہ ولگیٹ[4] ہے اور انگریزی کلیسیا کا مستند ترجمہ اتھرائزڈورشن[5] ہے اسی طرح سریانی کلیسیا کا مستند ترجمہ پشیتہ[6] ہے۔ اس لفظ کا مطلب " سادہ" ہے۔ یہ ترجمہ گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے سریانی کلیسیا میں رائج ہے ۔ ہم اس رسالہ کے پہلے حصہ میں بتلاچکے ہیں کہ اس میں عہدِ عتیق تمام اور کامل موجود ہے ۔ عہدِ جدید کی کُتب میں سے ۲ پطرس ، ۲ یوحنا ، ۳ یوحنا ، یہوداہ کا خط اور مکاشفات کی کتاب نہیں ہے کیونکہ جب یہ ترجمہ کیا گیا تھا اس وقت سرُیانی کلیسیا میں ان کُتب کا رواج نہیں تھا جس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ ترجمہ کس قدر قدیم ہے۔

شامی کاتب کتابت کی صحت کے لئے تمام دنیا میں مشہور تھے۔ انہوں نے اس ترجمہ کی نقلیں ایسی صحت اور خوبصورتی سے کی ہیں کہ اسکے مختلف نسخوں میں بمشکل

---

[1] Dr. Cureton

[2] Mrs. Lewis

[3] Mrs. Gibson

[4] Vulgate.

[5] Authorized Version.

[6] Peshitta.

اختلافات ملتے ہیں۔ اس ترجمہ کے قدیم نسخے جو دَورِ حاضرہ میں موجود ہیں شمار میں ۲۴۳ سے زیادہ ہیں، جن میں ۱۰۲ نسخے برطانوی عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض نسخے نہایت قدیم ہیں اور کاتبوں نے سنِ کتابت بھی لکھا ہوا ہے۔ سب سے قدیم نسخہ پانچویں صدی کا ہے۔ ایک درجن کے قریب نسخے چھٹی صدی کے ہیں، جن میں سے چار ذیل کی تاریخیں موجود ہیں۔ از ۵۳۰ء تا ۵۳۹ء یعنی کاتب نے اس نسخہ کو دس سال میں لکھا جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کس حزم اور احتیاط سے یہ کاتب نقل کیا کرتے تھے۔ باقی تین نسخوں کی کتابت ختم ہونے کے سن علے الترتیب ۵۳۴ء، ۵۴۸ء اور ۵۸۶ء ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ کب کیا گیا۔ جب ہم اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ تمام سریانی کلیسا میں مروج ہے اور کہ ۴۳۱ء میں اس کلیسا کی شاخ نسطوری کلیسا سے الگ ہوگئی تھی تو ہم پر یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ ترجمہ نہ صرف ۲۳۱ء سے پہلے کا کیا ہوا ہے، بلکہ ۴۳۱ء میں اس کلیسا کی شاخ نسطوری کلیسا سے الگ ہوگئی تھی تو ہم پر یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ ترجمہ نہ صرف ۲۳۱ء سے پہلے کا کیا ہوا ہے بلکہ ۴۳۱ء میں یہ ترجمہ ایسا قدیم اور مستند سمجھا جاتا تھا کہ گو اس وقت سریانی کلیسا میں پھوٹ بھی پڑ گئی تھی تاہم اس پھوٹ کا اس ترجمہ کی عام مقبولیت اور رواج پر رتی بھر اثر نہ پڑا۔ اس ایک بات سے ہم اس ترجمہ کی قدامت کا اندازہ لگاسکتے ہیں ۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ دوسری صدی یعنی ۱۰۰ء اور ۲۰۰ء کے درمیان کیا گیا تھا۔ دیگر علماء کا یہ خیال ہے کہ یہ ترجمہ تیسری صدی یعنی ۲۰۰ء اور ۳۰۰ء کے درمیان کیا گیا تھا۔ موخر الذکر علماء کے خیال کے مطابق وہ ترجمہ جس کی نقل مذکورہ بالا کوہ سینا کا سریانی نسخہ ہے، پشیتہ ترجمہ سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام قدیم سریانی ترجمہ رکھا گیا ہے اور پشیتہ کے مترجموں نے ترجمہ کرتے وقت اس پرانے سریانی ترجمہ کو ضرور پیش نظر رکھا تھا، جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ دونوں ترجمے کتنے قدیم ہیں۔ اگر پشیتہ تیسری صدی کا ترجمہ ہے تو کوہِ سینا کے نسخہ والا سریانی ترجمہ اس سے بھی زیادہ قدیم یعنی دوسری صدی سے بھی غالباً پہلے کا ہوگا۔ اب علماء کی ایک بڑی تعداد اس نظریہ کی حامی ہے کہ پشیتہ دوسری صدی کے اوائل میں ترجمہ کیا گیا تھا اور سریانی بولنے والی کلیسیاؤں میں مقبول عام ہوگیا تھا۔

مذکورہ بالا قدیم سریانی ترجمہ کے نسخے پشیتہ کے نسخوں سے مقابلتہً بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قدیم سریانی علم ادب کی کتابوں کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہوچکا[1] ہے اور جو موجود ہے وہ صرف جدا جدا ٹکڑوں میں ہی ملتا ہے ۔ اس کی دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جُوں جُوں انجیل ترجمہ کی نظر ثانی ہوتی گئی قدرتاً قدیم ترجمے کی نقلیں آہستہ آہستہ بند ہوتی گئیں۔اور اس قدیم ترجمہ کی نقلیں ضائع ہو گئیں۔ چنانچہ پانچویں صدی میں تھیوڈوریٹ بتلاتا ہے کہ اس کو ٹیشین کی مذکورہ بالا تصنیف کی صرف دو سو نقلیں ملیں جن کی بجائے اس نے اناجیل اربعہ کے استعمال کا رواج جاری کیدپس ٹیشین کی کتاب کے رواج کا خاتمہ بھی اس کی نقلوں کے بند ہونے کی وجہ سے ہوا اور پشیتہ کے ترجمہ کے بعد قدیم سرُیانی ترجمہ کا بھی یہی حشر ہوا۔

فلو کسینس کا ترجمہ

(۴-) ۵۰۸ء میں عہدِ جدید کی کُتب کا بامحاورہ ترجمہ سریانی زبان میں مشرقی شام کے اسقف فلو کسے نس[2] کے ایماپئر کیا گیا۔ یہ ترجمہ زبان کے لحاظ سے تمام سریانی ترجموں میں اعلیٰ پایہ کا ہے اور لفظی قیود سے آزاد اور بامحاورہ ہے۔ پشیتہ کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نسخے بھی بہت کم موجود ہیں۔ سب سے پرانا نسخہ

---

[1] اس افسوسناک واقعہ کے اسباب کا مفصل ذکر ہم اپنی کتاب " قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسیائیں" کے حصہ اول کے ابواب سوم تا ششم میں کر چکے ہیں ۔(برکت اللہ)

[2] Philoxenus

۸۲۳ء کا ہے۔ اس ترجمہ کا ایک عربی ترجمہ بھی کیا گیا ہے جس کا ایک نسخہ موجود ہے جو نویں صدی کا ہے۔

ہارکل کے توما کا ترجمہ

(۵۔) بشپ فلو کسینس جیکو بائٹ (یعقوبی) بعد کا بانی تھا۔ یہ فرقہ مسیح وحدت فطرت کا قائل تھا۔ساتویں صدی میں خسرودوم کی ایرانی فوجوں نے اس بدعتی کلیسیا کی شاخوں کوجو مسوپوتامیہ اورشمالی شام کے شہروں میں تھیں برباد کردیا۔ جب اس کلیسیا میں اندرونی تفرقے اور رخنے پیدا ہوگئے تو ۶۱۳ء میں انطاکیہ کا پیٹریارک کلیسیا کی پارٹیوں میں صلح کرانے کی غرض سے سکندریہ گیا اوراپنے ساتھ مشرقی شام کے ہارکل کے بشپ توما[1] کو بھی لے گیا۔ وہاں بشپ توما نے پیٹریارک کے حکم کے مطابق عہد عتیق کی کتب کا ترجمہ کیا۔ ۶۱۶ء میں اس نے فلو کسینس کے سریانی ترجمہ کی نظر ثانی کی کیونکہ فلو کسینس کا ترجمہ زبان کے لحاظ سے آزاد اور بامحاورہ ترجمہ تھا۔ توما کا ترجمہ لفظی ہے جس میں سریانی زبان کے محاورہ کی رعایت نہیں رکھی گئی بلکہ بعض دفعہ سریانی زبان کے قواعد پر جبر بھی کیا گیا ہے،تاکہ یونانی متن کے لفظی معنی برقرار رہیں۔ جس طرح ایکولا نے کُتبِ عہدِ عتیق کا لفظی ترجمہ یونانی زبان میں کیا تھا اوراس میں یونانی محاورات کا لحاظ نہیں رکھا تھا اسی طرح توما نے کُتبِ عہدِجدید کا لفظی ترجمہ کیا، خواہ وہ سریانی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ ہندوستان میں ترجمہ فلوکسے نس کی نظیر حافظ نذیر احمد دہلوی کا ترجمہ قرآن ہے اور ہارکل کے لفظی ترجمہ کی نظیر شاہ ولی اللہ یاشاہ عبدالقادر کا ترجمہ ہے۔ ہارکل کے لفظی ترجمہ کا یہ فائدہ ہے کہ ہم اس کے ذریعہ نہایت آسانی سے اصل یونانی زبان کا لفظ معلوم کرسکتے ہیں اور یہ جان سکتے ہیں کہ فلاں مقام پر اصل یونانی لفظ کیا تھا اور یوں نہ صرف ترجمہ کے متن کی صحت بلکہ یونانی اصل عبارت کی صحت کی جانچ پڑتال بھی کرسکتے ہیں۔

اس ترجمہ کے اکیاون نسخے ہمارے پاس موجود ہیں جن میں سے ایک اسی صدی (یعنی ساتویں صدی) کا ہے جس میں یہ ترجمہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ ایک اور نسخہ پر ۷۵۷ء سن لکھا ہے۔

کنعانی سرُیانی بولی کے ترجمے

کنعانی سرُیانی ترجمے .Palistinian Syriac ان ترجموں کی سریانی بولی دیگر ترجموں کی سریانی زبان سے مختلف ہے اور کنعانی "ترجم" کی زبان سے ملتی جلتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو کنعانی سریانی ترجمہ کہتے ہیں ۔ اس کے مختلف اوراق مسیحی ممالک کے مختلف حصص میں محفوظ ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ یروشلیم میں دوسری صدی میں کیا گیا تھا۔ دیگر علماء کا خیال ہے کہ انطاکیہ میں کیا گیا تھا اور چھٹی صدی مسیحی کے اوائل کا ہے۔ اس ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس یونانی نسخہ کا (جس کا یہ ترجمہ ہے) متن نہایت اعلیٰ اور معتبر تھا۔

"کھوپری" کا نسخہ

مذکورہ بالا ترجموں کے علاوہ سرُیانی زبان میں ایک اور نسخہ موجود ہے جس میں کُتبِ عہدجدید کی بعض آیات کی شرح کی گئی ہے۔ اس شرح میں مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ مختلف یونانی الفاظ کے حرکات وسکنات کیا ہیں اوران کا صحیح سرُیانی ترجمہ کیا ہے۔ اور مختلف یونانی آیات کے علامات وقف کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کتاب کے سات نسخے دورِ حاضرہ میں موجود ہیں ۔ جن میں سے چھ شامی کلیسیا کے یعقوبی فرقہ[2] سے تعلق رکھتے ہیں

[1] Thomas of Harkel.

[2] Karka, Phensian Version.

اور ایک نسطوری فرقہ سے متعلق ہے۔ چونکہ یعقوبی فرقہ کی شرح ایک خانقاہ میں لکھی گئی تھی جس کا نام کھوپری کا خانقاہ ہے لہذا اس نسخہ کا نام بھی کھوپری کا نسخہ رکھا گیا ہے۔

ناظرین پر مخفی نہ رہا ہوگا کہ یہ سریانی ترجمے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا باعث صرف ان ترجموں کی قدامت ہی نہیں ہے۔ بلکہ چونکہ سرُیانی زبان ارامی زبان کی ایک شاخ ہے اور کنعانی ارامی زبان سے متعلق ہے، جو ہمارے مولا اوران کے رسولوں کی زبان تھی، لہذا اس زبان کے تراجم کے ذریعہ ہم ان اصلی آرامی الفاظ اور کلمات کو معلوم کرسکتے ہیں جو منجی عالمین کی زبان معجز بیان سے نکلے تھے۔ چونکہ سریانی ترجموں کے نسخے سینکڑوں کی تعداد میں ہمارے پاس موجود ہیں لہذا ہم انجیل جلیل کی کُتب کے صحیح ترین اور معتبر ترین ارامی یونانی متن کو ان نسخوں کی مدد سے معلوم کرسکتے ہیں۔

آرمینی ترجمے

دوم۔آرمینی تراجم۔ملکِ شام کے شمال اور شمال مغرب کی جانب آرمینیا کا ملک واقع ہے لہذا شامی مسیحی مبلغین نے انجیلِ جلیل کے پیغام کی صدا آرمینیا میں ۳۰۰ء میں جا سنائی[1]۔ پہلے پہل آرمینی زبان میں کُتبِ عہد جدید کا ترجمہ چوتھی صدی کے شروع میں (یعنی ۳۲۵ء سے پہلے) سریانی زبان میں کیا گیا۔ چنانچہ اناجیل اربعہ کا ترجمہ سریانی زبان سے آرمینی زبان میں مقُدس گریگوری (۳۳۲ء) کے وقت موجود تھا۔ اس کے بعد یونانی اصل اور سریانی ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر ۳۹۵ء اور ۴۰۰ء کے درمیان ایک اور آرمینی ترجمہ کیا گیا۔ پھر جب افسس کی کونسل (۴۳۱ء) کے بعد قسطنطنیہ کے دارالسلطنت سے کُتبِ مقُدسہ کی صحیح نقل دستیاب ہوئی تو مقُدس اضحاق اور مصروپ[2] نے اپنے ۳۹۵ء کے ترجمہ کی نظر ثانی

[1] مصر وشام وآرمینیا اور جارجیا کی کلیسیاؤں کے مفصل حالات کا ذکر ہم نے اپنی کتاب" قرونِ وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسیائیں" میں کیا ہے۔ برکت اللہ

[2] Sahak, Mesrop.

کرلی۔ یہ صحیح نسخہ وہی تھا جو قسطنطین بادشاہ کے حکم سے نقل ہوا تھا اور جس کا متن کوہ سینا کے نسخہ کا متن تھا۔ یہ نسخہ اس صحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ اس کو صحت وخوبصورتی کے لحاظ سے " نسخوں کی ملکہ " کا خطاب دیا گیا ہے۔

آرمینی ترجموں کے لئے نسخے مختلف مسیحی ممالک میں اور آرمینیا میں موجود ہیں۔ ان کے خاتمہ میں ان کی کتابت کی تاریخ لکھی ہے چنانچہ بعض نسخے ۸۸۷ء، ۹۶۶ء، ۹۸۲ء اور ۹۸۹ء کے آرمینیا میں موجود ہیں۔ ایک نسخہ ۹۶۰ء کا قسطنطنیہ میں ہے اور دو نسخے ۹۰۲ء اور ۱۰۰۶ء کے وینس شہر میں موجود ہیں۔

جارجیا کے ترجمے

سوم۔ جارجیا کے تراجم۔ ملکِ آرمینیا کے شمال مغرب کی جانب ملکِ جارجیا ہے۔جہاں آرمینی مبلغین نے مسیحیت کی اشاعت کا فرض سر انجام دیا۔ چوتھی صدی کے آغاز میں ان بحر آسود اور بحر کیسپین کے درمیان کوہ قاف کے رہنے والے جارجینی لوگوں میں کلیسیا قائم ہوچکی تھی ۔کہتے ہیں کہ مقُدس مصروپ نے جارجی زبان میں بھی کُتبِ مقُدسہ کے ترجمے ۴۲۵ء کے قریب کئے۔ملکِ جارجیا کے ترجموں کی جانچ پڑتال اس امر کو ظاہر کردیتی ہے کہ مترجمین کے سامنے یونانی اصل اور سرُیانی ترجمے دونوں تھے۔

ایرانی ترجمے

چہارم۔ ایرانی ترجمے ۔ سرُیانی ترجمہ پشیتہ کی کُتبِ عہدِجدید کا ترجمہ فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس ترجمہ کے بعد ایک اور ترجمہ فارسی میں اصل یونانی سے کیا گیا۔ خیال ہے کہ ایران[3] میں پرانے ترجمہ کے نسخے موجود ہیں لیکن یہ تاحال شائع نہیں ہوئے۔

[3] ایران کی کلیسیا کا مفصل ذکر ہم نے اپنی کتاب" صلیب کے ہروال" میں کیا ہے۔

حبش کے ترجمے

پنجم۔ ملکِ حبش کے تراجم۔ مسیحیت نے ملک مصر کے راستے یا سیدھے ارضِ مقُدس کنعان سے (اعمال ۸: ۲۲ تا ۳۹) ملکِ ابی سینیا[1] میں دخل پایا۔ پانچویں صدی کے آخر میں مسیحیت اس ملک کا قومی مذہب بن گئی۔ چوتھی صدی میں انجیل جلیل کا ترجمہ اس کی زبان میں ہو گیا تھا۔ مغربی ممالک کے کُتب خانوں میں اس زبان کے ایک سو سے زائد نسخے موجود ہیں، جو عہدِ عتیق وجدید کتابوں کا متن معلوم کرنے کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم نسخے کا متن نہایت صحیح ہے ۔ کیونکہ ترجمہ لفظی ہے۔ مابعد کے نسخوں پر عربی ترجموں کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن اس زبان کے تمام نسخوں کی تاہنوز جانچ پڑتال نہیں کی گئی۔

عربی ترجمے

ششم۔ عربی تراجم۔ کتابِ مقُدس کے عربی تراجم کے نسخے بکثرت موجود ہیں۔ ان میں سے بعض اصل یونانی سے اور بعض سرُیانی زبان سے اور بعض قبطی زبان سے عربی زبان میں ترجمہ کئے گئے۔ عربی تراجم کی ضرورت زیادہ تر اس لئے پڑی کہ اسلامی فتوحات کی وجہ سے ممالکِ شام ومصر میں (جہاں مسیحی کلیسیائیں بکثرت تھیں) عربی زبان رائج ہو گئی تھی حال ہی میں کوہِ سینا سے بعض عربی نسخے ہاتھ لگے ہیں جو ان تراجم میں سے کسی کی نقل نہیں ہیں، بلکہ کسی قدیم ترجمہ کی نقل ہیں۔ کیا عجب ہے کہ وہ حضرت رسولِ عربی کے رشتہ دار حضرت ورقہ بن نوفل کے ترجمہ کی نقلیں ہوں۔ واللہ اعلمہ بالصواب۔

---

[1] حبش اور عرب کی کلیسیاؤں کا مفصل ذکر ہم نے اپنی کتاب " قرون وسطی کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسیائیں " کے حصہ اول کے باب اول میں کیا ہے۔ (برکت اللہ)

قبطی ترجمے

ہفتم۔ قبطی تراجم۔ کتاب اعمال الرسل ۱۸: ۲۴، ۲۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکِ مصر میں مسیحیت کی اشاعت سیدنا مسیح کی وفات کے چند سال بعد ہو گئی تھی۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ مقُدس مرقس نے وہاں کلیسیا قائم کی تھی۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ رسولوں کی حینِ حیات میں ہی ملک مصر میں مسیحیت کی اشاعت ہو گئی تھی۔ یہاں یہودی ہزاروں کی تعداد میں رہتے تھے اور اسی ملک میں عہدِ عتیق کا مشہور ترجمہ سبعینیہ (سیپٹواجنٹ) کیا گیا تھا۔ لہذا جب دوسری صدی میں قبطی زبان ایجاد ہوئی تو عہد جدید کی کُتب کا ترجمہ ۱۵۰ء اور ۲۰۰ء کے درمیان اس زبان میں کیا گیا۔ قبطی زبان میں ابتدائی مسیحی صدیوں میں مصر کے دیس کی زبان تھی جو فراعنہ مصر کی قدیم زبان سے متعلق تھی۔

اس زبان کی دو شاخیں ہیں۔ اول صحیدی[2]۔ دوم بحیری۔

(الف) صحیدی زبان: یہ زبان جنوبی مصر کی تھی اوراس میں بے شمار پارے موجود ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں اس زبان میں یوحنا کی انجیل کا ترجمہ دستیاب ہوا۔ اگران تمام پاروں کو جو دستیاب ہوئے ہیں ایک جگہ جمع کیا جائے وہ عہدِ جدید کی تمام کُتب پر مشتمل ہوں گے۔ چنانچہ مشی گن یونیورسٹی نے ان پاروں سے اناجیلِ اربعہ اعمال، خطوط پولوس اور مکاشفات کی کتاب کو شائع کیا ہے۔

عہدِ عتیق اور عہد جدید دونوں کے بے شمار پارے موجود ہیں، اور ہر سال ان پاروں میں اضافہ ہورہا ہے۔ صحیدی زبان کے نسخے، بحیری زبان کے نسخوں سے زیادہ قدیم ہیں، کیونکہ اس زبان کا ۲۵۰ء کے بعد رواج نہ رہا تھا۔ پس ظاہر ہے کہ جب دوسری صدی میں قبطی حروف ایجاد ہوئے اور صحیدی شاخ کا ۲۵۰ء کا بعد رواج نہ رہا تو یہ ترجمہ ضرور

---

[2] Sahidic, Bohairie.

۱۷۵ء اور ۲۰۰ء کے درمیان کیا گیا ہوگا۔ چونکہ اس زبان کے بے شمار پارے دستیاب ہورہے ہیں ، ظاہر ہے کہ نسخوں کی نقلیں بھی بے شمار ہوئی ہوں گی ۔ ان پاروں میں سے بعض پاروں میں صحیدی ترجمہ کے بالمقابل اصل یونانی عبارت بھی لکھی ہے۔ ایک نسخہ میں (جو کتابی صورت کا ہے) استثنا ، یوناہ اور اعمال کی کتابیں ایک جلد میں مجلد ہیں۔ یہ نسخہ ۳۵۰ء کا ہے۔ مقُدس یوحنا کی انجیل کا ایک صحیدی نسخہ ۳۵۰ء کے لگ بھگ کا ہے۔ صحیدی ترجمہ کے نسخے اور پارے اس کثرت سے دستیاب ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر ہورنر Dr.Horner نے ان نسخوں سے صحیدی زبان کا مکمل نیا عہد نامہ تالیف کیا ہے جو اس زبان کی قدامت اور معتبر متن کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔

امید ہے کہ ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ صحیدی ترجمہ کا متن قدیم ترین متنوں میں سے ہے۔ چنانچہ وہ مقُدس اوریجن سے بھی پہلے کا ہے۔ اور نہایت قابلِ قدر اور معتبر متن ہے۔

(ب) بحیری زبان: ایک زمانہ آیا جب بحیری حرُوف نے صحیدی حروف کی جگہ غضب کرلی۔ یہ زبان شمالی مصر کی زبان تھی ، اور ڈلٹا میں بولی جاتی تھی۔ اس زبان میں عہدِ جدید کے نسخے بکثرت موجود ہیں۔ بعض نسخوں میں انجیلی مجموعہ کی یہ کتابیں کامل موجود ہیں۔ اگرچہ تاحال کوئی ایسا نسخہ نہیں ملا جس میں یہ تمام کُتب یک جا موجود ہوں ، تاہم یہ سب کُتب مختلف نسخوں میں محفوظ ہیں۔ پادری ہورنر[1] نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے چھاپہ خانہ کے لئے بحیری زبان میں ایک عہد جدید مرتب کیا ہے۔ متی کی انجیل چونتیس نسخوں سے اور دیگر اناجیل بیس نسخوں سے تیار کی گئی ہیں۔ انیس نسخوں سے خطوطِ مقدس پولوس ، تیرہ نسخوں سے عام خطوط ، تیرہ نسخوں سے اعمال کی کتاب اور گیارہ سے مکاشفات کی کتاب تیار کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ یونانی کا لفظی ترجمہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس شائع شدہ انجیل کا متن نہایت معتبر اور صحیح ہے۔

نسخوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ قبطی کاتب یہودی اور شامی کاتبوں کی طرح ایک ایک لفظ نہایت صحت اور احتیاط سے لکھتے تھے ۔ اگر کہیں اختلاف کتابت ہوتا تو یہ قبطی کاتب حاشیہ میں لکھ دیتے تھے کہ اختلاف یونانی نسخوں میں پایا جاتا ہے لیکن قبطی نسخوں کی کتابت میں نہیں ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قبطی کلیسیا کس قدر ایمانداری سے اپنے صحیح متن کی حفاظت کرتی تھی۔ ان قبطی نسخوں کا متن صحیح ترین اور اعلیٰ ترین قسم کا ہے اور نسخہ ویٹی کن کے متن کے مطابق ہے۔

اس زبان میں کُتبِ عہدِ جدید کا ترجمہ چوتھی صدی مسیحی سے پہلے غالباً ۲۵۰ء اور ۳۰۰ء کے درمیان ہوا تھا۔

(ج) دیگر قبطی زبانوں کے تراجم: مذکورہ بالا دو قبطی زبانوں کے علاوہ دیگر قبطی زبانوں میں عہدِ جدید کے ترجمے ہوئے تھے۔ کیونکہ بعض ترجموں کا متن مذکورہ بالا دونوں ترجموں سے مختلف ہے۔ یہ نسخے چھٹی پانچویں اور چوتھی صدی مسیحی کے ہیں، اور قدیم متن کے معلوم کرنے میں ممد اور معاون ہیں۔

جنوری ۱۹۲۴ء میں ایک اور قبطی زبان کے ترجمہ کا نسخہ مصر سے دستیاب ہوا جو ۳۵۰ء میں لکھا گیا تھا ۔ یہ نسخہ مقُدس یوحنا کی انجیل پر مشتمل ہے۔ اس نسخہ کی زبان صحیدی زبان کی ایک شاخ ہے۔ اس نسخہ کا متن ظاہر کرتا ہے کہ یہ ترجمہ دوسری صدی میں کیا گیا تھا اور کہ یہ ترجمہ اسی متن کا ہے جو کوہِ سینا کے نسخہ کا متن ہے اور صحیح ترین متن ہے۔ یہ نسخہ اب بائبل سوسائٹی لندن کے پاس ہے۔

[1] Dr. Horner

فصلِ دوم
مغربی ممالک کے تراجم

گاتھک ترجمہ

اول۔ گاتھک ترجمہ: یہ ترجمہ قوم گاتھ کی زبان میں ان کے پہلے اسقف الفلس[1] نے کیا تھا جس نے اس قوم کو حلقہ بگوش مسیحیت کیا تھا۔ چونکہ یہ لوگ وحشی تھے لہذا ان کے زبان کے حروف اس اسقف نے ایجاد کئے اور ۳۵۰ء میں اس نے بائبل کی کتب کا ترجمہ یونانی زبان سے ان لوگوں کی زبان میں کیا۔ یہ ترجمہ یونانی کا لفظی ترجمہ ہے جس میں گاتھک زبان کے محاورہ کی کوئی رعایت نہیں رکھی گئی۔ اس ترجمہ کے اصل متن نہایت قدیم ہے۔

اس ترجمہ کے تین نسخے ہمارے پاس موجود ہیں۔ ایک نسخہ آرجینٹئس Codex Argentius. بالخصوص نہایت خوبصورت اور نفیس ہے اور ارغوانی رنگ کے چرم پر سونے اور چاندی کی سیاہی سے اُن بڑے اور جلی حروف میں لکھا ہے جو پانچویں صدی میں مروج تھے۔ یہ نسخہ اپسالہ یونیورسٹی کے کُتب خانہ میں ہے۔

لاطینی تراجم

دوم۔ لاطینی تراجم۔ یونانی اور لاطینی زبانیں ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ اور تعلق رکھتی ہیں۔ پس لاطینی ترجمہ سے ہم یونانی اصل عبارت کو سہولت سے معلوم کرسکتے ہیں۔ یہ لاطینی تراجم مختلف اوقات میں کئے گئے تھے۔

---

[1] Gothic version of Ulphilas.

(۱۔) قدیم لاطینی ترجمہ یا ترجمے[2]: ابتدا میں روم میں یونانی زبان کا ہی رواج تھا۔ لہذا رومی مسیحیوں کو لاطینی ترجمہ کی ضرورت نہ پڑی۔ لاطینی ترجمہ کی ابتدا علاقہ ٹیولنس (شمالی افریقہ) سے ہوئی، کیونکہ وہاں کے لوگ یونانی زبان سے ناواقف تھے۔ ٹرٹولین[3] کی تصنیفات اس امر کی گواہ ہیں کہ مسیحیت شمالی افریقہ میں بہت جلد پھیل گئی تھی۔ لہذا وہاں لاطینی ترجمہ کی فوری ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ لاطینی ترجمہ ٹرٹولین سے بہت پہلے موجود تھا کیونکہ اس کی تصنیفات میں لاطینی بائبل سے اقتباسات موجود ہیں۔ پس یہ ترجمہ نہایت قدیم ہے اور ۱۵۰ء کے بعد کا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ترجمہ کار تھیج کے شہدا کے ہاتھ میں ۱۸۰ء میں موجود تھا۔ پس جس متن کا یہ ترجمہ ہے وہ نہایت قدیم، مستند، اور معتبر متن تھا، اور غالباً ان نسخوں کے متن کی نقل تھا جو مقُدس رسولوں کے پاک ہاتھوں نے لکھے تھے۔ کیونکہ اس لاطینی ترجمہ کا متن نسخہ سینا کے یونانی متن کے مطابق ہے۔ ناظرین کو یاد رکھنا چاہیے کہ "قدیم لاطینی متن" کے عنوان کے تحت وہ تمام متن شامل ہیں جو ولگیٹ کے متن (جس کا ذکر ابھی کیا جائے گا) کے مطابق نہیں ہیں۔ اس ترجمہ کے پچاس سے زیادہ نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے ۲۷ نسخے اناجیل کے ہیں۔ سات نسخے اعمال کی کتاب کے ہیں۔ چھ نسخے مقُدس پولوس کے خطوط کے ہیں اور باقی تمام خطوں کے اور مکاشفات کی کتاب کے پارے ہیں۔

یہ ترجمہ مغربی ممالک میں تقریباً اڑھائی سو سال تک رائج رہا۔ سپرین[4] اسی ترجمہ کے اقتباسات اپنی تصنیفات میں کرتا ہے لیکن اس ترجمہ کی نقلیں کرنے والے کاتب عالم نہیں تھے لہذا ان کاتبوں نے مختلف نسخوں کے لکھتے وقت بہت غلطیاں کی ہیں۔ جب

---

[2] The old Latin version, or versions

[3] Tertullian.

[4] Cyprian

پوپ ڈیمے سس[1] (از ۳۶۶ تا ۳۸۴ء) نے یہ صورت حالات دیکھی تو اس نے مقُدس جیروم سے کہا کہ معتبر ترین اور قدیم ترین یونانی نسخوں کو جمع کرکے اس قدیم لاطینی ترجمہ کی نظر ثانی اور تصحیح کرے۔ پس مقُدس جیروم [2] نے ایک نسخہ تیار کیا جو ولگیٹ کہلاتا ہے۔ ۳۸۳ء میں جیروم نے اناجیل اربعہ کے لاطینی ترجمہ کی نظر ثانی کی اور باقی کتبِ عہد جدید کی اس نے سرسری طور پر تصحیح اور نظر ثانی کی۔ اس نے ۳۸۴ء میں اناجیل اربعہ کا ترجمہ شائع کیا اور غالباً دوسال کے اندر انجیلی مجموعہ کی باقی ماندہ کتابوں کا ترجمہ شائع کردیا۔ اس کے بعد اس نے عبرانی کُتبِ مقُدسہ کا ترجمہ عبرانی زبان سے لاطینی میں کیا۔

مقُدس جیروم مغربی کلیسیا کا نہایت زبردست اور جید عالم تھا۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ اس نے ترجمہ کرتے وقت صرف اعلیٰ ترین اور قدیم ترین نسخوں کو ہی پیشِ نظر رکھا تھا۔ یہ ترجمہ رفتہ رفتہ بڑا مقبولِ عام ہوگیا۔ حتیٰ کہ دَورِ حاضرہ میں بھی رومی کلیسیا کا مستند ترجمہ یہی ہے۔ مغربی ممالک میں جہاں کہیں رومی کلیسیا ہے وہاں یہ ترجمہ پایا جاتا ہے۔ اس ترجمہ کا متن نسخہ سینا کے متن کے مطابق ہے۔ اس کے قدیم نسخے ہزاروں کی تعداد میں ملتے ہیں اور یورپ کے ممالک کے مختلف کُتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس ترجمہ کے قدیم نسخوں کی تعداد اصل یونانی نسخوں کی تعداد سے قریباً دگنی ہے اور آٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔

بائبل کے ترجموں میں سے ولگیٹ کے برابر غالباً کسی اور ترجمہ نے مغربی ممالک کی کلیسیاؤں کو متاثر نہیں کیا۔ گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے اس لاطینی ترجمہ کے ترجمے مغربی یورپ کی مختلف زبانوں میں ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہندوستان کی کلیسیا کے لئے نارووال کے مشور مسیحی ڈاکٹر عطاردمرحوم نے پہلی دفعہ ولگیٹ کا ترجمہ اردو میں کیا۔

ہمیں واثق یقین ہے کہ ناظرین کو اب پتہ لگ گیا ہوگا کہ تیسری صدی کے نصف تک انجیل جلیل کا ترجمہ یونانی زبان سے سرُیانی، لاطینی اور قبطی زبانوں میں ہوگیا اور اس کے بعد یونانی اور سرُیانی زبانیں بولنے والی کلیسیائیں تبلیغ واشاعتِ انجیل کی خاطر دیگر ممالک کی زبانوں میں ترجمہ کرنے لگ گئیں۔ اورجوں جوں کلیسیائیں قائم ہوتی چلی گئیں دیگرزبانوں میں انجیل کے ترجمے بھی ہوتے چلے گئے۔

اب ناظرین پر ظاہر ہوگیا ہوگا کہ انجیل جلیل کے صحیح متن کو معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے۔ کل نسخے تیرہ ہزار سے زیادہ ہیں جو مختلف ممالکِ شرقی وغربی میں اور مختلف زبانوں میں مختلف ملکوں اور قوموں میں اور مختلف زبانوں میں مختلف اشیاء پر لکھے ہیں۔ ایران، عرب، شام، آرمینیہ، جارجیا، مصر، کنعان، فرانس، اطالیہ اور افریقہ وغیرہ اکناف واطراف عالم سے یہ تیرہ ہزار سے زیادہ معتبر گواہ آتے ہیں۔ کسی کی عمر اٹھارہ سو سال کی ہے۔ کسی کی ڈیڑھ ہزار سال کی ہے کسی کی سولہ سو سال کی ہے کسی کی اس سے زیادہ ہے اور کسی کی کم ہے۔ ان میں سے ہزاروں گواہ حضرت رسولِ عربی کی پیدائش سے صدیوں پیشتر کے ہیں، جو زیرزمین مدفون تھے۔ یہ گواہ اپنی قبروں سے نکل کر انجیل جلیل کے متن کی صحت پر گواہی دیتے ہیں۔

اگر مخالفین کا دعویٰ کہ انجیل کی کُتب محرف ہوگئی ہیں حق بجانب ہوتا تو یہ قدیم نسخے جو روم کے مقُدس کلیمنٹ یعنی ۹۰ء سے لے کر حضرت رسول عربی کے بعد کے زمانہ (۱۰۰۰ء) تک کے ہیں۔ اس دعوےٰ کے مصدق اور گواہ ہوتے کیونکہ یہ توزیرِ زمین مدفون تھے اور ان کو کوئی شخص محرف نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن روئے زمین کی ہر قوم، ملت، ملک اور زبان کا ایک ایک گواہ اپنی اپنی بولی میں انجیلِ جلیل کی کُتبِ مقدسہ کے صحیح متن پر گواہی دیتا ہے اور فنِ تنقید کے ماہروں نے ہر ایک گواہ کی شہادت کو قلمبند کرکے نہایت محنت ومشقت، صبر واستقلال، باریک بینی اور عرق ریزی سے اس کی شہادت کی

---

[1] Damasus

[2] Jerome's Vulgate i.e. The Common Version.

جانچ پڑتال کی ہے۔ اس شہادت کو پرکھنے کے بعد ان کا واقفکار ماہروں نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ ان دوہزار سالوں کے دوران میں انجیل جلیل کے متن کے ایک ہزار ویں حصہ میں اختلافاتِ قرات وکتابت موجود ہیں لیکن اس ہزارویں حصہ میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے مسیحی تعلیم یا مسیحی عقائد پر کوئی اثر پڑسکے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کُتبِ مقُدسہ کا اصلی اور صحیح ترین متن اب ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

باب ششم

ابتدائی مسیحی صدیوں کی تصنیفات کی شہادت

ہمارے پاس انجیل جلیل کے صحیح متن کو معلوم کرنے کے لئے نہ صرف پانچ ہزار کے قریب قلمی نسخے اصلی زبان یونانی میں ہیں اور نوہزار سے زیادہ قدیم قلمی نسخے مختلف ممالک کی زبانوں کے ترجموں کے ہیں۔ بلکہ ان چودہ ہزار نسخوں کے علاوہ ہمارے پاس ابتدائی مسیحی صدیوں کے مصنفین کی تحریرات بھی موجود ہیں جو لاطینی ، یونانی ، سرُیانی اورآرمینی وغیرہ زبانوں میں لکھی ہیں جن میں انجیل جلیل کے مقامات اورآیات کو نقل کیا گیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر مسیحی مصنف جو اپنے عقیدہ کی اشاعت اور دیگر عقائد کی تردید میں لکھتا ہے وہ انجیل جلیل کے حوالے اپنی کتاب میں ضرور دیتا ہے۔ ان ابتدائی مسیحی مصنفین کے شمار میں ہم نہ صرف راسخ الاعتقاد مسیحیوں کو ہی شامل کرتے ہیں بلکہ مختلف بدعتی فرقوں کے مصنفوں کو بھی شامل کرتے ہیں ۔دونوں اقسام کے مسیحی ایک دوسرے کے عقائد کو ازروئے انجیل باطل قرار دیتے ہیں لہذا وہ انجیلی کُتب کا اقتباس اپنی تصنیفات میں بکثرت کرتے تھے۔

ابتدائی صدیوں کے مسیحی مصنفین نہ صرف مشرکین اور کفار کے عقائد کی تردید میں اور مسیحیت کے عقائد کی تائید اور صداقت میں انجیل جلیل کے حوالوں کا ذکر کرتے تھے ، بلکہ وہ ایک دوسرے کے عقائد کی صداقت اور تردید میں انجیل شریف پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بشپ آئر نیولس دوسری صدی میں لکھتا ہے "ہماری انجیلیں ایسی مسلم اور مستند کتابیں ہیں کہ بدعتی تعلیم دینےوالے خود ان کی سند کے گواہ ہیں کیونکہ وہ اپنے اعتراضات کوانجیلی آیات کی بنیاد پر قائم کرتےہیں۔"(Adv.Her.iii.ii.7)

ان بدعتی استادوں میں سے دوسری صدی کے پہلے نصف میں ویلین ٹائی نس Valentinus تمام اناجیل کا اور بالخصوص مقُدس یوحنا کی انجیل کا استعمال کرتا ہے۔ ہیراکلیون نے انجیلِ یوحنا کی تفسیر لکھی جس کے چند حصے ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔بیس یلی ڈیز.Basilides نے ۱۱۷ء اور ۱۳۸ء کے درمیان غلط تعلیم کی بنیاد اناجیل پر رکھی۔اختصار کی خاطر ہم دوسری صدی کے پہلے نصف کے صرف مذکورہ بالا تین بدعتی معلموں کے ذکر پر اکتفا کرتےہیں۔

ہم قدیم راسخ الاعتقاد مسیحی مصنفین کے انجیلی حوالوں اور اقتباسات کا مطالعہ کرکے معلوم کرسکتےہیں کہ آیا جوآیات اس قدیم زمانہ میں انجیل میں پائی جاتی تھیں وہ وہی ہیں جو دورِ حاضرہ میں پائی جاتی ہیں یا کہ نہیں اور یوں ہم بے شمار گواہوں کو انجیل شریف کے صحیح متن کو معلوم کرنے کے لئے طلب کرسکتےہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ان بتدائی صدیوں کے مسیحی مصنفین اورآبائے کلیسیا نے اپنی تصنیفات میں انجیل کے اقتباسات اس کثرت سے کئے ہیں کہ اگرخدانخواستہ انجیل جلیل کے تمام نسخہ جات لاپتہ بھی ہوجائیں تو بھی ان مصنفوں کی کتابوں کے ذریعہ ہم انجیلی مجموعہ کی تمام کُتب کا متن معلوم کرسکتےہیں۔

اس سےپہلے کہ ہم ان گواہوں میں سے بعض کو طلب کریں۔چند ایک باتوں کا ذکر کرنا خالی ازفائدہ نہ ہوگا، کیونکہ وہ ان کی شہادت کی اصل حقیقت ہم پرواضح کردیتی ہیں۔

(۱۔)پہلی تین صدیوں میں قیاصرہ روم مسیحیت کے جانی دشمن تھے۔ پس ان صدیوں کے بزرگانِ کلیسیا اپنی تصنیفات کو نہایت پریشان کن حالات میں لکھا کرتے تھے۔

ان کو نہ تو سکونِ خاطر نصیب ہوتا تھا اور نہ بیرونی حالات ان کے مساعد تھے۔ ان کے پاس کوئی کُتب خانہ نہ تھے جن سے وہ فائدہ اٹھاسکتے اور نہ وہ اس قدر مالدار تھے کہ کتابوں اور طوماروں کو خریدنے کی توفیق رکھتے۔ اس زمانہ میں تو کتابوں کی تجارت بھی وسیع پیمانہ پر نہ ہوتی تھی۔

(۲۔) علاوہ ازیں پہلی تین صدیوں میں جیسا ذکر ہوچکا ہے ، انجیلِ جلیل کی کُتب عموماً طُوماروں پر لکھی جاتی تھیں اوران میں ابواب وآیات کی تقسیم موجود نہیں تھی۔ لہذا ہر مصنف کوحوالہ نکالنے اوراس کو دیکھنے اورپھر دیکھ کر نقل کرنے میں بہت دقت پیش آتی تھی یہ ایسا ہی ہے جس طرح فی زمانہ اگر کسی کے پاس بائبل کی کنکارڈنس یا کلید الکتاب موجود نہ ہواور اس کوآیت کے الفاظ یادہوں، لیکن یہ یاد نہ ہوں کہ وہ کس کتاب کے کس باب کی کونسی آیت ہے تو صحیح الفاظ کو نقل کرنے کے لئے اس کووہ پوری کتاب دیکھنی پڑتی ہے اور بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔لہذا وہ وقت کو بچانے کی خاطر جس طرح آیت اس کو یاد ہے وہ حافظہ سے لکھ دیتا ہے۔مثلاً چند روز ہوئے میرے ایک دوست نے ایک مشہور آیت کو حافظہ سے یوں نقل کیا۔" جو کوئی اپنے آپ کو بچے کی طرح چھوٹا بنائے گا وہی خدا کی بادشاہی میں بڑا ہوگا۔" میں نے عرض کی کہ اس آیت میں چار غلطیاں ہیں۔ اورجب مقُدس متی کی انجیل کو کھولا تو میرا قول صحیح نکلا۔ وہاں لکھا تھا" پس جو کوئی اپنے آپ کو اس بچے کی مانند چھوٹا بنائے گا وہی آسمان کی بادشاہت میں بڑا ہوگا ۔" (۱۸ : ۴) چونکہ میرے دوست نے حافظہ سے نقل کیا تھا، وہ آیہ شریفہ میں چار غلطیاں کرگیا۔ یعنی پہلا لفظ " پس " اور ساتواں لفظ" اس" چھوڑ گیااور " مانند" کی جگہ " طرح" اور"آسمان " کی جگہ " خدا " لکھ گیا۔ یوں وہ انیس الفاظ کی ایک آیت میں چار غلطیاں کرگیا۔ گو ان غلطیوں سے آیت کے مفہوم میں کوئی فرق نہ پڑا۔

پس یہ ابتدائی مسیحی صدیوں کے مصنفین بھی طُوماروں کے وجود کی وجہ سے اور ابواب وآیات کی تقسیم کی عدم موجودگی میں بعض اوقات اپنے حافظہ سے کام لیتے تھے۔ لہذا جہاں ان کی تحریرات کے انجیلی الفاظ میں اور انجیل جلیل کے موجودہ متن میں فرق ہوہم یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی عبارتوں کے الفاظ صحیح ہیں اورہماری موجودہ انجیل کے الفاظ غلط ہیں یا ہماری موجودہ انجیل کا متن صحیح ہے اور ان کی عبارت غلط ہے۔ ناظرین پر مخفی نہ رہے کہ یہ مصنف کُتبِ مقُدسہ کے زبردست حافظ تھے پس ایسے مقامات جن میں دونوں کی عبارتوں میں اختلافا ہے تعداد میں بکثرت نہیں ہیں۔

(۳۔) ہمیں یہ امر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آبائے کلیسیا کی کتابیں بھی نقل ہوتی چلی آئی ہیں اوران نقلوں میں اور بالخصوص مقُدس کرسسٹم[1] کی تحریرات کی نقلوں میں سہو کاتب کی وجہ سے غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ پس اگران بزرگوں کی تصنیفات میں اورانجیلی متن میں اختلاف ہو تو اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ اختلاف سہو کاتب کی وجہ سے ہے۔

(۴۔) حاصل کلام ابتدائی مسیحی صدیوں کے بزرگان سلف کی کتابوں کے ذریعہ ہم انجیلی مجموعہ کُتب کے متن کی جانچ پڑتال کرسکتے ہیں۔ مثلاًہم یہ جان سکتے ہیں کہ مقدس کلیمنٹ، مقُدس اتھاناسیس اور بشپ سرل اسی متن کو استعمال کرتے تھے جو نسخہ ویٹی کن میں موجود ہے ۔ہم بزرگان کلیسیا کی کتابوں کے انجیلی اقتباسات کا اورانجیلی مجموعہ کامقابلہ باب ہفتم میں کریں گے جس سے ناظرین پرواضح ہوجائیگا کہ ان بزرگانِ سلف کی کتابیں صحیح متن کی جانچ پڑتال میں کس قدر ممدومعاون ہیں۔

مشاہیر اساتذہ کی تصنیفات

اگرہم ابتدائی صدیوں کے مسیحی مصنفین میں سے صرف مشاہیر اساتذہ کو ہی لیں اور صرف پہلی تین صدیوں تک ہی اپنی نظر کو محدود رکھیں توہمارے پاس پچاس سے زیادہ بزرگ مختلف ملکوں اور زمانوں کے مصنفین انجیل شریف کے متن کی صحت پر گواہی دینے

[1] Chrysostom

کے لئے آجاتے ہیں۔ چونکہ ہم یہاں ان سب کا ذکر نہیں کرسکتے ، لہذا ان پچاس سے زیادہ بزرگانِ دین کی تصانیف میں سے ہم صرف چند ایک کُتُب اور اشخاص کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتےہیں۔

(۱۔) " غیر یہود کے لئے دوازدہ رسولوں کی معرفت خداوند کی تعظیم "۔ اس کتاب کو عموماً اختصار کی خاطر ، دوزادہ رسولوں کی تعلیم" بھی کہتے ہیں ۔ یہ کتاب یروشلیم کی تباہی کے وقت ملکِ شام میں ۷۰ء کے قریب لکھی گئی تھی ، اوراس قدر قدیم ہے کہ سکندریہ کا کلیمنٹ اس کو الہامی تصور کرتا تھا اوراس زمانہ میں تصنیف کی گئی جب کلمتہ اللہ کے بارہ رسولوں میں سے بعض زندہ تھے۔ یہ کتاب مقُدس یوحنا کی مطالعہ میں آئی تھی[1] ۔ اس کتاب کے ۲۳ مقامات میں کلمتہ اللہ کے کلماتِ طیبات درج ہیں جو چاروں انجیلوں سے لئے گئے ہیں۔ بالخصوص مقُدس یوحنا کی انجیل سے بارہ مقامات اوراس کے چھٹے اور سترھویں باب کے حوالے اور الفاظ ہیں۔ اناجیل اربعہ کے اقتباسات کے علاوہ اس کتاب میں اعمال الرسل رومیوں کا خط ، کرنتھیوں کا پہلاخط، افسیوں کا خط، طیطس کا خط، عبرانیوں کا خط ، ۱ پطرس ، تسلنیکی کے نام دونوں خط وغیرہ کے الفاظ اور اقتباسات پائے جاتےہیں[2] ۔

جب ہم اس بات کومدِ نظر رکھتےہیں کہ یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب ابھی آنخداوند کے حواری زندہ تھے اور انجیلی مجموعہ کی یہ کتابوں اور خطوط کولکھے پندرہ بیس برس سے زیادہ نہیں گذرے تھے تو ہم پر اس کتاب کی شہادت کی اہمیت ظاہر، اور یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ انجیلی مجموعہ کی کتاب میں نہ صرف کوئی فتور واقع نہیں ہوا بلکہ ان کا متن وہی ہے جو آجکل ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ بالفاظ مرحوم عالم کینین Kenyon. انجیلی مجموعہ کے متن

[1] Teaching of the Twelve Apostles by Spence.(Excursus.1.2)

[2] Ibid.p.105

کی صحت کی نسبت شک وشبہ کا اب امکان بھی جاتا رہا ہے کیونکہ متن کی حفاظت اب پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے[3] ۔

(۲۔)"برنباس کا خط" یروشلیم کی تباہی کے بعد، غالباً سکندریہ میں ۷۰ء میں لکھا گیا۔ مذکورہ بالا کتاب کی طرح یہ خط بھی منجئی عالمین کی وفات کے صرف چالیس سال بعد کا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اس کا مصنف وہی برنباس ہے جس کا ذکر اعمال کی کتاب میں کیا گیاہے۔ بہر حال یہ خط ایسا قدیم ہے کہ نسخہ سینامیں یہ خط دیگر انجیلی خطوط کے ساتھ ایک ہی جلد میں مجلد ہے جس سے ہم معلوم کرسکتےہیں کہ اس خط کو کس احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس خط میں سیدنا مسیح کے متعدد وزریں اقوال پائے جاتےہیں۔

(۳۔) کلیمنٹ کا خط۔ اس بزرگ کا ذکرمقُدس پولوس رسول نے فلپیوں (۴: ۳) میں کیاہے۔ یہ بزرگ روم کے بشپ ہوئےہیں۔ یہ خط ۹۰ء کا ہے یعنی سیدنا مسیح کی وفات کے ساٹھ سال بعد کا ہے۔ اس کے متعلق بشپ آئرینوس کہتاہے کہ " یہ خط کلیمنٹ نے لکھا تھا جس نے مبارک رسولوں کودیکھا تھا اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں رسولوں کی آواز گونجتی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے کلیسیائی دستورات اور روایات مرتب ہوئے تھے۔"

بشپ کلیمنٹ نہ یہ خط کرنتھیوں کی کلیسیا کی جانب لکھا تھا۔ چنانچہ کرنتھس کا بشپ ڈیوانی سیئس.Dionysius ۱۷۰ء میں کہتاہے کہ" قدیم زمانہ سے اس خط کو گرجا میں پڑھنے کا دستور چلا آیاہے۔ اس خط میں سیدنا مسیح کے متعدد کلمات طیبات پائے جاتے ہیں۔

[3] The Bible and Archeology (1940) pp.288ff.

(۴-) کتاب" ہرمیس کا چرواہا-" یہ کتاب بھی ۹۰ء کے قریب لکھی گئی تھی- اوریجن جیسے زبردست عالم اور مفسر کا خیال ہے کہ یہ ہرمیس وہی ہے جس کا ذکر مقُدس پولوس نے رومیوں کے خط(۱۶: ۱۴)میں کیاہے-

اس کتاب میں بھی منجی دوجہان کے متعدد کلمات پائے جاتے ہیں - یہ کتاب اپنی قدامت کی وجہ سے ایسی قدراور منزلت[1] سے دیکھی جاتی تھی کہ وہ نسخہ سینا کے آخر میں لکھی ہوئی ہے-

(۵-) مقدُس اگنیشئیس (Ignatius) اس بزرگ کو مقُدس یوحنا رسول نے سیدنا مسیح کی وفات کے قریباً چالیس سال بعد انطاکیہ کا بشپ مقرر کیا تھا- اس نے یہ خط ۱۱۵ءمیں روم کی جانب سفر کے دوران میں تاج شہادت حاصل کرنے سے پہلے مختلف مسیحی کلیساؤں کولکھے تھے- ان خطوط میں انجیلی متی ، انجیل یوحنا، رومیوں کے خط ، کرنتھیوں کے دونوں خطوط ، گلتیوں کے خط ، افسیوں کے خط، فلپیوں کے خط، ۱ ، ۲ تمیتھس اور طیطس کے خطوط کے اقتباسات موجود ہیں- ان اقتباسات کے علاوہ خطوط میں مرقس اور لوقا کی اناجیل ، اعمال الرسل- ۲ تھسلنیکی ، فلیمون ، عبرانیوں کے خط اور پطرس کے پہلے خط کے الفاظ اور ان حصوں کی جانب اشارے پائے جاتے ہیں-

(۶-) پولی کارپ شہید: یہ بزرگ یوحنا رسول کے شاگرد تھے- ان کی بابت بشپ آئرینوس لکھتاہے -" میں اس جگہ کو گویا اب بھی دیکھ سکتاہوں جہاں مبارک پولی کارپ بیٹھ کر تعلیم دیا کرتے تھے- میں ان کی نشست وبرخاست اور اطوار وعادات سے ، بخوبی واقف تھا- آپ اکثر ان مکالمات کا ذکر فرمایا کرتے تھے جو آپ نے مقدُس یوحنا رسول اور دیگر صحابہ سے

[1] Bishop Lightfoot, Apostolic Fathers p.294

سنے تھے- جنہوں نے سیدنا مسیح کے رُودررُو دیکھنے کا شرف پایا تھا- یہ مکالمات بعینہ اناجیل کے بیانات کے مطابق تھے-"

مقدُس پولیکارپ مقدُس اگنیشئس کا ہم عصر تھا اگرچہ عمر میں اس سے چھوٹا تھا- اس نے بھی تاجِ شہادت حاصل کرنے سے پہلے ۱۲۰ءمیں ایک خط فلپیوں کی کلیسیا کولکھا جس میں پہلی تین انجیلوں سے اقتباس کرتا ہے- ان اقتباسات کے علاوہ اس کے خط میں اعمال الرسل ، رومیوں ، ۱ ، ۲ کرنتھیوں ، گلتیوں - افسیوں ، فلپیوں- ۲ تھسلنیکی- ۱ ، ۲ تیمتھیس، عبرانیوں ، ۱ پطرس اور یوحنا کے پہلے خط کے الفاظ اور حوالے پائے جاتے ہیں-

رسولی زمانہ کے آبائے کلیسیا کی تصنیفات میں انجیلی مجموعہ کے اقتباسات بکثرت پائے جاتے ہیں- یہاں ہم ناظرین کی توجہ کتاب" نیوٹیسٹامنٹ ان دی اپاسٹالک فادرس" کی جانب مبذول کرنے پراکتفا کرتے ہیں-

مذکورہ بالا بزرگانِ کلیسیا پہلی صدی اور دوسری صدی کے پہلے نصف یعنی ۷۰ء عیسوی سے ۱۲۵ءعیسوی سے تعلق رکھتے ہیں- ان کی تحریرات میں بار بار اناجیل اربعہ اور سیدنا مسیح کے کلماتِ طیبات کے اقتباسات کئے گئے ہیں- یہ تحریرات ہم کو بارہ رسولوں کے زمانہ تک پہنچادیتی ہیں- ان میں نہ صرف سیدنا مسیح کے کلمات اوراحکام کاذکر ہے ، بلکہ مقدُس پولوس رسول کے خطوط میں سے یہ بزرگ رومیوں کے خط کرنتھیوں کے دونوں خطوں ، گلتیوں ، افسیوں ، فلیمون کے خطوط دونوں ، تھسلنکیوں کے خطوط ، تیمتھیس کے دونوں خطوط اور طیطس کے خط کے اقتباسات پیش کرتے ہیں- ان تحریرات میں عبرانیوں کے خط اور پطرس رسول کے دونوں خطوں کے اقتباس بھی پائے جاتے ہیں- اور یہ اقتباسات تعداد میں ساڑھے چھ سو(۶۵۰) سے زائد ہیں[2]-

[2] The New Testament in the Apostolic Fathers

(۷۔) جسٹن شہید۔ ایک مسیحی فلاسفر تھا۔ اس نے ۱۳۹ء اور ۱۶۱ء کے درمیان غیر مسیحیوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جو وہ انجیل پر کرتے تھے ۔ اس کی کتابوں میں انجیل کی آیات بکثرت موجود ہیں۔ یہ کتابیں اب ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ ان کتابوں کا متن پرانے سرُیانی اور قدیم لاطینی ترجموں کے مطابق ہے۔

(۸۔) مارشین[1] ۔ اہلِ بدعت کا سر برآوردہ لیڈر تھا۔ اس نے ۱۵۰ء میں ایک انجیل کا نسخہ تیار کیا ۔ جو انجیل سوم اور مقُدس پولوس کے خطوط پر مشتمل تھا۔ اس بدعتی مصنف کے جواب میں ایپی فے نیس[2] اور ٹرٹولین نے کتابیں لکھیں۔ اس کی تحریرات کا متن بھی پرانے سریانی ترجمہ اور قدیم لاطینی ترجمہ کے ساتھ متفق ہے۔

(۹۔) ٹیشئین[3] ۔ اس قابل مصنف نے ۱۷۰ء میں اپنی کتاب ڈیاٹیسرون تالیف کی، جس میں اس نے اناجیل اربعہ کے بیان کو انجیلی الفاظ میں ترتیب دیا تھا۔ اس کا ذکر تراجم کے ماتحت ہوچکا ہے۔

(۱۰۔) آئرنیوس[4] ۔(از ۱۱۵ء تا ۲۰۲ء) اس اسقف نے اپنی کتب کو ۱۸۱ء اور ۱۸۹ء کے درمیان یونانی زبان میں لکھا۔ اس کی حینِ حیات میں ان کتب کا لاطینی میں ترجمہ ہوگیا۔ اس کی کُتب میں عہدِ جدید کی کُتب کا بکثرت اقتباس کیا گیا ہے جن کا متن بھی قدیم سرُیانی اور قدیم لاطینی ترجمہ کے مطابق ہے۔

۱۹۳۵ء میں برطانیہ کے عجائب گھر نے ایک قدیم نسخہ کے پارہ کو شائع کیا جس میں انجیل کی تفسیر ہے۔ یہ پارہ تیسری صدی کے اوائل کا ہے اگرچہ تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق دوسری صدی سے ہے۔ یہ تفسیر یا تو بشپ آئرنیوس نے لکھی ہے اور یا انطاکیہ کے بشپ تھیوفلس کے قلم سے ہے۔ اس پارہ میں ۱۴۲ سطریں ہیں اور ان میں نو اقتباس موجود ہیں۔

(۱۱۔) سکندریہ کا کلیمنٹ[5] ۔ (از ۱۵۰ء تا ۲۲۰ء) اس نے یونان ، اٹلی اور مشرق میں فلسفہ کی تعلیم پائی تھی۔ وہ مسیحی ہوکر ۱۹۰ء میں سکندریہ کے مدرسہ الٰہیات کا پرنسپل ہوگیا۔ اس زمانہ میں اس نے اپنی کُتب تحریر کیں۔ وہ اپنی کُتب میں یہودیوں، مشرُکوں اور مسیحیوں کی کتابوں کا کثرت سے اقتباس کرتا ہے ۔ چونکہ سکندریہ علم وفضل کا دارالعلوم تھا اور مسیحی کُتب مقُدسہ وہاں پڑھائی جاتی تھیں لہذا اس مصنف کی کُتب کا خاص طور پر مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان کُتب کے انجیلی اقتباسات کا متن بھی پرُانے سرُیانی اور قدیم لاطینی ترجموں سے متفق ہے۔

(۱۲۔) قدیم مصنفین میں سے اوریجن[6] ۔ (از ۱۸۵ء تا ۲۳۵ء) سے زیادہ قابل اور نامور کوئی شخص نہیں گذرا وہ بالخصوص انجیلی متن کا مسلم الثبوت استاد تھا۔ ابھی وہ اٹھارہ سال کا نہیں ہوا تھا کہ سکندریہ کے مدرسہ الٰہیات کا کلیمنٹ کی جگہ پرنسپل بنایا گیا۔ ۲۳۱ء تک وہ اس مدرسہ میں پڑھتا رہا۔ اس کے بعد جب وہ سکندریہ سے قیصریہ کو چلا گیا تو وہاں اس نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ ایک نہایت زبردست مصنف تھا جس نے میدانِ مناظرہ میں منکرینِ مسیحیت بالخصوص سیلسCelsus جیسے مخالف کے منہ توڑ جواب لکھے ہیں۔

اوریجن ایک نہایت فاضل شخص تھا۔ اس کے علم وفضل کا ذکر ہم حصہ اول کے باب ششم میں کرآئے ہیں۔ اس نے عہد جدید کی کُتب پر تفاسیر لکھی ہیں جن کے مطالعہ سے

---

[1] Marcian

[2] Epiphanius

[3] Tatian

[4] Irenaeus

[5] Clement of Alexandria

[6] Origen

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہدِ جدید کی کُتب کے بیسیوں نسخے اس کی نظر سے گذر چکے تھے اور اس نے مختلف قراتوں کی جانچ پڑتال نہایت عرقریزی سے کی تھی۔ جب ہم اس بات کا لحاظ کرتے ہیں کہ اس کا زمانہ دوسری صدی کا ہے اور اس نے نہایت قدیم نسخوں کا مطالعہ کیا تھا تو اس عالم کی شہادت کی اہمیت ہم پر عیاں ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی تفاسیر میں عموماً بتاتا ہے کہ فلاں قرات " بہت نسخوں میں " ملتی ہے۔ فلاں قرات " قدیم ترین نسخوں میں " ملتی ہے اور فلاں قرات " بہترین نسخوں میں " ملتی ہے۔ اس کی کتابیں الہیات کے مدرسہ کے نصاب میں شامل تھیں۔

(۱۳۔) ٹرٹولین۔ کار تھیج کی کلیسیا کا زبردست عالم تھا۔(از ۱۵۰ء تا ۲۲۰ء) یہ شخص پہلے وکالت کا کام کرتا تھا۔ جب وہ مسیحی ہوا تو بڑا زبردست مصنف ثابت ہوا۔ ۲۰۲ء میں وہ ایک بدعتی فرقہ کا پیرو ہوگیا۔ پس وہ راسخ الاعتقاد اور بدعتی کلیسیاؤں کا شریک رہ چکا تھا۔ اس کی کُتب میں کُتبِ مقُدسہ کے اقتباسات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

(۱۴۔) ہپولیطس[1] ۔(از ۱۷۵ء تا ۲۵۰ء) یہ مصنف اوریجن کی طرح کثرت سے کتابیں تصنیف کرتا تھا۔ وہ رومی کلیسیا میں اپنے زمانہ کا بہترین عالم دینیات تھا۔ اس نے عہد عتیق اور عہد جدید کی مختلف کُتب پر تفسیریں لکھی ہیں اور ان میں عہد جدید کے بے شمار حوالے دیئے ہیں۔

(۱۵۔) قیصریہ کا یوسی بئیس[2] (از ۲۷۰ء تا ۳۴۰ء) قدیم کلیسیا کی مشہور مورخ گذرا ہے اس کے پاس نہایت اعلیٰ کُتب خانہ تھا۔ جس کا وہ کثرت سے استعمال کرتا تھا۔ اس میں بہترین نسخے موجود تھے، اور وہ اپنی تفاسیر میں عہدِ جدید کی مختلف قراتوں کا ذکر کرتا ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ہم اوپر بتلاچکے ہیں کہ پہلے مسیحی شاہنشاہ کانسٹن ٹائن نے اسی نامور عالم

[1] Hippolytus.

[2] Eusebius of Caesarea.

اور فاضل مصنف کو حکم دیا تھا کہ وہ اس کے نئے دارالسلطنت قسطنطنیہ کے لئے کتابِ مقُدس کی پچاس جلدیں تیار کرے۔ یہ جلدیں اس نے بہترین اور صحیح ترین نسخوں سے نفیس چومی قرطاس پر نہایت ہوشیار اور خوشخط کاتبوں سے نقل سے نقل کروائی تھیں۔

ناظرین کی واقفیت کے لئے ہم نے ان ابتدائی مسیحی صدیوں کے یونانی مصنفین میں سے صرف چند ایک کا مختصر ذکر بطور مشتے نمونہ ازخروارے کیا ہے۔ ہم نے ان ابتدائی صدیوں کے دیگر سربرآوردہ مسیحی مصنفوں مثلاً مقدس کرسسٹم[3]، مقُدس فوطیس[4] اور لاطینی مصنفو مثلاً سپرین[5]، کیگلیاری کے لوسیفر[6] اور نوویشین[7] وغیرہ کا اور شامی مصنفوں مثلاً مقدس افرائیم[8] اور افراہات[9] وغیرہ جیسی مقتدر ہستیوں کا بخوفِ طوالت ذکر نہیں کیا۔ حق تو یہ ہے کہ اگر روئے زمین پر سے آج یونانی انجیل کی تمام کاپیاں مفقود بھی ہوجائیں تو بھی ان ابتدائی صدیوں کے مسیحی مصنفین کے اقتباسات کو ترتیب دے کر انجیل جلیل کی تمام کُتب کے متن کو حاصل کرسکتے ہیں۔

نقشہ اقتباسات

ہم ذیل میں ایک نقشہ دیتے ہیں جس پر نظر کرنے سے ان قدیم بزرگوں کی شہادت کی اہمیت ہم پر کھل جائے گی۔ اس نقشہ میں ہم صرف دوسری اور تیسری صدی کے فقط سات بزرگوں کی کُتب کے اقتباسات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ ناظرین خود خیال کرسکتے

[3] Chrysosttom

[4] Photius.

[5] Cyprian

[6] Lucifer of Cagliari

[7] Novation.

[8] Ephraem.

[9] Aphrahat.

ہیں کہ اگر ہم اس پیمانہ پر صرف چار صدیوں کے چند سر برآوردہ مشاہیر اساتذہ کا ہی کلام لیں تو انجیلی متن کی صحت کے حق میں ان کی شہادت کیسی عالیشان اور زبردست ہوگی۔

نام مصنف	اناجیل اربعہ	اعمال	خطوط عام	خطوط پولوس	مکاشفات	میزان کل
جسٹن شہید	۲٦۸	۱۰	٦	۴۳	۳	۳۳۰
آئرنیوس	۱۰۳۸	۱۹۴	۲۳	۴۹۹	٦۵	۱۸۱۹
سکندریہ کا کلیمنٹ	۱۰۱۷	۴۴	۲۰۷	۱۱۲۷	۱۱	۲۴۰٦
اوریجن	۹۲۳۱	۳۴۹	۳۹۹	۷۷۷۸	۱٦۵	۱۷۹۲۲
ٹرٹولین	۳۲۸۸	۵۰۲	۱۲۰	۲٦۰۹	۲۰۵	۷۲۵۸
ہپولیطس	۷۳۴	۴۲	۲۷	۳۸۷	۱۸۸	۱۳۷۸
یوسی بیئس	۲۳۵۸	۲۱۱	۸۸	۱۵۹۲	۲۷	۵۱۷٦
میزان کل	۱۹۳٦۸	۱۳۵۲	۸۷۰	۱۴۰۳۵	٦٦۴	۳٦۲۸٦

اب ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ اگر دوسری اور تیسری صدیوں سے صرف سات اشخاص کی کُتب میں چھتیس ہزار نواسی اقتباسات موجود ہیں تو باقی پچاسوں مشاہیر اساتذہ کی کُتب میں کتنے لاکھ اقتباسات موجود ہوں گے اور اگر ہم صرف پہلی چار صدیوں کے تمام مصنفین کی کتابوں کی کھوج لگائیں تو یہ اقتباسات کروڑوں کے شمار سے بھی بڑھ جائیں گے۔ یہ کروڑوں اقتباسات انجیل جلیل کے متن کی صحت کے گواہ ہیں جو تیرہ ہزار یونانی قلمی نسخوں اور دیگر زبانوں کے ترجموں کے ہزاروں نسخوں کے علاوہ ہیں اور مشرق ومغرب کی کلیسیاؤں کے مصنفین کی کتابوں میں موجود ہیں۔ کیا ان کروڑوں گواہوں کی موجودگی میں کوئی سلیم الطبع انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ موجودہ انجیل محرف ہے اور پایہ اعتبار سے ساقط ہے۔ یہ تمام گواہ بیک زبان موجودہ انجیل کے متن کی اصلیت اور الفاظ کے شاہد ہیں۔ اس پر بھی

گرنہ بیند بروز شپرہ چشم

چشمہ آفتاب راچہ گناہ؟

بابِ ہفتم

موازنہ صحتِ انجیل وقرآن

معروضی نقطہ نگاہ

ہم اس کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں کہ انشاء اللہ ہم معروضی نقطہ نگاہ کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیں گے اور صرف اصولِ علم تنقید سے کام کر بائبل مقُدس اور قرآن مجید کی صحت کے شواہد کی شہادتوں کی دیانت داری اور انصاف سے پرکھیں گے اور اپنے خصوصی اعتقادات کو اس کارِ خیر میں مطلق دخل انداز ہونے نہ دیں گے کچھ حد تک یہ صحیح ہے کہ کوئی مصنف بالکل خالی الذہن ہوکر کسی کتاب کو تصنیف نہیں کرسکتا، لیکن ہم نے شعوری طور پر اس کتاب کی تالیف میں جہاں تک ممکن ہوسکا، اپنے خصوصی معتقدات کو اثر ڈالنے نہیں دیا اور ہر قسم کے مذہبی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر صرف تحقیقِ حق کو نگاہ میں رکھا ہے۔

یہ کتاب مناظرانہ رنگ میں نہیں لکھی گئی کیونکہ اس کا اصلی مقصد ایک علمی ، تواریخی اور ادبی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے مخاطب اس کتاب کو ایک مسیحی پادری کی تصنیف خیال کرکے مناظرانہ انداز اختیار نہ کریں اوران کا ردِ عمل مخالفانہ نہ ہو کیونکہ اس کتاب میں ہمارا روئے سخن ایسے تمام سلیم العقل اصحاب سے ہے جو تحقیقِ حق کی منزل، ہفتخواں میں سرگرداں ہیں اور بائبل وقرآن کی صحت کے متعلق حق بات کوجاننا اوراس کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں خواہ یہ حق ان کے ان خیالات کےموافق یا غیر موافق ہو جس میں ان کے دماغوں نے بچپن سے پرورش اور تربیت پائی ہو۔

ہم نے ابوابِ بالامیں ایسے اصحاب کے سامنے وہ نتائج پیش کئے ہیں جن پر دورِ حاضرہ کے علماء اور نقاد بعد از بحث و تمحیصِ بسیار پہنچے ہیں اورجو تمام نقادوں کے نزدیک مسلم ہیں۔ان نتائج کے پیش کرنے میں ہم نے حددرجہ احتیاط برتی ہے کہ مناظرہ اور مکابرہ سے کنارہ کشی کی جائے۔ ہم نے بالخصوص اس امر کومدِ نظر رکھاہے کہ حتی الوسع کوئی ایسا لفظ قلم سے نہ نکلے جس سے بردارانِ اسلام کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔ اس نکتہ کو پیشِ نظر رکھ کرہم نے اصولِ علم وروایت وتنقید کا اطلاق الکتاب اور قرآن دونوپر بےلاگ یکساں طور پر کیا ہے اورطرفداری سے گریز کرکے کتابِ مقُدس کو تاریخی اور تنقیدی نگاہوں سے دیکھ کرعلماء کے مسلم نتائج کو ناظرین کے سامنے پیش کردیا ہے تاکہ وہ خود فیصلہ کرسکیں کہ تحریف کا نظریہ کہاں تک حق بجانب ہے۔

اس باب میں ہم انہی اصول وروایت اور علم تنقید کی تاریخ کی روسے قرآن مجید کی صحت کا صرف مختصر طورپر موازنہ کریں گے، کیونکہ یہ اصول عام ہیں جو کسی کتاب کی (خواہ وہ مذہبی ہو یاغیر مذہبی)جانبداری نہیں کرتے اور مذہبی کُتب کو خواہ وہ پرُان ہوں یا وید، ژندواستا ہو یا بھاگوت گیتا، قرآن ہو یا بائبل سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ یہی طریقہ وروایت انجیل وقرآن دونوں کو مسلم بھی ہے۔ دونوں کتابیں حکم دیتی ہیں کہ اس طریقہ کو استعمال کیا جائے ۔ چنانچہ انجیل میں آیا ہے " سب باتوں کو پرکھو اور بہتر کو اختیار کرو۔"(۱ تھسلینکیوں ۵: ۲۱) قرآن مجید میں بھی وارد ہوا ہے وزنو بالقسطاس المستقیمہ یعنی سیدھی ترازو میں تولو کیونکہ بہتر ہے اوراس کا انجام بھی بہت عمدہ ہے" (سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۷) پس کسی مومن مسلمان کواس کارِخیر سے گریز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اصول تنقید کے مطابق قرآن مجید کا موازنہ کرے اور کسی مسلمان کو مجاز نہیں کہ وہ کسی ایسے شخص کی نیت پرشبہ کرے جو قرآنی ارشاد کے مطابق قرآن مجید کی صحت کامعروضی نقطہ نظر سے موازنہ کرتا ہے۔

یہ کام در حقیقت موجودہ زمانہ کے علماء اسلام کا ہے جن کے اذہان دَورِ حاضرہ کے علوم کی روشنی سے منور ہو چکے ہیں۔ ہم نے خلوصِ نیت سے محض تاریخی لحاظ سے ایک مختصر باب لکھ کر صرف نشان دہی کا کام دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسلامی علماء خود اس عظیم کام کو سر انجام دینے کا بیڑا اٹھائیں گے اور اصولِ تنقید کی روشنی میں قرآن مجید کی صحت پر ایک سیر حاصل نظر کریں گے جس طرح ہم نے کتابِ مقدس پر نظر کی ہے۔ ہم نے اس باب میں اصول ورایت کی روشنی میں قرآن مجید کی نسبت جو کچھ صحیح سمجھا ہے وہ بے کم وکاست پر مُحبت پیرایہ میں لکھ دیا ہے۔ خدا کرے کہ ان سطور کو پڑھ کر علمائے اسلام کے دلوں میں اس معاملہ کو خود تلاش کرنے کی خواہش اور تڑپ پیدا ہو اور وہ بھی معروضی نقطہ نگاہ سے اصولِ تنقید کے مطابق قرآن مجید کی اصلیت، سالمیت اور صحت پر بےلاگ مفصل بحث کریں۔

من آنچہ شرطِ بلاغ است با تو میگویم
تو از سخنم خواہ پند گیر، خواہ ملال

گذشتہ ابواب میں ہم نے تصحیف کا تبین کی حقیقت پر غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سہو کتابت سے انجیل جلیل کے متن میں کسی قسم کا فتور پیدا نہیں ہوا۔ اور کہ موجودہ انجیل کے الفاظ وہی ہیں جو اس کے الہامی مصنفین نے اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھے تھے۔ گذشتہ دو ہزار سال کے ہزاروں نسخہ جات جو مختلف زبانوں ملکوں اور زمانوں کے ہیں اس نتیجہ کے مصدق ہیں۔ انجیل کے قدیم اور بے نظیر ترجمہ جو دو ہزار سال سے اقوامِ عالم کے ہاتھوں میں ہیں انجیل کی صحت کے گواہ ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف ممالک اور ازمنہ کے راسخ الاعتقاد اور بدعتی مسیحی مصنفین کے کروڑوں اقتباسات انجیل جلیل کے الفاظ کی صحت پر ببانگ دہل شہادت دے رہے ہیں " جس کے کان سننے کے ہوں وہ سن لے۔"

قرآن نبوی اور دیگر مصاحف

جہاں انجیل جلیل کی صحت پر ایسے زبردست شواہد موجود ہیں جن کی الگ الگ اور متفقہ شہادت سے کسی صحیح العقل شخص کو انکار کرنے کی مجال نہیں ہو سکتی وہاں اہلِ اسلام کی کتاب قرآن شریف کی تاریخ ہم کو یہ یاد دلاتی ہے کہ قرآن نبوی کے اصلی الفاظ کو معلوم کرنا اب انسانی قدرت سے باہر ہے۔ ہاں اگر حضرت عثمان احراق قرآن کا حکم نہ دیتے اور آج ممالکِ اسلامیہ میں حضرت سالم کے مصحف، حضرت ابوبکر کے مصحف، حضرت انس بن مالک کے مصحف، حضرت ابوموسیٰ الاشعری کے مصحف، حضرت ابن عباس کے مصحف، حضرت عمر کے مصحف، حضرت عبداللہ بن مسعود کے مصحف، حضرت اُبے ابن کعب کے مصحف، حضرت علی کے مصحف اور دیگر دیار وامصار کے اصحاب کے مصاحف کے نسخوں کی نقلیں ہمارے ہاتھوں میں ہوتیں تو ان نسخوں کے مقابلہ سے قرآن نبوی کے اصل الفاظ کا پتہ چل سکتا تھا۔ ہم اس جگہ ناظرین کو قرآن شریف کی جمع و ترتیب کی مفصل کہانی بتانا نہیں چاہتے۔ جن اصحاب کو اس کے بارے میں تحقیق کرنی منظور ہو وہ اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مذکورہ بالا مصاحف کے نسخے اور حضرت ابنِ عمر، حضرت ابن الزبیر اور صحابہ رسول کے روایہ فی حروف اور دیگر مصاحف (جن کا ذکر ابن ابی داؤد کی کتاب، دیگر مصاحف اور دیگر قدیم اسلامی کُتب میں کہیں کہیں آیا ہے۔ ہمارے پاس موجود ہوتے تو بہت سے معمے جو اب حل طلب ہیں حل ہو جاتے۔ مثلاً سبعتہ احرف کے اختلافات کی نوعیت کا ہمیں پتہ لگ جاتا۔ قرات کے اختلافات کو جانچ کر صحیح قرات کا علم ہو سکتا تھا۔ مابین الدفتین کے مسئلہ پر روشنی پڑتی۔ الہامی اور غیر الہامی عبارت میں تمیز کی جاسکتی۔ جو اصل قرآن میں نہیں تھا وہ خارج کیا جاسکتا اور جو اصل قرآن تھا (لیکن جس نے مصحفِ عثمانی میں دخل نہ پایا) قرآن میں پھر درج کر سکتا تھا۔ یعنی جہاں تک ممکن تھا اصل عبارتِ قرآن نبوی کا پتہ چل سکتا تھا۔ لیکن خلیفہ عثمان کے قطعی اور ناطق حکم نے سوائے صحیفہ عثمانی کے تمام دیگر صحف کو آگ کی نذر کر دیا اور اب اصلی قرآن نبوی کے الفاظ

وآیات اور سورتوں کا پتہ لگانا، ناممکنات میں سے ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں انجیل جلیل کی اصلی عبارت کو معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس ہزاروں نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے وہاں قرآن نبوی کی اصل اور مکمل عبارت کو معلوم کرنے کے لئے ذرائع مفقود ہیں۔

(۲)

حق تو یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا مصاحف کے نسخوں کی نقلیں آج اس دنیا میں موجود بھی ہوتیں تو بھی ان کا مقابلہ کرکے ایک جامع قرآن مرتب نہ ہوسکتا۔ ایسے قرآن کی نسبت ہم وثوق کے ساتھ یہ کبھی نہ کہہ سکتے کہ یہ جامع اور مانع قرآن ہے اور تمام آیات جو رسول عربی پر نازل ہوئیں اس میں موجود ہیں اور اس میں کوئی آیت ایسی نہیں جو ان پر نہ اتری ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نبوی کا ہمارے ہاتھوں میں ہونا قطعی ناممکن امر ہے، کیونکہ آنحضرت کی حینِ حیات میں کوئی قرآن جمع نہیں تھا۔ اس حقیقت پر قرآن خود شاہد ہے چنانچہ لکھا ہے "ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضیٰ الیک وحیہ" اے محمد قرآن (کے جمع کرنے میں) قبل اس کے کہ تجھ پر اس کی وحی پوری ہوجائے جلد ہی مت کر (طہٰ آیت ۱۰۳) ۔ پھر لکھا ہے کہ قرآن کا جمع کرنا اور اس کی صحیح تاویل کرنا خدا کا ذمہ ہے ۔"ان علینا جمعہ وقرانہ، ثمہ ان علینا بیانہ" یعنی قرآن کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارا ذمہ ہے اور اس کی تاویل کرنا بھی ہمارا ہی کام ہے (قیامہ ۱۷، ۱۸) پس رسول عربی کی زندگی میں قرآن جمع نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جب آپ کی وفات کے بعد حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو قرآن جمع کرنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے جواب دیا" تم کیونکر وہ کام کرنا چاہتے تو جس کو خود رسول اللہ نے نہیں کیا۔"

مولوی محمد علی صاحب ! امیر جماعت احمدیہ لاہور کو بھی اقبال ہے کہ " جو تحریریں آنحضرت ﷺ نے اپنے روبرو لکھوائی تھیں، وہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں سب کی سب ایک جگہ جمع نہ کی گئی تھیں اور نہ ہی ان کو کوئی ترتیب دی گئی تھی اور مہبط وحی علیہ الصلواۃ والسلام کی زندگی میں ان تحریروں کی جمع اور ترتیب بھی نہ ہوسکتی تھی۔ کیونکہ حافظ قرآن کے لئے تو یہ ایک آسان امر تھا کہ جب کوئی نئی آیات نازل ہوتی اوران کو بتادیا جاتا کہ اس کو فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد پڑھو تو وہ آسانی سے یہ کرسکتے تھے۔ مگر ایک مکمل جلد میں بعد ایسی آئتیں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔" (جمع قرآن صفحہ ۶۵)۔

جب جمع قرآن کا کام زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا تو وہ کہتا ہے کہ " میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اور اسے جمع کرتا تھا، کھجور کی ٹہنیوں اور پتھر کی تختیوں سے اور آدمیوں کے سینوں یعنی حافظوں سے ۔" جمع قرآن کا کام ایسا دشوار تھا کہ زید کہتا ہے کہ " خدا کی قسم اگر مجھے اس بات پر مجبور کرتے کہ تم ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کردو تو یہ بات مجھے زیادہ دشوار معلوم نہ ہوتی بہ نسبت اس کے کہ مجھے قرآن کا حکم دیا۔" اس حدیث کومولوی صاحب موصوف " اول درجہ ی معتبر اور صحیح احادیث میں تسلیم کرتے ہیں۔(صفحہ ۶۵) زید کو قرآن کے جمع کرنے کا حکم اس حدیث کے مطابق اس لئے ہوا کیونکہ " یمامہ کے جنگ میں قرآن کے قاریوں میں بہت قتل واقع ہوا تھا" اور "خدشہ " تھا کہ " بہت ساحصہ قرآن مجید کا گم ہوجائے گا۔" پس چونکہ " قرآن کا بہت سے ساحصہ " قاریوں کے سینوں میں تھا اور "قاریوں میں بہت قتل واقع" ہو گیا تھا لہذا" قرآن کا بہت ساحصہ" جو صرف ان قاریوں کو ہی یاد تھا ان کی شہادت کے وقت ضائع ہوگیا۔ چنانچہ ابن ابی داؤد سے مروی ہے کہ " عمر نے قرآن کی کسی آیات کو دریافت کیا تو ان سے کہا گیا کہ وہ آیت فلاں شخص کو یاد تھی جو کہ معرکہ یمامہ میں قتل ہوگیا۔ یہ سن کر عمر نے کہا انا اللہ اورانہوں نے قرآن کو جمع کرنا کا حکم دیا۔" دیگر بہت سی آیات، آیات، رجم اور آیت رضاع کی طرح ضائع بھی ہو گئیں ۔صاحب دبستانِ مذاہب ہم کو ایک سورت بھی بتاتا ہے کہ جو ضائع ہو گئی ہے (صفحہ ۲۲۰ تا صفحہ ۲۲۱) پس جیسا امام جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے ۔قال ابو عبیدہ حدثنا اسمعیا بن ابراہیمہ عن ایواب عن نافع عن عمر قال لا یقولن احدکمہ قد اخذت القران کلہ مایدریہ ماکلمہ قد ذهب منہ قرآن کثیراً یعنی " تم میں سے کوئی شخص بھی نہیں دعوےٰ کرسکتا

کہ اس نے پورا اور مکمل قرآن حاصل کیا ہے۔ اوراس کو کیونکہ معلوم ہوسکتا ہے کہ مکمل اور پوراقرآن حاصل کیاہے جبکہ اس قرآن کا بہت سا حصہ اس میں ضائع ہو گیاہے۔"

(۳)

مصحفِ عثمانی اور دیگر مصاحف میں عظیم فرق تھا۔ اصول کافی میں لکھاہے کہ حضرت علی نے اپنے جمع شدہ قرآن کو محضر صحابہ میں پیش کیا اور فرمایا۔ ھذا کتاب اللہ کما انزل علی محمد فقالوالاحاجۃ لنافیہ فقال اماواللہ ما نزرونہ بعد یومکم ھذا ابداً۔ (صفحہ ۱۷۱)۔

"یعنی یہ وہی ہے قرآن ہے جو اللہ نے رسول پر نازل کیا تھا۔صحابہ نے کہا ہم کو اس قرآن کی ضرورت نہیں ، ہمارے پاس جو قرآن ہے وہی ہم کو کافی ہے ۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ خدا کی قسم آج کے بعد تم کو اصلی قرآن دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔"

تفسیر صافی مطبوعہ طہران میں لکھا ہے کہ " اس میں کچھ شک نہیں کہ جو "قرآن ہمارے پاس ہے وہ مکمل نہیں ہے جس طرح وہ محمد پر نازل ہوا تھا۔ بلکہ اس میں وہ چیز ہے جو محرف اورمبدل ہے اور اس قرآن میں ملحدین کا کلام ہے اور وہ خدا اوراس کے رسول کی مرضی کےمطابق مرتب نہیں ہوا۔"صفحہ ۴۳۰۔

قابل امریکن مستشرق اور نقاد ڈاکٹر آرتھر جیفری نے اپنی کتاب[1] میں ابنِ مسعود کے قرات جمع کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ مسعود کا مصحف ایک ہزار چھ سو پچاس(۱۶۵۰) سے زائد مقامات میں موجودہ قرآن سے مختلف تھا۔ اس عالم نے محنتِ شاقہ کرکے دیگر مصاحف کے قرات بھی اکٹھے کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابے بن کعب کا مصحف قریباً ایک ہزار ایک سو پچاس مقامات میں موجودہ قرآن سے اختلاف رکھتا ہے ۔ ابنِ مسعود اورابے بن کعب کے مصاحف متعدد مقامات میں ان اختلافات کے معاملہ میں نہ صرف حرکات اور حروف کا بلکہ الفاظ، فقرات اور آیات بلکہ سورتوں کا بھی موجودہ قرآن سے اختلاف ہے۔ان اختلافات کے متعلق ڈاکٹر صاحب موصوف کہتے ہیں کہ " ہمیں یہ امر کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہم تک قرات کے صرف وہی اختلافات پہنچے ہیں جن سے شرر اور فتنہ کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا تھا۔" (صفحہ ۱۶ تفسیر کبیر میں امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں کہ " ابن مسعود سورہ فاتحہ اور معوذتین کے داخلِ قرآن ہونے سے انکار کرتے تھے۔" اتقان نوع ۲۰ میں ایسی سورتوں کی تعداد ستر بتائی گئی ہے۔" جن کی آیات کی تعداد میں اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح پر اختلاف پڑگیا ہے۔" اسی کتاب میں ابی ابن کعب کا قول ہے کہ " سورہ احزاب اگر پوری رہنے دی جاتی تو سورہ بقر کے برابر ہوتی ۔" جس سے ظاہر ہے کہ رسول عربی کے زمانہ میں اس سورت میں دوصد آیات تھیں لیکن صحیفہ عثمانی میں صرف ۷۳ آیات ہیں۔ اتقان نوع ۱۸ میں ہے کہ " ابن مسعود کے مصحف میں سب سے پہلے سورہ بقر تھی پھر سورہ نساء اسکے بعد سورہ آل عمران نہایت سخت اختلاف کے ساتھ اور اسی طرح پر ابی بن کعب اور دیگر صحابہ کے مصاحف تھے۔" تفسیر درِ منشور میں حذیفہ کا قول ہے کہ " تم سورۃ توبہ میں نہیں پڑھتے ہو جو کچھ کہ ہم پڑھا کرتے تھے ۔مگر اس کا چوتھا حصہ ۔" اسی طرح قرآن کی سورتوں کی تعداد ، اس کی آیات کی تعداد، فقرات کی تعداد اور الفاظ اور حروف کی تعداد میں اختلاف ہے اور یہ اقوال کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے نہیں بلکہ امہات المومنین حضرت عائشہ ، حضرت حفصہ اور ان مسلم الثبوت استادوں کے ہیں جو رسولِ عربی کے زمانہ میں دوسروں کو قرآن سکھانے پر مقرر تھے۔

سبعتہ الاحراف

علاوہ ازیں تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ حضرت رسول کی حین حیات میں ہی قرآنی الفاظ حافظوں کو درستی سے معلوم نہیں تھے۔چنانچہ ابنِ مسعود سے روایت ہے کہ اس نے کہا کہ " میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے سنا لیکن میں نے نبی ﷺ کو اس کے خلاف

[1] Material for the History of the Text of the Quran, By Arthur Jeffery 1937

پڑھتے سنا۔ پس میں اس کو آپ کے پاس پکڑلایا اور آپ کو اس امر کی اطلاع دی ۔ میں نے حضرت کے چہرے پر باہمی جھگڑے کی وجہ سے غصہ کے آثار دیکھے۔ آپ نے فرمایا کہ " تم دونوں صحیح پڑھتے ہو پس آپس میں اختلاف نہ کرو جس طرح تم سے پہلے ایک دوسرے جو جھٹلانے والے لوگ ہلاک ہوگئے ۔" اس کو بخاری نے روایت کیا ہے ۔ حضرت عمر بن خطاب کا قول ہے کہ " میں نے ہشام بن حکیم کو سورہ فرقان اور لوگوں سے خلاف پڑھتے سنا اور وہ اس سورت کو بہت سے ایسے الفاظ کے ساتھ پڑھ رہا تھا جو مجھ کو نبی ﷺ نے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز پڑھتے ہی اس پر حملہ کردوں مگر میں نے صبر کیا اوراس کو سلام پھیرلینے دیا۔ میں نے اس سے پوچھا تجھ کو یہ سورۃ کس نے پڑھائی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ رسول اللہ نے ۔ میں نےکہا کہ توجھوٹ بولتا ہے۔رسول اللہ نے تجھ کو اس طرح کبھی نہیں پڑھایا ۔ تب میں نے اس کی چادر اس کے گلے میں ڈال کر اس کو رسول اللہ تک کھینچتا لایا اورکہا اے رسول اللہ میں نے اس سے سورہ فرقان سنا خلاف اس کے جیسا آپ نے مجھے پڑھایا۔" (مسلم کتاب فضیلت القرآن مشکواۃ۔ سنن نسائی وغیرہ)۔

اس اختلاف کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ قرآن سات حرف پر نازل کیا گیا ہے۔ جب یہ سوال کیا جاتاہے کہ " سات حرف" کا کیا مطلب ہے تو سب اپنے قیاسی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ چنانچہ صاحبِ اتقان نے اس امر کے متعلق قریباً چالیس اقوال نقل کئے ہیں ! شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں کہ قرآن قریش کی زبان اور لغت پر نازل ہوا تھا لیکن حضرت عمر اور حضرت ہشام دونوں قبیلہ قریش کے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اختلافِ قرات کا اختلافِ لغت سے کوئی تعلق نہیں، ہر شخص پر جو غوروفکر کرنے کا عادی ہے ظاہر ہے کہ اس اختلاف قرات کی نوعیت اہم قسم کی ہوگی کہ حضرت عمر اور حضرت ہشام جیسے جید صحابہ جیسے جو نہ صرف قریشی اور ایک ہی جگہ کے رہنے والے بلکہ ایک ہی قبیلہ کے شریک تھے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ مشارق الانوار حدیث نمبر ۵۱۸، ۵۴۸، ۹۹۶ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۔ کہ ایسے واقعات اکثر رونما ہوتے تھے۔ ان حالات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قرآن نبوی کے اصلی الفاظ کا حضرت کے وقت میں بھی پتہ نہیں تھا۔ پس اگر قرآن نبوی بھی ہمارے ہاتھوں میں ہوتا تو پھر بھی وثوق کے ساتھ یہ نہ کہہ سکتے کہ اس کے الفاظ درحقیقت قرآن کے اصلی الفاظ ہیں جو رسول عربی نے اپنے صحابہ کرام کو سکھائے تھے۔

عربی قرآن اور حضرت عثمان

جہاں ہم انجیل جلیل کے ہزاروں نسخوں کا ہم مقابلہ کرنے سے اس کے اصلی الفاظ کو یقین اور وثوق کے ساتھ پاسکتے ہیں وہاں قرآن نبوی کے اصلی الفاظ کو معلوم کرنا اور مکمل قرآن کا پانا ناممکنات سے ہے۔ قرآن نبوی کے حصص قاریوں کے سینوں پر ہونے کی وجہ سے ان کی شہادت کے وقت اور دیگر وجوہ کے باعث ضائع ہوگئے۔ لیکن انجیلِ جلیل کی کُتب ابتداہی سے احاطہ تحریر میں آچکی تھیں اور اُن کی ہزاروں نقلیں ممالک شرق وغرب میں کی گئی تھیں۔ ان نقلوں کی ہزاروں نقلیں دورحاضر میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ لہذا انجیل جلیل کے اصلی متن کا ایک شوشہ بھی ضائع نہیں ہوا۔ سہوِ کاتب البتہ ان نسخوں میں موجود ہیں، لیکن ان ہزاروں نسخوں کے مقابلہ کرنے سے کتابت کی غلطیاں درست ہوجاتی ہیں۔

مولوی محمد علی صاحب قرآن میں کاتب کی غلطیوں کے بھی قائل ہیں ۔چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ " اس قسم کے اختلافات آج چھپے ہوئے نسخہ جات قرآنی میں بھی دکھائے جاسکتے ہیں جو کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ ہم یہ نہیں مانتے کہ پچھلے زمانہ کے کاتب فرشتے تھے وہ بھی انسان تھے، بلکہ ذرائع علم ومقابلہ چونکہ اس قسم کے موجود نہ تھے جیسے ہمارے زمانہ میں ہیں ۔ اس لئے ان سے غلطی کا ہوجانا اور پھر اس کا درست نہ ہوسکنا اور بھی قرین قیاس ہے۔ یہی تو وہ بات تھی جس کی اصلاح کےلئے حضرت عثمان

رضی اللہ تعالیٰ نے مختلف مسودات کو جو لوگوں نے اپنے طور پر رکھے ہوئے تھے جلوادیا۔"(جمع قرآن صفحہ ۱۱۰)۔

لیکن افسوس تو یہ ہے کہ خود عثمانی مصحف غلطیوں سے پاک نہ تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اپنی کتاب ازالۃ الخفا میں فرماتے ہیں کہ " بعد ازانکہ قرآن شریف در مصحف مجموع شدہ فاروق اعظم سالہا در فکر تصحیح اوصرف نمود مناظرہ بہ صحابہ میکرد۔ گاہے برحق، برونق مکتوب ظاہر مے شد آنرا باقی مے گذاشت ومردماں راازخلاف آں باز میداشت۔ وگاہے حق برخلاف مکتوب ظاہر مے شد۔ ازیں صورت مکتوب راحک مے فرمود۔ وبجائے دے آنکہ محقق مے شد مے نوشت" یعنی بعد اس کے کہ قرآن شریف مصحف میں جمع کیا گیا۔ حضرت فاروق اعظم نے کئی سال اس کی تصحیح کی فکر میں صرف کئے اور صحابہ کے ساتھ اکثر مناظرہ کیا کرتے تھے کبھی تو حق مکتوب کے موافق ظاہر ہوتا (حق کے معیار کے اصول کیا تھے؟ (مولف) پس اس کو باقی رہنے دیتے اور لوگوں کو اس کی مخالفت سے باز رکھتے اور کبھی حق اس مکتوب کے برخلاف ہوتا اس صورت میں لکھے ہوئے کو مٹاڈالتے اور بجائے اس کے وہی لکھ دیتے جو حق ثابت ہوتا تھا۔ (ماخوذ از ضمیمہ تاویل القرآن صفحہ ۸۳)۔

اس پر بھی مصحف عثمانی میں غلطیاں باقی رہ گئیں۔ چنانچہ تفسیر درمنثور مطبوعہ مصر جلد دوم میں یہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ " ابی داؤد نے قتادہ سے روایت کی ہے۔ان عثمان لمارفع الیہ المصحف قال ان فیہ لحناوستقیمہ العرب بالسنتہا۔ یعنی جب قرآن حضرت عثمان کے سامنے پیش کیا گیا تو عثمان کہنے لگے۔ اس میں غلطیاں ہیں لیکن کچھ مضائقہ نہیں عرب خود اپنی زبان کے مطابق درست کرلیں گے۔" (صفحہ ۲۴۶)۔

قرآن کی آخری تالیف

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قرآن کی آخری تالیف خلیفہ عثمان کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ اس امر کے لئے صرف امام بخاری کی سند موجود ہے۔ لکن قدیم مسیحی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمان کے بعد حجاج بن یوسف نے قرآن کی آخری تالیف کی تھی۔ چنانچہ امام بخاری (تاریخ وفات ۲۵۶ھ) سے چالیس برس پہلے خلیفہ ماموں (از ۱۹۸ھ تا ۲۱۹ھ) کے زمانہ میں مشہور مسیحی عبدالمسیح اور اسحاق نے (جو عرب کے قبیلہ بنی کندہ سے تھا) ایک خط میں ایک مسلمان عالم عبداللہ بن اسماعیل کے مکتوب کے جواب میں لکھا:

" جب حضرت محمد نے وفات پائی تو ابوبکر کو حکمت ملی۔ یہ امر علی بن ابی طالب کی خاطر پر ناگوار گذرا۔ جب وہ خلافت پانے سے ناامید ہوگئے تو چالیس دن کے بعد اور بروایت بعض چھ مہینے کے بعد ابوبکر کے پاس گئے اور ان کی بیعت کی۔ ابوبکر نے کہا۔" اے ابوالحسن اب تک تم کہاں رہے۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ میں کلام الہیٰ کے جمع کرنے میں مصروف رہا، کیونکہ نبی مجھ سے یہ وصیت کر گئے تھے۔ابوبکر نے کہا کہ کچھ ہمارے پاس ہے اور کچھ تیرے پاس ہے پھر بھلا کتاب اللہ کیونکر جمع ہوسکتی ہے؟ پس وہ اس کام پر اکٹھے ہوئے۔ کچھ حافظوں سے لیا، کچھ ٹھیکروں سے اور کھجور کے پتوں سے اور ہڈیوں سے اوراسی طرح کی دوسری چیزوں سے جمع کیا لیکن سب ایک کتاب میں جمع نہ کئے گئے۔ ان کے پاس یہودی کتابوں کی طرح الگ الگ نوشتے ہوگئے۔ پس لوگوں کے درمیان قرات میں اختلاف واقع ہوگیا۔ بعض علی بن ابی طالب کے قرآن کے موافق پڑھنے لگ گئے اور وہ آج تک انہیں کی پیروی کرتے ہیں۔ بعض اس مجموعہ کے مطابق پڑھتے ہیں جس کے جمع کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ بعض ابنِ مسعود کی قرات پر پڑھتے ہیں۔ بعض اُبے بن کعب کی قرات پر پڑھتے ہیں۔ ابن مسعود اور اُبے بن کعب کی قرات پر پڑھتے ہیں۔ ابن مسعود اور اُبے بن کعب کی قرائتیں بہت کچھ ملتی ہیں۔

" جب عثمان بن عفان کا زمانہ آیا لوگوں میں قرات کا اختلاف تھا۔ کوئی شخص ایک آیت کو ایک طرح پڑھتا تھا۔ کوئی اسی آیت کو دوسری طرح پڑھتا تھا۔ ہر شخص اپنی قرات کی حمایت کرتا اور دوسرے کو کہتا تھا کہ میری قرات تیری قرات سے بہتر ہے۔ اس

سے کمی اور بیشی اور تبدیل اور تحریف واقع ہوئی۔ تب عثمان سے کہا گیا کہ لوگ قرات میں اختلاف ڈالتے ہیں اور کمی بیش کی وجہ سے عداوت رکھتے ہیں۔ اور فساد پر آمادہ رہتے ہیں اور ہر شخص اپنی قرات کی طرفداری کرتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ بات بڑھ جائے اور کشت وخون تک نوبت پہنچے اور کتاب اللہ خراب ہوجائے پھر تجھے درست کرنا دشوار ہوگا۔ یہ سن کر عثمان آمادہ ہوئے اور جہاں تک ممکن تھا نوشتوں سے اور پارچوں سے اور دوسری چیزوں سے جمع کیا، لیکن علی بن ابی طالب کے پاس جو قرآن تھا نہ اس سے اور نہ ان لوگوں سے جو اُن کی قرات پر پڑھتے تھے کچھ تعرض کیا اور نہ اپنی تالیف میں ان کو شریک کیا۔ اُبے بن کعب اس نسخہ کے مرتب ہونے سے پہلے مرچکے تھے۔ جب ابن مسعود سے نسخہ طلب کیا تو انہوں نے اس کے دینے سے انکار کردیا۔ عثمان نے زید بن ثابت انصاری اور عبداللہ بن عباس کو اور بعض کہتے ہیں کہ محمد بن ابی بکر کو بھی حکم دیا کہ اسے جمع اور درُست کریں اور جو بات غلط ہو نکال ڈالیں ۔ وہ دونوں نوجوان تھے۔ ان کو یہ ہدایت تھی کہ جب تم کسی بات میں یا لفظ یا نام میں اختلاف کرو تو اسے قریش کے محاورہ پر لکھو کیونکہ وہ بہت سی باتوں میں اختلاف کرتے تھے۔

" جب دونوں قرآن کو مرتب کرچکے تو اس کی چار نقلیں بڑے خط میں کروائی گئیں۔ ایک نقل مکہ کو اور ایک مدینہ کو اور ایک شام کو بھیجی گئی ۔ شام کا نسخہ اب تک ملاطیہ میں موجود ہے۔ مکہ والی نقل آبی سرایا کے زمانہ تک رہی، مگر اسی عہد میں (۲۰۰ھ) جب کعبہ برباد ہوا تو وہ جل گئی ۔ مدینہ والی نقل یزید بن معاویہ کے عہد میں گم ہوگئی ۔ چوتھی نقل عراق کے کوفہ میں بھیجی گئی جو مختار کے زمانہ میں تباہ ہوگئی ۔ تمام حاکموں اور عالموں کے نام پروانے جاری ہوئے کہ تمام قرآن جمع کئے جائیں تاکہ کسی کے پاس کچھ رہ نہ جائے اور جو کوئی دینے سے انکار کرے اسے سخت سزائیں دی جائیں۔ احکام نے اس معاملہ میں ایسی سرگرمی دکھلائی کہ پھر کسی کے پاس بجز چند متفرق اور پراگندہ آیتوں اور سورتوں کے کچھ نہ رہا۔ اب بعض کہتے ہیں کہ سورہ نور سورۃ بقرہ سے بھی بڑی تھی اور سورہ احزاب کم ہوگئی ہے اور سورہ برات اور انفال میں فصل نہ تھا چنانچہ اسی وجہ سے اس پر بسم اللہ نہیں تھی۔ مسود کا قول معوذتین کی نسبت ہے کہ جب تم اسے قرآن میں پاؤ تو جو اس میں نہیں ہے وہ مت بڑھاؤ، عمر نے منبر پر سے کہا تھا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آیت رجم قرآن میں نہیں تھی کیونکہ بالتحقیق ہم پڑھا کرتے تھے کہ " مرد اور عورت جو زنا کریں ان کو سنگسار کرو۔" اگر مجھے لوگوں کے اس قول کا خیال نہ ہوتا ک عمر نے قرآن میں جو نہیں تھا وہ بڑھادیا ہے تو میں خود اپنے ہاتھ سے اس آیت کو بڑھا دیتا۔ ایک اور خطبہ میں عمر نے کہا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آیت متعہ قرآن میں نہیں تھی۔ ہم خود اس آیت کو قرآن میں پڑھا کرتے تھے لیکن وہ اب نکال دی گئی ہے۔ جس شخص نے اس کو نکال ڈالا ہے خدا اس کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس نے حقِ امانت پورا نہیں کیا اور خدا رسول کی نصحیت کو نہیں مانا۔ اُبے بن کعب نے کہا کہ دو سورتیں قنوت اور وتر جو لوگ قرآن میں پڑھتے تھے اور پہلی تالیف میں موجود تھیں وہ اب قرآن میں نہیں ہیں۔

"پھر حجاج بن یوسف[1] کے حکم سے قرآن جمع ہوا۔ اس نے بھی عثمانی قرآن سے بہت سی باتیں نکال دیں اور حکم دیا کہ تمام قرآن جمع کئے جائیں اور ان میں سے وہ سب باتیں نکال ڈالیں جن میں بنی امیہ اور بنی عباس کے لوگوں کے نام تھے۔ جو کچھ حجاج نے چاہا وہ قرآن میں رہنے دیا گیا۔ اے میرے دوست عبداللہ بن اسماعیل ! تو اور تیرے ہم مذہب

---

[1] حجاج بن یوسف خلیفہ عبدالملک بن مروان (از ۶۲ھ تا ۸۶ھ) کے عہدِ سلطنت میں عراق کا گورنر تھا۔ یہ شخص نہایت ظالم اور سفاک تھا۔ اس نے ۷۳ھ میں کعبہ کو منہدم کردیا اور اس کے اگلے سال مدینہ میں حضرت انس وغیرہ جلیل القدر صحابہ جو رہ گئے تھے ان کی گردنوں اور ہاتھوں پر مہر لگوائی ۔ بہت سے صحابہ اور بزرگ اشخاص تابعین کی جن کی فضیلت زبان زد خاص وعام تھی قتل کردیا۔ اصمعی کہتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان اور حجاج بن یوسف نے کبھی بھول بھی نیک کام نہ کیا اور بیہودگی میں کبھی خطا نہ کی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر برادرِ حضرت عائشہ نے جب یہ سنا کہ عبدالملک خلیفہ بنا ہے تو اس نے قرآن کی طرف (جو اس کی بغل میں تھا) مخاطب ہو کر کہا کہ پس اب تیرا زمانہ ہوچکا۔ (تاریخ الخلفا جلال الدین سیوطی)

حجاج کو عموماً لوگ " دشمنِ خدا" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اس نے ۹۵ھ میں وفات پائی۔

ان باتوں کو جانتے ہیں اور ان کا انکار نہیں کرسکتے کیونکہ تمہارے ہی معتبر راویوں نے ان باتوں کو نقل کیا ہے اور درست جانا ہے اور اس بارے میں ان کے درمیان کچھ اختلاف نہیں کیونکہ سب اس پر متفق ہیں۔"

"حجاج بن یوسف نے قرآن کی چھ نقلیں لکھوا کر مرتب کیں جو مصر، شام، مدینہ، کوفہ، مکہ اور بصرہ بھیجی گئیں۔اس نے حکم دیا کہ سب لوگ پہلے نسخوں کو چھوڑ کر اس کے تالیف کردہ قرآن کو اختیار کریں۔ اس امر میں ان پر نہایت سخت زیادتی تشدد اور جبر کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عثمان کی تمام کوششیں بیکار اور اس کی سب کارروائی رائیگاں ہوگئی۔ حجاج نے قرآن میں بہت تصرف کیا اور تو خود تمام باتوں میں حجاج کی روش کو بخوبی جانتا ہے۔ پھر بھلا ایسے شخص پر کتاب اللہ کے معاملہ میں کسی طرح بھروسہ کیا جاسکتا ہے ؟ یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ اس نے قرآن میں تغیر وتبدل نہ کیا ہو؟ وہ تو ایسا شخص تھا کہ بنی اُمیہ کی خاطر جو کچھ اس کے دل میں آتا تھا کر گذرتا تھا۔ ہم نے تیرے سامنے سچی سچی باتیں رکھ دی ہیں۔ہم نے اس بیان میں کوئی بات بڑھا کر نہیں لکھی بلکہ وہی کچھ لکھا ہے جو تمہارے معتبر اور منصف راویوں نے جن کے قول تم خود نقل کرتے ہو صحیح صحیح بیان کیا ہے۔ اگر ہمیں طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم تفصیل وار بیان کرتے لیکن جس قدر ہم نے لکھا ہے وہ دانشمندوں کے واسطے کافی ہے۔"(ملخصاً از عبد المسیح ولد اسحاق کندی صفحہ ۱۱۳ تا ۱۲۳)۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ قرآن کی آخری تالیف حضرت عثمان نے نہیں کی تھی بلکہ سفاک اور ظالم حجاج بن یوسف نے کی تھی۔ حضرت عثمان کو قرآن جمع کرنے کا بیان پہلے پہل امام بخاری نے لکھا، اور مابعد کے مصنفوں نے اس بیان کو صحیح تسلیم کرکے دہرایا دیا ہے۔ لیکن اس قدیم مسیحی مصنف کے مطابق جو امام بخاری سے بھی نصف صدی پہلے ہوچکا ہے قرآن کی آخری تالیف کا سہرا حجاج کے سر پر ہے۔

ابن الاثیر بتلاتاہے کہ حجاج نے ابن مسعود کے قرآن کی تلاوت کی قطعی طور پر ممانعت کردی۔ ابن خلکان کہتاہے کہ حجاج نے قراتوں کے اختلافات کی کثرت کی وجہ سے جو قرآن کے نسخوں میں پیدا ہوگئے تھے حکم دیا کہ ان اختلافات کو ختم کرنے کا تدراک کیا جائے۔ توحیدی ہم کو بتلاتا ہے کہ حجاج بن یوسف کے سامنے علماء کے درمیان قرآن کی ایک آیت (۸: ۱۷) کے صحیح الفاظ ومعانی پر زبردست مباحثہ ہوا اور افسوس ظاہر کرکے کہتا ہے کہ رسولِ خدا کا ایک شاندار قول قرآن میں درج ہونے سے رہ گیا۔ وہ ہم کو یہ بھی بتلاتا ہے کہ حجاج پہلا شخص تھا جس نے قرآن کو پے پائرس پر لکھوایا (اول من کتب فی القراطیس)۔

پس مذکورہ بالا اسلامی علماء بھی قدیم مسیحی عالم عبدالمسیح کے ساتھ اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کا آخری جمع کرنے والا حجاج بن یوسف تھا۔

اصولِ جمع قرآنِ عثمانی

ایک بات ہم ناظرین پر واضح کرناچاہتے ہیں ، کہ حضرت عثمان نے جو کمیٹی اپنے مصحف کے تیار کرنے کے لئے بنائی وہ اس بات کی اہل نہ تھی کہ قرآن کے صحیح متن کو معلوم کرسکے ۔ گو اس کمیٹی کے ممبروں کے پاس چند ایک مختلف مسودات موجود تھے جو مابعد جلادیئے گئے ، لیکن چونکہ ان کے پاس بقولِ مولوی محمد علی صاحب " دریعہ علم ومقابلہ اس قسم کے موجود نہ تھے جیسے ہمارے زمانہ میں ہیں، اس لئے ان سے غلطی کا ہو جانا اور پھر اس کو درست نہ ہوسکنا اور بھی قرین قیاس ہے۔" مثال کے طور پر خلیفہ اول کا زمانہ لے لو۔ جب قرآن جمع کیا گیا تو جب کوئی شخص قرآن کا کوئی حصہ لے کر آتا تو اس سے گواہی اور حلف اور سوگند لی جاتی اس بات کے ثبوت میں کہ وہ دراصل قرآن کی آیت ہے۔ تب اس حصہ کو قرآن کے نسخہ میں جگہ مل جاتی ۔ دیکھئے یہ معیار تھا جو جامعین قرآن نے وضع کیا تھا۔ صرف سوگند اور حلف ہی واحد اور فصیلہ کن امر تھا۔ لیکن انجیل کی صحیح عبارت کسی انسان

کی حلف پر مبنی نہیں ہے خواہ وہ کیسا ہی معتبر ہو۔ انجیل کے ہزاروں نسخے ماہرینِ فن تنقید
کے سامنے رکھے ہیں جن کے پاس حیرت انگیز" ذرایعہ علم ومقابلہ" موجود ہیں اور وہ کاتبوں
کی غلطیوں کودرست کرکے انجیل کی اصلی عبارت کو جیسا اس کے مصنفین نے لکھا تھا
ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

انجیل وقرآن کے متن کی صحت کاموازنہ

پس جب ہم انجیل جلیل کے نسخوں کا مقابلہ قرآن شریف کے نسخوں کے ساتھ
کرتے ہیں توہم پر یہ چند امور واضح ہوجاتے ہیں:

اول۔ جہاں انجیل مقُدس کی کتب کے ہزاروں قدیم نسخے ہمارے پاس اصل زبان
میں موجود ہیں وہاں قرآن مجید کا کوئی نسخہ سوائے مصحفِ "عثمانی" کے نسخے کے ہمیں نہیں
ملتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ہم انجیل کا صحیح متن ان ہزاروں قدیم نسخوں کے مقابلہ اور
تنقید سے معلوم کرسکتے ہیں وہاں ہم قرآن نبوی کے صحیح متن کو معلوم کرنے سے قاصر رہتے
ہیں۔ ہمیشہ یہی خدشہ دامنگیر رہتاہے کہ ممکن ہے کہ عثمانی مصحف کی آیات فی الحقیقت
قرآن نبوی کا جزہوں یا نہ ہوں، اورہم واثق یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی آیات
وہی ہیں جو رسولِ عربی پر نازل ہوئی تھیں اور کہ ان آیات کی ترتیب فی الحقیقت وہی ہے جو
نبی نے مقرر کی تھی۔

دوم۔ انجیل جلیل کی کُتب کا متن تواتر سے ثابت ہے۔ اوائل مسیحی صدیوں کے
نسخے قدیم ترین ترجمے اور مسیحی مصنفین کے کروڑوں اقتباسات اس متن کے تواتر اور تسلسل پر
گواہ ہیں لیکن قرآن نبوی اور مصحف عثمانی میں تواتر اور تسلسل ثابت نہیں، برعکس اس کے
قرائن سے ایسا معلوم ہوتاہے کہ مروجہ قرآن کا معیاری متن خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں مقرر ہوا
کم ازکم اس زمانہ سے پہلے معیاری متن کے لئے تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ
حجاج کے زمانہ کے مدتوں بعد ۳۲۳ھ میں بغداد میں مشہور ومعروف فاضل شنبوز قرآن کو
مصحف عثمان کے خلاف پڑھا کرتا تھا، جس کے لئے اس کو تازیانوں کی سزا دی گئی اور وہ
۳۲۸ھ میں زندان میں ہی مرگیا۔ صاحبِ فہرست اس کے قرآن کی تفاصیل بتلاتا ہے جس
سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصحف میں اور موجودہ قرآن میں اختلاف تھے۔ابنِ قدید
(تاریخ وفات ۳۱۲ھ) کے پاس عقبہ بن عامر کا قرآن تھا جو عثمانی قرآن سے مختلف تھا۔
اسلامی مفسرین بالخصوص زمخشری مختلف قراتوں کا ذکر کرتے ہیں ۔ دیار بکری کتاب تاریخ
الخاس میں ابن مسعود کے نسخہ کی بابت یہاں تک لکھتا ہے کہ" اگرابن مسعود کا قرآن لوگوں
کے ہاتھوں میں رہ جاتا تو اختلافات کی وجہ سے اسلام میں فتنہ برپا ہوجاتا۔"

پس امہات المومنین ۔ صحابہ کرام کے اقوال اور اسلامی تاریخ شاہد ہیں کہ مصحفِ
عثمانی زیادہ سے زیادہ قرآن نبوی کا جزُہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے جس میں فتور واقع ہو گیا ہوا
ہے اور یہ نقص دیگر مصحف کی عدم موجودگی کے باعث دور نہیں ہوسکتا۔

سوم۔ انجیل جلیل کی کُتب ابتداء ہی سے پائدار شے پر لکھی گئیں۔ یہ شے ایسی
پائیدار تھی کہ اب انیس صدیاں گذرنے پر بھی اور حوادثِ زمانہ کے باوجود پہلی چار صدیوں
کے نسخے من وعن ہمارے پاس محفوظ ہیں لیکن سارے قرآن شریف کی اول تو نقل نہ کی گئی
، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا ایک بڑا حصہ تلف ہوگیا اور جب نقل کی گئی تو پائیدار شے پر
نقل نہ ہوئی۔ یعنی بقول کاتب قرآن زید بن ثابت" میں نے جا بجا کھوج کیا قرآن کا اور جمع
کیا اس کو کھجور کے پتوں اور سفید پتھر کی تختیوں کاغذوں کے پرزوں، چمڑے کے پارچوں،
شانے کی ہڈیوں اور کجاوہ کی لکڑیوں اور لوگوں کے سینوں سے" ۔ اب ظاہر ہے کہ ان تمام
اشیاء میں بجز کاغذ کے پرزوں چمڑے کے پارچوں اور پتھر کی تختیوں کے جن پر قرآن نسبتاً کم
لکھا جاسکتا تھا، دوسری کوئی شئے بھی پائدار نہیں ہے اور نہ کوئی جگہ تھی جس میں یہ پائدار
اشیاء بھی بحفاظت تمام رکھی جاتی ہوں۔اور نہ کوئی ثبوت ہے کہ ان کی حفاظت کے لئے

کوئی خاص احتیاط بھی کی گئی تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی کہتے ہیں کہ " سب سے عظیم میراث جو آنحضرت سے اُمتِ مرحومہ کو ملی وہ قرآن عظیم ہے۔ جو آں آنحضرت ﷺ کے آخری وقت بھی صحف میں جمع نہ ہوا تھا بلکہ جس طرح آج کوئی منشی اپنی منشیات کو یا کوئی شاعر اپنے قصائد مقطعات اور اشعار کو بیاض اور کاغذوں میں متفرق لوگوں کے پاس چھوڑ کر اس جہان سے چلاجائے۔ وہ ان چڑیوں کے جھنڈ کی طرح جن کو ہوا کا ذرا سا جھونکا منتشر کردیتا ہے یہ منشیات اور قصائد بھی تلف ہوجائیں اور اگر ان کاغذوں پر پانی پڑجائے یا آگ لگ جائے یا اس کے حافظ فوت ہوجائیں تو حرفِ غلط کی طرح وہ بھی مٹ جاتے ہیں۔" (ازالتہ الخلفا)۔

زمانہ سلف میں قرآن مجید کا کیا حال ہوا ہوگا جب امتِ محمدیہ میں منافقین کے گروہ کی تعداد بے شمار تھی۔ علاوہ ازیں حافظ آخر بشر تھے۔ ان حافظوں کے سینوں سے بھی یاد کردہ آئتیں مٹ سکتی تھیں۔ حافظہ میں بھی گڑ بڑ ہوسکتی تھی، اور اگر حافظ راہِ خدا میں جہاد کرتا ہوا شہید ہوگیا تو وہ حصہ قرآن کا جو صرف اس کو یاد تھا اس کے ساتھ ہی روئے زمین سے مفقود ہوگیا۔ غرضیکہ جہاں انجیل جلیل کی کُتب شروع ہی سے پائدار اشیاء پر تحریر کیں گئیں وہاں قرآن شریف نہایت غیر محفوظ حالت میں رہا اور تحفظِ قرآن کا کوئی محکم آلہ نہ تھا۔

چہارم۔ جہاں انجیل جلیل کی کُتب کے کاتب نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اپنی کُتبِ مقُدسہ کی نقل کیا کرتے تھے۔ وہاں قرآن مجید کے کاتب مومن مسلمان نہیں بلکہ اہلِ یہود ہوتے تھے۔ جب تک کہ حضرت نے زید بن ثابت کو یہود سے لکھنا سیکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ زید سے روایت ہے کہ " مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تو میں نے یہود سے لکھنا سیکھنا کیونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ خدا کی قسم مجھ کو ہرگز اس کا اعتبار نہیں جو یہود میرے واسطے لکھتے ہیں۔" ایک اور کاتب عبداللہ بن ابی سرج کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ " قرآن کو بحکم محمد لکھا کرتا تھا اور جیسا چاہتا تھا بدل کر لکھ دیتا تھا۔" (مغازی الرسول ۔ واقدی)۔

حضرت کے وقت کاتبوں کا یہ حال تھا۔ آپ کی وفات کے بعد قرآن کے قابل ترین حافظوں کی طرف سے اس قدر بے پروائی برتی گئی کہ حضرت کے زمانہ کے بعد ان اشخاص کو جن کو آنحضرت نے مستند قرار دیا تھا کسی نے جمع قرآن کے وقت نہ پوچھا۔ چنانچہ بخاری اور مسلم میں آیا ہے کہ عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ سیکھو قرآن کو چار شخصوں سے یعنی عبداللہ بن مسعود وسالم مولیٰ ابن حذیفہ و ابی بن کعب اور معاذ بن جبل سے " مشارق الانوار ۱۹۱۲ء) عبداللہ بن مسعود سے ایسے زبردست قرآن دان تھے کہ قرآن کی کوئی سورت نہ تھی جس کو وہ نہ جانتے تھے کہ کہاں اُتری، اور کوئی آیت نہیں تھی جس کو وہ نہ جانتے تھے کہ کس باب میں اتری۔ (صحیح مسلم) ابی بن کعب قرآن کے اعلیٰ پایہ کے قاری تھے۔ ان کی اتنی بڑی شان تھی کہ بخاری اور مسلم میں انس سے روایت ہے کہ " حضرت نے ابی بن کعب سے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ میں تیرے آگے لم یکن الذین کفروا کی سورت پڑھوں۔ ابی بن کعب نے کہا کہ یا رسول اللہ کیا خدا نے میرا نام لیا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں" (مشارق الانوار نمبر ۲۵۶) جب حضرت عثمان نے قرآن جمع کیا تو یہ دونوں صحابہ ذیشان زندہ تھے لیکن ان کو قرآن کی جمع ترتیب کی خدمت پر مامور نہ کیا گیا بلکہ حضرت عثمان نے زید بن ثابت کو اس کام پر مامور فرمایا جو نہ مشہور صحابہ میں سے تھا اور نہ حافظ قرآن تھا بلکہ وہ بعد ہجرت مدینہ میں مسلمان ہوا تھا اور بوجہ خوردسال ہونے کے آنحضرت کے ساتھ جنگوں میں شریک ہونے کے قابل خیال نہ کیا جاتا تھا۔ وہ قرآنی آیات والفاظ و ترتیب سے ناواقف تھا۔ زید جیسے شخص کا جمع و ترتیب قرآن پر مقرر کیا جانا حضرت کے مستند اور مسلم الثبوت استاد عبداللہ بن مسعود کو بُرا معلوم ہوا۔ اور اس نے کہا کہ " اے مسلمانو۔ اندھیر ہے کہ مجھ سا شخص تو قرآن لکھنے پر مقرر نہ کیا جائے اور اس پر ایک ایسا شخص مامور ہو کہ بخدا جب میں مسلمان ہوچکا تھا، تو وہ اس وقت ایک کافر کی پشتُ

میں تھا-" یعنی وہ ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا- پس تاریخ شاہد ہے کہ قرآن کو جمع کرنے والے اس بات کے اہل نہ تھے کہ تمام قرآن کو جمع کرسکتے یا درستی سے اس کی نقل کرسکتے۔

پنجم۔ مولوی سید ممتاز علی مرحوم عثمانی مصحف اور موجودہ قرآنوں کا مقابلہ کرکے بتلاتے ہیں کہ ان میں یہ فرق ہے کہ مصحفِ عثمانی کی " ایک آیت سے دوسری آیت جدا نہ تھی- نہ ان کے جدا ہونے کا کوئی نشان مقرر کیا گیا تھا- اس زمانہ میں سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ کے اوپر سورت کا نام اور تعداد آیات وغیرہ نہ لکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے قرآن مجید کا پڑھنا بجز اہل زبان کے دوسروں کے لئے بہت مشکل تھا، بلکہ سب اہل زبان بھی اس کو آسانی سے نہیں پڑھ سکتے تھے- قرآن مجید کو صورتِ موجودہ میں لانے کے بعد میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ کس کس وقت ہوئیں اور کس نے کیں پورے طور پر معلوم نہیں ہوسکتا- قرآن مجید میں رکوع کس نے اور کب مقرر کئے یہ مجھے باوجود بہت تلاش کے معلوم نہیں ہوسکا- ہاں مختلف زمانہ کے قرآن مجیدوں میں رکوعوں میں کسی قدر اختلاف پایا جانا ضرور سنا گیا ہے-" (تہذیبِ نسواں ۳ مئی ۱۹۳۰ء صفحہ ۴۱۶)-

اب ناظرین قیاس کرسکتے ہیں کہ وفاتِ نبوی کے بعد کی صدیوں کے دوران میں قرآن مجید میں عبارت اور رسم الخط کی تبدیلیوں اور غیر عرب اور کم استعداد کا تبین کی وجہ سے کس قدر قرات میں اختلاف پیدا ہوگیا ہوگا۔

باب ہشتم
اصولِ تنقیح وتنقید

اس رسالہ کے ناظرین پر عموماً اور ہمارے مسلمان بھائیوں پر خصوصاً ظاہر ہوگیا ہوگا کہ مسیحی انجیلِ مقُدس کے متن کی صحت کے ثبوت میں ہزاروں قدیم نسخے اور لاکھوں دیگر شواہد پیش کرتے ہیں اور ان نسخوں کو اصولِ تنقیح وتنقید کے مطابق پرکھ کر کھوٹے کو کھرے سے الگ کرکے اور غلط اور صحیح میں تمیز کرکے انجیل جلیل کا صحیح ترین متن ہمارے ہاتھوں میں رکھ دیتے ہیں- یہ اصولِ تنقیح وتنقید کیا ہیں؟ ظاہر ہے کہ نسخوں کے متن کو معلوم کرنے کے بہت سے طریقے ہوسکتے ہیں:

(۱-) سب سے آسان طریقہ متن کو معلوم کرنے کا یہ ہے کہ نقاد اپنے سامنے مختلف نسخے رکھے اور جہاں اختلافِ قرات ہو وہ مختلف نسخوں کا ملاحظہ کرے اور جو قرات اس کو پسند آئے وہ اختیار کرے۔

پس ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صحیح متن کے معلوم کرنے میں مدد نہیں دیتا کیونکہ ممکن ہے کہ جو قرات ایک شخص کو بھلی لگے وہ دوسرے شخص کو مقبولِ نظر نہ ہو اور وہ صحیح قرات بھی نہ ہو- مثل مشہور ہے۔ ع نگاہ اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

(۲-) یہ معیار معیوب تھے پس مسیحی علماء نے ان اصولوں کو اختیار نہ کیا بلکہ نسخوں کی تاریخ کے ہر دور میں ان کو ہمیشہ مردود ومطعون گرادنتے رہے۔ اس کے برعکس مسیحی محققین نے مختلف ممالک اور ازمنہ کے نسخہ جات اور ان کے تراجم اور اقتباسات وغیرہ کروڑوں شواہد کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور علم تنقید کو درجہ کمال تک پہنچادیا۔ انہوں نے اس علم کے اصوُل وضع کئے، جن کی روشنی میں انہوں نے نہایت باریک نگاہ سے ہر نسخہ کا مطالعہ کیا-

چونکہ اس رسالہ میں ہم کو اختصار مدِ نظر ہے لہذا ہم ان جامع اصول کا مفصل بیان نہیں کرسکتے لیکن یہ بیان کرنا کافی ہے کہ مسیحی علماء نے انجیل جلیل کے ہزاروں نسخوں کا جواب تک دستیاب ہوئے ہیں نہایت باریکی اور عرقریزی سے مطالعہ کیا ہے اور ہر ایک نسخہ کے ایک ایک لفظ اور حرف کو پیش نظر رکھ کر مختلف قراتوں کو قلمبند کیا ہے۔ ان ہزاروں یونانی نسخوں کا مقابلہ کرکے ان کو ان کے متنوں کی قراتوں کی مشابہت کی بنا پر مختلف گروہوں اور قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً اس اصول کے مطابق اگران کو چند نسخوں میں ایک ہی لفظ کے ہجا کی غلطی نظر آئی تو وہ ایک گروہ میں شامل کئے گئے ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ نسخے ایک دوسرے کی نقل ہونگے ۔ پھر ایک ہی گروہ کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کیا تا کہ معلوم ہو کہ کونسا نسخہ کس نسخہ کی نقل ہے اور اس گروہ کا قدیم ترین نسخہ یا جد امجد کون سا نسخہ ہے ، جس سے باقی نسخے نقل کئے گئے ۔ ظاہر ہے کہ مختلف گروہوں کے قدیم ترین نسخوں میں سب سے کم کتابت کی غلطیاں واقع ہوئی ہوں گی لہذا ان کا متن اس گروہ کے نسخوں میں سب سے زیادہ صحیح ہوگا۔

اسی طرح مختلف گروہوں کے قدیم ترین نسخوں کا باہم دگر مقابلہ کرکے مسیحی علماء نے ان کو ان کی قدامت اور اعتبار کے لحاظ سے تقسیم کیا اور مختلف قراتوں میں سے اس قرات کو اختیار کیا جس کی سند سب سے زیادہ قدیم اور معتبر ہے اور جس کی تصدیق اور تائید قدیم ترین ترجموں، اور ابتدائی صدیوں کی مسیحی تصنیفات سے ہوتی ہے۔

یوں ان ماہرین فنِ تنقید نے انجیلِ جلیل کے نسخوں کا مقابلہ کرکے اس اصل متن کو معلوم کیا جو اس کے الہامی مصنفین کے مبارک ہاتھوں نے لکھا تھا۔

(۲)

چونکہ ہمیں اختصار منظور ہے ہم اس طریقہ کار کی ایک مثال دیتے ہیں۔ فنِ تنقید کے ماہرین بشپ وسٹکٹ اور ڈاکٹر ہورٹ[1] (جن کا نام چار دانگ عالم، میں مشہور ہے اور جو اس فن کے مسلم الثبوت اور بے نظیر استاد ہوگذرے ہیں) ان ہزاروں نسخوں کو چار اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

اول۔ وہ تمام نسخے جن کا متن انگریزی "آتھورائزڈورشن" یعنی پرانے ترجمہ کے مطابق ہے۔ اس قسم میں ہزاروں نسخوں کی ایک بڑی اکثریت شامل ہے ، کیونکہ یہ وہ متن ہے جو چھٹی صدی مسیحی سے مروج ہے اور مقبولِ عام ہے لیکن متن مقدس کرسسٹم[2] سے پہلے (۴۰۰ء) ابتدائی مسیحی صدیوں کے مصنفین کی تصانیف میں نہیں ملتا۔ لہذا یہ متن قدیم نہیں ہے۔ اس متن کو ہم الف متن[3] کے نام سے موسوم کریں گے۔ اس متن کو ابتداء انطاکیہ کے قرب وجوار میں چوتھی صدی کے آخر میں ہوئی جب مقدس کرسسٹم وہاں تھا۔ چونکہ یہ متن قدیم نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اگر کوئی قرات صرف اس قسم کے نسخوں میں ہوگی تو وہ غالباً قدیم اور معتبر نہیں ہوگی۔

دوم۔ دوسری قسم میں وہ تمام نسخے شامل ہیں جس میں وہ متن محفوظ ہے جو نسخہ سینا میں پایا جاتا ہے ۔ اس قسم کو ہم ب متن[4] کے نام سے موسوم کریں گے ۔ یہی متن نسخہ ویٹی کن میں پایا جاتا ہے ، جو قدیم ترین اور معتبر ترین نسخہ ہے ، اور نسخہ سینا سے زیادہ قدیم ہے۔ نسخہ سینا کا متن گو قریب قریب وہی ہے جو نسخہ ویٹی کن کا ہے تاہم اس کا اختلاف

---

[1] Westcott and Hort

[2] Chrysostom

[3] Alpha Type

[4] B.Type

قرات اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ جس نسخہ سے یہ دونوں نقل کئے گئے ہیں اس میں اور ان دونوں نسخوں کے درمیان کئی نسخوں کی پشتیں حائل ہیں اور کہ وہ نسخہ جس سے یہ دونوں نقل کئے گئے ہیں، عہد جدید کے مختلف مصنفین کے اصل نسخوں (گلتیوں ٦ : ١١) کی پہلی نقل تھا۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ صحیح ترین اور معتبر ترین تھا، کیونکہ وہ ان طوماروں کی پہلی نقل تھا۔ جو انجیل شریف کے مصنفوں کے مقُدس ہاتھوں نے لکھے تھے۔ پس چونکہ نسخہ ویٹی کن اور نسخہ سینا دونوں ان طوماروں کی پہلی نقل کی نقلیں ہیں، لہذا یہ نہایت صحیح اور نہایت معتبر اور ان سے زیادہ اور صحیح نسخے ملنے کی امید نہیں ہوسکتی، پس ب متن سے زیادہ صحیح متن اس وقت روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔

قدیم ، قبطی ترجمہ بجیری کے نسخوں میں یہی متن پایا جاتاہے اور صحیدی ترجمہ میں کہیں کہیں یہ متن ملتا ہے۔ مقُدس جیروم نے اپنے لاطینی ترجمہ ولگیٹ کے تیار کرنے میں استعمال کیا ہے۔ اس متن کو نہ صرف جیروم نے اختیار کیا ہے، بلکہ اوریجن جیسا مسلم الثبوت استاد بھی اسی متن کے نسخے استعمال کرتا ہے۔ سکندریہ کا کلیمنٹ بھی بعض اوقات اس متن کی قرات کو دیگر قراتوں پر ترجیح دیتا ہے۔

پس اگر کوئی قرات ایسی ہو جو الف متن میں پائی جائے لیکن ب متن سے مختلف ہو تو چونکہ ب متن پہلے کی نسبت زیادہ صحیح اور زیادہ قدیم ہے ہم ب متن کی قرات کو ترجیح دیں گے ۔ بلکہ ڈاکٹر ہورٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کوئی قرات نسخہ ویٹی کن سے اختلاف رکھتی ہو تو گو اس کی حمایت میں بہت سے نسخے ہوں تاہم نسخہ ویٹی کن کی قرات کو ترجیح دی جائے گی اور اگر نسخہ ویٹی کن اور نسخہ سینا دونوں کسی قرات پر متفق ہوں تو ان دونوں کی متفقہ شہادت ایسی زبردست ہے کہ کوئی دوسرا نسخہ اس کو توڑ نہیں سکتا ۔ ڈاکٹر وائس[1] جو بعض امور میں ڈاکٹر ہورٹ کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا اس امر کو تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نسخہ ویٹی کن ہی عہدِ جدید کا ایک ایسا نسخہ ہے جس میں صحیح ترین اور اصلی متن محفوظ ہے۔

سوم۔ ان ہزاروں نسخوں میں سے بعض نسخے ایسے بھی ہیں جو۔ بالعموم ب متن سے متفق ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ب متن سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ اس گروہ کے نسخوں کے متن کو ہم ج متن کے نام[2] سے موسوم کریں گے۔ اس متن کی ابتداء اسکندریہ سے ہوئی۔ ب متن اور اس متن کے اختلاف کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اسکندریہ علم وفضل کا گھوارہ تھا اور اس جگہ کے مسیحی علم وفضل میں یگانہ روزگار تھے۔ لہذا ب متن کو اپنے نسخوں میں نقل کرتے وقت انہوں نے اصلی یونانی متن (جو زبان کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ کا نہیں ہے)میں سے خاصیوں کو ہٹا کر زبان کو زیادہ صحیح کردیا لہذا اصل یونانی متن کے معلوم کرنے میں (جس میں وہ خامیاں موجود تھیں) یہ متن بہت مدد نہیں دیتا۔

چہارم۔ نسخوں کی آخری قسم کے متن کو ہم "د" متن[3] کے نام سے موسوم کریں گے۔ اس متن کے نسخے بھی نہایت قدیم ہیں۔ ان نسخوں کے متن میں اور دیگر تمام متنوں کے نسخوں میں یہ تمیز ہے کہ ان نسخوں میں چند آیات زیادہ ہیں گو چند آیات ایسی بھی ہیں جو دیگر اقسام کے نسخوں میں پائی جاتی ہیں اور ان نسخوں میں نہیں ملتیں۔ ان نسخوں میں آپس میں بھی بہت اختلاف ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی ایک نسخہ کی نقل نہیں ہیں بلکہ مختلف نسخوں کی نقلیں ہیں لیکن چونکہ اس قسم کے نسخے چند الفاظ وآیات کی موجودگی یا عدم موجودگی پر متفق ہیں لہذا ان کو الگ کرکے ان کے متن کا نام " د" متن رکھ دیا گیا ہے۔

اس متن کے نسخے نہایت قدیم ہیں اوریہی متن دوسری صدی کے قدیم سریانی تراجم اور قدیم لاطینی ترجمہ میں پایا جاتا ہے ۔ قبطی ترجمہ صحیدی میں بھی یہی متن ملتاہے۔ نسخہ

[1] Wies.

[2] Y.Type.

[3] Y.Type.

بیزا میں بھی یہی متن محفوظ ہے۔ مختلف ممالک کے قدیم ابتدائی مسیحی مصنفین کی تصنیفات میں بھی یہی متن ہم کوملتا ہے ۔ مثلاً دوسری صدی میں جسٹن شہید ، ٹیشین ، ماشین، اور آئرینوس اور دوسری صدی کے آخر میں سکندریہ کا کلیمنٹ اور ٹرٹولین اور تیسری صدی کے شروع میں سپرین اور چوتھی صدی میں شامی مصنفین مثلاً افرے تیس[1] اور افرائیم وغیرہ اس متن کا استعمال کرتے ہیں۔

اب اگر الف متن کو غیر مستند سمجھ کر چھوڑ دیا جائے تو محقق کے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ کیا ب متن صحیح ترین متن ہے یا د متن زیادہ معتبر ہے۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ ب متن نہایت قدیم متن ہے، کیونکہ یہ اس نسخہ کی نقل ہے جو خود انجیل شریف کے مصنفین کے طوماروں سے نقل کیا گیا تھا۔ د متن کی قدامت بھی ظاہر ہے اور مختلف ممالک کے قدیم تراجم اور قدیم مسیحی مصنفین کی کُتب اس کی قدامت کے شاہد ہیں۔

لیکن جیسا ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں د متن کے نسخے سوائے ان چند آیات کی موجودگی کے کسی اور بات میں اتفاق نہیں کرتے ۔ لہذا صحیح معنوں میں یہ ہرگز متواتر اور مسلسل متن نہیں ہے۔ اوریجن جیسے مسلم الثبوت استاد اور نقاد نے دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے شروع میں د متن کو مستند تسلیم نہ کیا۔ اورب متن کو ہی اختیار کیا۔ب متن کے نسخے نہایت معتبر ثابت ہوئے ہیں۔ اس متن کی اندرونی صحت اور بیرونی تاریخ اور قدیم مسلم الثبوت اساتذہ کا اس کو مستند اور صحیح قرار دینا اس امر پر دال ہے کہ یہ اپنے حریف د متن سے زیادہ معتبر اور زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ جیسا ہم بتلاچکے ہیں کہ، د متن کے نسخوں میں آپس میں اختلاف ہے اور اگر اتفاق ہے تو صرف چند الفاظ اور آیات کی موجودگی اور عدم موجودگی پر ہی اتفاق ہے باقی امور میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

پس مذکورہ بالا دونوں محققین تمام شہادتوں کو مد نظر رکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ الف متن اور ج متن کے نسخے صحیح الفاظ اور معتبر ترین متن کو معلوم کرنے میں بہت مدد نہیں دے سکتے ، کیونکہ ان نسخوں میں کاتبوں کی غلطیاں موجود ہیں۔ د متن گو ان دونوں سے زیادہ قدیم ہے تاہم وہ ب متن کے پایہ کو نہیں پہنچتا ۔ کیونکہ ب متن کے نسخے صحیح ترین معتبر ترین اور قدیم ترین ہیں۔ اور یہ نسخے اس نسخہ کی نقل ہیں جو خود انجیل نویسوں کے طوماروں سے نقل کیا گیا تھا۔

اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ جتنی آیات عہدِجدید کے پرُانے ایڈیشن میں سے خارج کی گئی ہیں (جن کا ذکر حصہ دوم کے باب اول میں کیا گیا ہے) وہ د متن کا حصہ ہیں اور ب متن میں نہیں پائی جاتیں۔ چونکہ ب متن صحیح ترین ہے پس ظاہر ہے کہ یہ آیات اور دیگر الفاظ (جن کو خارج کیا گیا ہے) بعد کے کاتبوں کی غلطیوں کی وجہ سے ایزاد ہوگئے تھے اور انجیل جلیل کی اصلی عبارت کا حصہ نہیں تھے ۔ کیونکہ ب متن صحیح ترین متن ہے اور ان طوماروں سے نقل کیا گیا ہے ۔ جو انجیل جلیل کے الہامی مصنفین کے مبارک ہاتھوں نے لکھے تھے۔

---

[1] Aphraates, Ephraem.

باب نہم
کتابِ مقدس کی اردو تراجم

انجیل جلیل کا سب سے پہلا اردو ترجمہ ڈنمارک کے پادری شلٹز(Schultze) نے ۱۷۳۹ء میں شروع کیا، اور ۱۷۴۱ء میں ختم کیا۔ پادری مرحوم نے کتاب پیدائش کے چند ابواب، زبور کی اور دانی ایل کی کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ لیکن چونکہ مرحوم جنوبی ہند میں رہتے تھے اور اردو زیادہ تر شمالی ہند میں مروج تھی لہذا اس ترجمہ کی اردو نہایت معمولی قسم کی تھی ۔ ۱۸۰۴ء میں پادری ولیم ہنٹر (William Hunter) نے چند ہندوستانی اصحاب کی مدد سے اناجیل کا ترجمہ کیا۔

پادری ہنری مارٹن[1] کا نام اردو ترجمہ کے سلسلہ میں تا ابد زندہ رہے گا۔ وہ ۱۸۰۶ء میں ہندوستان آیا۔ آتے ہی اس نے ۱۸۰۷ء میں انجیل جلیل کا ترجمہ مرزا فطرت کی مدد سے شروع کیا اور مارچ ۱۸۰۸ء میں اختتام کو پہنچایا۔ یہ ترجمہ بہت اچھے پایہ کا ہے۔ اس کی ایک جلد راقم الحروف کے پاس ۱۸۲۹ء کی ہے۔ اس اردو ترجمہ کی دیوناگری رسم الخط میں ۱۸۱۷ء میں چھاپا گیا اور اس پر پادری بولی، Bowely نے انجیل کے ہندی ترجمہ کی بنیاد رکھی۔

۱۸۴۱ء میں بنارس کی کمیٹی نے عہد جدید کی کتب کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ پادری ہنری مارٹن مرحوم کے ترجمہ پر مبنی تھا۔ اس کمیٹی کا صدر ڈاکٹر میتھر[2] اور اس میں مرزا پور کے دو ہندوستانی مسیحی بھی شریک تھے۔ ان میں سے ایک ہری بابو تھے، جو برہمنوں میں

[1] Henry Martyn.

[2] Mather.

سے عیسائی ہوئے تھے اور دوسرے جان مسیح تھے جو ایک مسیحی شاعر تھے۔ ڈاکٹر فینڈر بھی گاہے گاہے اس کمیٹی کی مدد کرتے تھے۔

۱۸۴۴ء میں عہدِ عتیق کی تمام کی کُتب کا اردو میں ترجمہ ہو گیا۔ ڈاکٹر میتھر نے عہدِ جدید کے ۱۸۴۱ء کے ترجمہ کی نظر ثانی کرکے دونوں عہد ناموں کو شائع کرایا۔ اس ترجمہ کا نام ہم سہولت کی خاطر بنارس کا ترجمہ رکھیں گے ۔ جناب رام بابو صاحب سکسینہ اپنی کتاب " تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں کہ "پوری بائبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے ۱۸۱۶ء لغایت ۱۸۹۱ء میں پانچ جلدوں میں شائع کیا۔"(حصہ دوم صفحہ ۲۰)۔

۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۰ء تک ڈاکٹر میتھر بنارس کے ترجمہ کی نظر ثانی کرتا رہا۔ نظر ثانی کے بعد ایک نئی ایڈیشن رومن اور عربی رسم الخط میں ۱۸۷۰ء میں مرزا پور سے شائع کی گئی اور مدت تک اردو خوان پبلک اس کو استعمال کرتی رہی ۔ سہولت کی خاطر ہم اس کا نام مرزا پورا کا ترجمہ رکھیں گے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں پرانا انگریزی ترجمہ "آتھورائزڈورشن ۱۶۱۱ء میں کیا گیا تھا، ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں کہ اس وقت انگریز مترجمین کے پیش نظر قدیم ترین نسخے نہ تھے۔ ان تمام نسخوں کا متن بھی الف متن تھا۔ پس ظاہر ہے کہ یہ انگریزی ترجمہ بہترین متن پر مبنی نہ تھا۔ بنارس اور مرزا پور کے اردو ترجمے اسی انگریزی ترجمہ کے الفاظ کے تراجم تھے۔ یونانی کے ہزاروں نسخے جو اب ہمارے پاس موجود ہیں بنارس اور مرزا پور کے ترجموں کے شائع ہونے کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔ پس یہ ضرورت لاحق ہوئی کہ ایک نیا ترجمہ اردو میں کیا جائے جو صحیح ترین متن پر مبنی ہو۔

بنارس اور مرزا پور کے ترجموں میں ایک اور نقص بھی تھا۔ ان کی زبان ناقص تھی کیونکہ وہ شمالی ہند کے جنوب مشرقی علاقہ کی اردو تھی ، لیکن دہلی اور لکھنو کی زبان ٹکسالی زبان خیال کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اردو نثر کے ۱۸۷۰ء کے بعد حیرت انگیز ترقی کی

ہے۔ پس زبان کے لحاظ سے یہ بھی ضرورت لاحق ہوئی کہ ایک نیا ترجمہ کیا جائے جس کی اردو اعلیٰ قسم کی ہو۔

بائبل سوسائٹی نے اس غرض کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جو ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۹ء تک کُتُبِ عہد جدید کی نظر ثانی کرتی رہی۔ یہ کمیٹی پادری ایچ۔ ای۔ پرکنس[1]، پادری۔ ایچ۔ یو۔ وائٹ بریجنٹ سٹینٹن۔ لالہ چند دلعل، پادری آر۔ ہاسکنس، پادری سی بی نیوٹن، پادری ٹی جے سکاٹ، پادری تارا چند، پادری جے۔ جی ڈین، ڈاکٹر جے۔ سی آر یوئنگ، پادری ڈبلیو ہوپر، پادری سی اے جنویر، پادری ڈبلیو۔ مانسل، اور ڈاکٹر ایف۔ جے، نیوٹن پر مشتمل تھی۔ یہ نیا اردو ترجمہ ۱۸۸۱ء کے انگریزی ترجمہ پر جس کو ریوائزڈورشن کہتے ہیں مبنی تھا۔ اس انگریزی ریوائزڈ ترجمہ کی کمیٹی کے ممتاز ترین رکن بشپ وسٹکٹ (Westcott) اور ڈاکٹر ہورٹ (Hort) تھے جن کا ذکر ہم گذشتہ باب میں کرچکے ہیں۔ یہ ترجمہ نسخہ ویٹی کن اور نسخہ سینا کے متنوں پر مبنی ہے۔ انگریزی کمیٹی کے ارکان ان ہزاروں نسخوں کی مختلف قراتوں سے بخوبی واقف تھے اورانھوں ب متن کو اختیار کرکے انگریزی خوانوں کے سامنے ایک ایسا ترجمہ رکھ دیا جو صحیح ترین متن پر مشتمل تھا۔ اس ترجمہ میں سے وہ تمام آیات والفاظ خارج کردیئے گئے ہیں جو صحیح ترین اور قدیم ترین نسخوں میں نہیں تھے۔

۱۹۰۰ء کا نیا اردو ترجمہ اسی صحیح اور معتبر ریوائزڈ انگریزی ترجمہ پر مبنی ہے۔ بنارس اور مرزا پور کے ترجموں کے وقت قدیم اور معتبر اور صحیح نسخے مترجمین کے سامنے نہیں تھے۔ کیونکہ وہ اس کے بعد دستیاب ہوئے ہیں اور نہ وہ مترجمین ایسے محقق تھے کہ مختلف متنوں کی صحت کو اصولِ تنقید کے مطابق جانچ سکتے۔ علاوہ ازیں اردو ان مترجمین کی مادری زبان نہ تھی۔ وہ مبلغین تھے جنھوں نے مسیحی پیغام کو اردو لباس پہنایا۔ اب جو نیا کُتُبِ

[1] H.E Perkins, H.U.W.Stanton, R. Hoskins. C.B. Newton, T. J. Scott. J.G. Dann, Ewing, Hopper, Janver, Mansell.

عہد جدید کا ترجمہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہ ب متن پر مبنی ہے جو صحیح ترین متن ہے کیونکہ اس متن کے نسخے ان نسخوں کی نقل تھے جو کُتُبِ عہد جدید کے مصنفین کے مقُدس ہاتھوں نے لکھے تھے۔ پس ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انجیل کا جو اردو ترجمہ اب ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ اس صحیح اور معتبر ترین متن کا ترجمہ ہے جو انجیل کے مصنفین نے لکھی تھی۔ جہاں تک انسانی عقل کام کرسکتی ہے اس سے زیادہ معتبر اور زیادہ صحیح عبارت روئے زمین پر موجود نہیں۔

۱۹۳۰ء میں عہدِ عتیق کی کُتُبِ مقُدسہ کا نیا اردو ترجمہ شائع ہوگیا۔ یہ ترجمہ مرزا پور کے اردو ترجمہ کی تصحیح ہے۔ مترجمین کمیٹی کے صدر پادری جوئیل واعظ لال صاحب دہلوی تھے۔ لیکن آپ امثال ۱۰: ۲۸ تک ہی ترجمہ کرسکے۔ جب آپ اس آیت کے الفاظ " صادقوں کی امید خوشی لائے گی۔" لکھ چکے توآپ کے دل کی حرکت اچانک بند ہوگئی اورآپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ آپ کے وفات کے بعد پروفیسر محمد اسماعیل صاحب صدر مترجم ہوئے۔ یہ کمیٹی مختلف اوقات میں پادری ولیم میچن[2]، بشپ سی ڈی راکی، ڈاکٹر عنایت اللہ ناصر۔ پادری دینا ناتھ گوڑ دہلوی، اورراقم الحروف پر مشتمل تھی۔ ان مترجمین کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک انسانی طاقت سے ہوسکتا ہے اردو ترجمہ زبان اور متن کے لحاظ سے صحیح اور معتبر ہو۔ اوراب اردو خوان پبلک کے ہاتھوں میں کُتُبِ مقُدسہ کا صحیح ترین متن خدا کے فضل وکرم سے موجود ہے۔ اس نعمت کے لئے اس کی حمد وتمجید ابد الاباد ہوتی رہے۔ آمین۔

[2] W.Machin. Bishop Rockey

ضمیمہ

(رئیس المناظرین مسٹر اکبر مسیح صاحب مرحوم کے مضامین کا مجموعہ)

صحتِ کُتبِ مقُدسہ ازروئے قرآن

فصل اوّل ۔ قرآن اور الکتاب

مسئلہ تحریف کی ابتدا

نہایت چلتی ہوئی دلیل عیسائی پادریوں کے پاس یہ تھی کہ قرآن اپنی صداقت پر توریت اور انجیل وغیرہ کُتبِ مقُدسہ کو گواہ لاتا ہے اور اپنے آپ کو ان کا مصدق ٹھہراتا ہے۔

مسلمانوں نے نفس الامر کودیکھا نہیں یا عیسائیوں کی کتابیں پڑھی نہیں یا پڑھیں تو سمجھی نہیں۔اس مشکل سے نکلنے کی انہیں بس یہی راہ سجھائی دی کہ عیسائیوں نے قرآن کی عداوت میں اپنی کتابیں بدل کر بگاڑ ڈالیں۔ پس یہ وہ کتابیں ہی نہیں جن کی تصدیق قرآن شریف نے کی تھی۔

یہاں سے صاف عیاں ہے کہ مسئلہ تحریف جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان اتنے زمانہ سے نزاعی ہے ۔ اس کی پیدائش جاہلوں کے مکابرہ میں ہوئی ۔ورنہ اس کا وجود نہ کُتبِ مقُدسہ میں ہے نہ قرآن شریف میں بلکہ یہ محض ایک بے سروپا افترا ہے جو نہ صرف حقیقت الامر کے خلاف ہے جیسا ناظرین پر ظاہر ہوجائے گا بلکہ معمولی فہم وفراست کے بھی، اور قرانی نصوص کے قوعینِ ضد میں ہے۔

الکتاب کی اصطلاح

قرآن شریف نے یہودیوں اور عیسائیوں کو اہل الکتاب کا نام دیا یعنی کتاب والے۔ نہ اس لئے کہ ان سے پہلے اور پیچھے دنیا میں کسی قسم قوم کے پاس کتابیں نہیں رہیں بلکہ اس لئے کہ عیسائیوں کے پاس مقُدس کتابوں کا ایک ایسا نادر مجموعہ تھا جس کو تخصیص کے ساتھ الکتاب کہا گیا۔

واضح ہو کہ قرآن شریف نے جس کو عربی اصطلاح میں الکتاب کہا ہے اسی کو عیسائی اپنی مذہبی زبان یونانی میں اصطلاحاً بائبل کہتے ہیں۔ ہر دو لفظ ہم معنی ہیں۔ مسلمانوں کے کان اس عیسائی اصطلاح سے بالعموم ناآشنا تھے، اس لئے ان کو یہ سمجھنے میں دقت رہی، کہ الکتاب اور بائبل اور اہل کتاب اور بائبل والے بالکل ایک ہی بات ہے ۔ مولوی رحمت اللہ صاحب مرحوم کو بھی جنہوں نے ایک عمر بائبل شریف کو محرف ثابت کرنے میں کاٹی آخر ایک جگہ ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ اس حقیقت پر سے پردہ اٹھائیں۔ چنانچہ آپ نے اپنی آخری مشہور کتاب اظہار الحق میں فرمایا ہے اور بہت سچ فرمایا۔" اہلِ کتاب نے اپنی کتابوں کو دو قسموں پر منقسم کیا ہے۔ ایک وہ جن کی نسبت دعوےٰ ہے کہ وہ بواسطہ انبیاء ان کو قبل عیسیٰ علیہ السلام کے پہنچیں ۔ دوسری وہ جو جن کی نسبت دعویٰ ہے کہ الہام کے بعد سے عیسیٰ علیہ السلام کے لکھی گئیں ۔ پہلی قسم کی کتابوں کے مجموعہ کو عہدِ عتیق کہتے ہیں۔ دوسری قسم کے مجموعہ کو عہدِ جدید اور پھر دونوں عہدوں کے مجموعہ کو بائبل کہتے ہیں۔ یہ لفظ یونانی ہے بمعنی" الکتاب"(ترجمہ صفحہ ۳۸) تمام جہان کی کتابوں میں یہ کتاب ایسی عزت والی اور واجب التعظیم مان لی گئی کہ یہ نام خصوصیت کے ساتھ اس کا پڑ گیا اور صرف اسی کے ماننے والے صاحبِ کتاب کہلائے۔

قرآن ، عربی بائبل

قرآن شریف کو ہم بلامبالغہ اور واقعی عربی بائبل کہہ سکتے ہیں ، بلکہ حق زیادہ یہ ہوگا کہ خود قرآن شریف نے اپنے آپ یہی مانا اور منوایا ہے ۔ لیکن بعض لوگ جو اصولی انحار پر پردہ ڈال کر ہمیشہ فردعی تضاد کا جھنڈا بلند کرکے میدانِ کارزار گرم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس حقیقت کو گویا بالکل بھلا چکے ۔ لہذا انہیں یاد دلانا پڑا کہ قرآن شریف میں ایک آیت اس طرح وارد ہوتی ہے ۔ وَهَـــذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُواْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ أَن تَقُولُواْ إِنَّمَا أُنزِلَ الْكِتَابُ عَلَى طَآئِفَتَيْنِ مِن قَبْلِنَا وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَأَوْ تَقُولُواْ لَوْ أَنَّا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدَى مِنْهُمْ فَقَدْ جَاءكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ (انعام ۱۵۵)" یہ کتاب (قرآن) جو ہم نے اتاری برکت والی اس کی پیروی کرو، اور ڈرتے رہو۔ شاید تم پر رحم کیا جائے کہ تم کبھی یہ نہ کہو کہ بائبل(الکتاب) تو صرف دو ہی قوموں (یہود و نصاریٰ) پر اتاری گئی تھی۔ مگر ہم تو اس کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے۔ یا کہو کہ اگر بائبل (الکتاب) ہمارے اوپر اتاری جاتی تو بلاشک ہم ان لوگوں سے زیادہ راہِ راست پر چلنے والے بنتے ۔ پس تمہارے پاس بھی تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیل اور ہدایت اور رحمت آگئی ۔" اس کا ماحصل یہ ہے کہ ، اہلِ عرب انبیاء کے دین پر نہ چلنے کا یہ عذر کرتے تھے کہ بائبل خدا کی کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے نازل ہوئی اور وہ عبرانی اور یونانی غیر زبانوں میں ہے، جن کو ہم پڑھ سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ پس انبیاء کا دین ان کو مبارک ہے۔ اگر وہ ہمارے واسطے ہوتا تو بائبل (الکتاب) ہم پر عربی میں نازل ہوتی اور اگر ایسا ہوتا تو ہم یہودیوں اور عیسائیوں سے بدرجہا راستباز اور دیندار نکلتے ۔ قرآن نے رفع حجت کی خاطر ان کی بات مان کر ان کا عذر مٹایا اور فرمایا کہ تم بائبل کو نہیں سمجھ سکتے تھے، اسی لئے خدا نے تم پر بھی مثل یہود و نصاریٰ کے ایک کتاب تمہاری اپنی زبان میں اتاری ۔ یہی عربی قرآن تمہاری عربی بائبل ہے جو تم سے مخصوص ہے۔ اس میں بھی وہی ہدایت و نور ہے۔ تم اس کی پیروی کرو، جس طرح وہ اپنی بائبل کی کرتے ہیں۔

اب یہ سوچنا چاہیے کہ قرآن شریف یہ نہیں کہتا کہ یہود و نصاریٰ کی کتابیں بگڑ گئیں یا محرف ومبدل ہو گئیں یا قابلِ تمسک نہیں رہیں۔ اس لئے ایک نئی کتاب لوگوں پر نازل کرنا پڑی بلکہ بخلاف اس کے اپنے وجوہ کی علت غائی یہ بیان کرتا ہے کہ ان کتابوں سے اہلِ عرب اپنی جہالت کی وجہ سے غافل رہے اس لئے ان کی زبان میں ایک کتاب نازل ہوئی جو انہی پرانی کتابوں کے مضامین پر شامل ہے یعنی کُتبِ مقدسہ میں کوئی کجی یا کمی واقع نہیں ہوئی تھی جس کا رفع کرنا ضروری تھا، بلکہ کجی اور کمی قومِ عرب میں تھی جو بجز اس کے دور نہ ہوسکتی تھی کہ ان کو اپنی زبان میں بھی ایک ویسی ہی کتاب نازل کی جائے ۔ پس قرآن الہام کی نوعیت سے ذلک الکتب لاریب فیہ کا خلاصہ ٹھہرا اور اس سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اگر عرب بائبل مقدس کو سمجھ بوجھ سکتے یا ان کا جہل اور طرح رفع ہوسکتا تو قرآن شریف کے آنے کی مطلق حاجت وضرورت نہ ہوتی۔

یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کفار عرب کا یہ بہانہ کہ ہم بائبل کو نہیں سمجھ سکتے واقعی تھا یا نہیں۔ لیکن جب قرآن نے اس کو باطل کردیا اور ان کو عذر باقی نہ رہا۔ انہوں نے کھل کے بے ایمانی اختیار کی اور علانیہ قابل نفرین بات کہی۔ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن نُّؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ کہنے لگے کافر لوگ ہم ہر گز ایمان نہ لائیں گے ، اس قرآن پر اور نہ اس پر جو اس کے آگے (یعنی الکتاب بائبل پر) (سبا ۳۱)۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ قرآن شریف کو صرف عربی بائبل ہونے کا دعویٰ تھا اور اسی حیثیت سے وہ کفارِ عرب کے سامنے آیا اور اسی حیثیت سے یہود و نصاریٰ کے حتیٰ کہ اس نے اپنا نام ہی رکھ لیا۔ " یہ کتاب ہے مصدق کتب سابقہ کی زبان عربی میں (احقاف ع ۱)۔

اور مسلمانوں کی تعریف یہ بتلائی تومنون بالکتب کلہ(آل عمران ع ۱۲) جو ایمان لاتے ہیں ساری کی ساری الکتاب (بائبل) پر۔ اس لئے قرآن نے یہودیوں سے استدعا کی کہ تم بھی قرآن کو مان لو۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُواْ بِمَا أَنزَلَ اللّهُ قَالُواْ نُؤْمِنُ بِمَآ أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرونَ بِمَا وَرَاءهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَهُمْ (بقرہ ۹۱) یعنی " جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ اس پر جو خدا نے اتارا کہتے ہیں ، ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں، جو ہم پر اتارا گیا اور انکار کرتے ہیں اس کا جو اس سے علاوہ ہے۔ حالانکہ وہ بھی حق ہے اور تصدیق کرتا ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔" یہاں قرآن کا ذکر نہیں آیا ، لیکن زیادہ لطیف اشارہ ہے ، یہودی بائبل شریف کا صرف ایک حصہ مانتے ہیں جس کو عہدِ عتیق ہیں۔ اور دوسرے حصہ یعنی عہدِ جدید کا انکار کرتے ہیں۔ اسی لئے قرآن شریف نے ان کو الَّذِينَ أُوتُواْ نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ (نسا ۴۴) یعنی وہ جن کو الکتاب کا ایک حصہ ملا پس ان سے یہ کہا گیا کہ خدا نے جو کچھ یا جہاں کہیں اتارا اس کو مانو۔ اگر وہ یہ بات مان لیتے تو ان کو انجیل بھی ماننا پڑتی اور اس کے ساتھ قرآن بھی ۔لہذا انہوں نے ایسا جواب دیا جس سے دونوں کے منکر بنے رہنے کا حیلہ ہاتھ میں رہے۔ اور بولے " جو کچھ ہم پر اترا ، اس کے علاوہ کسی اور کو ہم نہیں مانتے۔" یہ اپنی نوعیت میں اس قسم کا حیلہ تھا جو کفار عرب نے کیا تھا یعنی وہ توریت وانجیل دونو سے منکر ہوتے تھے۔ یہ کہہ کے کہ وہ ہم پر نہیں نازل ہوئیں اور یہودی صرف انجیل کے منکر تھے کہ وہ ہم پر نہیں اتری ۔ قرآن ے ان کے عذر کو اس قول سے باطل کیا کہ جو اس کے علاوہ ہے وہ تو اسی کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے اور یہ تعریف انجیل اور قرآن دونوں پر حاوی ہے کیونکہ قرآن نے فرمایا کہ جس طرح انجیل وتورات وغیرہ کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے موجود تھیں اسی طرح قرآن ، توریت وانجیل سب کی تصدیق کرتا ہے جو اس کے پہلے موجود تھیں(مائدہ ع ۷) غرضیکہ صاف صاف روشن ہے کہ قرآن شریف نے اپنی صداقت کی بنیاد ہر حالت میں بائبل شریف ہی پر رکھی۔ کفارِ عرب کے روبرو بھی اوریہود عرب کے روبرو اور عیسایئوں کے روبرو بھی۔ پس وہ تمام لوگ جو قرآن شریف کو ماننے کی خاطر، اس کی حمایت میں بائبل شریف کو بے اعتبار قرار دیتے ہیں ، بالکل اسی شخص کی مانند ہیں جو اس ڈال کو کاٹ رہا تھا جس پر وہ آپ کھڑا تھا۔ مگر سر سید احمد صاحب مرحوم نے ہندو پاک کے مسلمانوں کو سمجھادیا کہ وہ کیا غضب کرتے ہیں اور یہ شکر کی بات ہے ۔ مسلمانوں کے لئے بھی اور عیسائیوں کے لئے بھی۔

لفظ انجیل کی اصطلاح

عیسائی اپنی اصطلاح میں کل مجموعہ عہدِ جدید کو انجیل کہتے ہیں اوراس لفظ کا اطلاق بالخصوص اناجیل اربعہ پر ہوتا ہے۔ اب ہم اس امر پر ناظرین کو سرسید صاحب کی تحقیق بھی سنادیتے ہیں۔" ہم مسلمان باوجودیکہ حورائین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہایت مقُدس اور پاک اور صاحب وحی اور الہام سمجھتے ہیں ، اوران کے کلام کو سچ اورواجب العمل جانتے ہیں مگر انجیل میں داخل نہیں کرتے کیونکہ حقیقت انجیل کی ہمارے مذہب میں وہ وحی ہے جو خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کو خاص عیسیٰ علیہ السلام پر اتری ۔ اور خود حواری اور تمام لوگ اس زمانہ کے اسی کے تابع اوراسی کے بجالانے والے تھے۔ کسی کا یہ منصب نہیں تھا کہ اس کلام کے سوا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اترا اپنے الہام یا وحی سے کوئی نیا حکم پیدا کرے اور حوارئین حضرت عیسیٰ کے بھی اسی حکم اوراسی کلام کے پھیلانے والے تھے ، اور نہ کسی کے اس سبب سے ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ نامہ ہائے حوارئین اور اعمال حوارئین اور مشاہدات حورائین اگرچہ پاک اور مقُدس ہیں مگر انجیل میں داخل نہیں۔ لیکن ان کی تنظیم اور تسلیم ہمارے مذہب کے بموجب ایسی ہے جیسی کہ ہم اپنے پیغمبر خدا ﷺ کے صحابہ کے کلام کو سچ اور واجب التعظیم اورواجب التسلیم سمجھتے ہیں۔"

" اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بالفرض اگر کسی حواری کا کلام حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے کلام کے برخلاف ہو، اور کوئی تاویل ایسی نہ نکلے جس سے حضرت مسیح اور اس حواری کے کام

کا ایک مطلب ہوجائے ۔ تو ہم حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام کو واجب العمل سمجھیں گے نہ حواری کے کلام کو۔ اور اگر دو حواریوں کے کلام میں باہم اختلاف پائیں گے تو جس حواری نے زیادہ تر تعلیم اور صحبت حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی پائی ہے اس کے قول کو اختیار کریں گے اور باوجود اس اختلاف کے کسی حواری کی بزرگی اور تقدس میں کچھ شبہ نہیں کریں گے اور نہ ان کے صاحب وحی اور الہام ہونے میں کچھ شبہ کرینگے ، کیونکہ اجتہادیات میں اختلاف ہونا کسی بزرگ کی بزرگی میں کچھ خلل نہیں ڈالتا۔"

سرسید کے زیرِ اثر مولوی محمد علی صاحب بھی اپنی پیغام محمدی میں یہی کچھ فرماتے ہیں -" اس بیان کے بعد یہ سوال ہوگا کہ جس کتاب کو اس وقت انجیل کہا جاتا ہے وہ تو حواریوں وغیرہ کی تاریخ اور کچھ خطوط ہیں۔ قرآن مجید ان کو انجیل نہیں کہتا پھر وہ انجیل کہاں ہے جس کی تصدیق قرآن مجید کرتا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے حضرت مسیح کی تعلیمات کو انجیل کہا ہے پس اس مجموعہ عہدِ جدید میں جو تعلیمات اور نصیحتیں حضرت مسیح کی ہیں وہ انجیل ہے۔ قرآن مجید اس کی تصدیق کرتا ہے ماسوا اس کے جس قدر تواریخی امور حواریوں نے بچشم خود دیکھ کر یا سن کر لکھے ہیں، یا جو باتیں اپنی رائے اجتہاد سے بیان کی ہیں اسے قرآن مجید ہر گز انجیل نہیں کہتا ---ہم نہایت مسرت سے بیان کرتے ہیں کہ علماء محققین مسیحیہ کا قول بھی اسی کے قریب ہے۔ صفحہ ۱ -

بائبل کا مجموعہ

اب ہم سرسید کی زبانی یہ بھی سنائے دیتے ہیں کہ ان کتابوں کا ذکر قرآن شریف نے کس طرح کیا ہے ؟ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :" یہ بات جان لینی چاہیے کہ اگلے نبیوں کی کتابوں کے چار طرح سے نام ہماری مذہبی کتابوں میں آتے ہیں:

اول۔ "توریت" یہ نام اگرچہ خاص حضرت موسیٰ کی کتاب کا ہے مگر ہم مسلمانوں کے استعمال میں کبھی اس نام سے خاص حضرت موسیٰ کی کتاب مراد ہوتی ہے اور کبھی کلُ کتابیں عہدِ عتیق کی۔

دوم۔ "صحیفہ" اس سے عموماً بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی کتابیں مراد ہوتی ہیں۔مگر اس صورت میں جب خاص کسی پیغمبر کا صحیفہ کہا جائے تو اس وقت اسی پیغمبر کی کتاب مراد ہوتی ہے۔

سوم۔"زبور" ۔ یہ نام خاص حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب کا ہے۔

چہارم۔" انجیل" یہ نام خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا ہے۔

اب سمجھنا چاہیے کہ ہم مسلمان دل سے اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ توریت اور زبور اور جمیع انبیاء کے صحیفے اور انجیل سب سچ اور برحق ہیں اور خدا کی طرف سے اتری ہیں۔ اور سب سے آخیر جو کلامِ الہیٰ نازل ہوا وہ قرآن مجید ہے اور بیشک محمد رسول ﷺ پر اترا ہے۔

" قرآن مجید ہی سے ہم کو اس بات کی دلی تصدیق ملتی ہے کہ توریت اور زبور اور صحف انبیاء اور انجیل برحق اور خدا کی طرف سے اتری ہوئی ہیں۔"

اس کے علاوہ ایک اور اصطلاح بھی ہے جس کی رو سے کبھی کبھی عہدِ عتیق اور عہدِجدید کے مجموعہ کُتب کو محض توریت اور انجیل ہی کہتے ہیں ۔ اس لئے عہدِ عتیق کے شروع میں پانچ کتابیں یعنی توریت ہیں اور عہدِ جدید کے شروع میں اناجیل اربعہ جن کو بالتخصیص انجیل کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے سرسید نے لکھا ہے کہ کبھی عہدِ عتیق کی کلُ کتابوں کو" توریت" کہتے ہیں ، اور مولوی رحمت اللہ اور مولوی عبدالحق نے لکھا کہ کبھی لفظ انجیل کا اطلاق" کتبِ عہدِ جدید" کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔

چنانچہ بعض آیات قرآن شریف میں اسی قسم کا حوالہ ہے۔ مثلاً یا اھل الکتب لستمہ علی شی حتی تقیموا التوراۃ والانجیل ۔ اے اہلِ کتاب (بائبل والو) تم کسی بات پر نہیں جب تک قائم نہ رکھو تورات (عہدِ عتیق) اور انجیل (عہد جدید) کو۔ وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدیً للناس ۔ اتاری توریت (عہد عتیق) اورانجیل (عہد جدید) اس سے پہلے ہدایت لوگوں کو۔

پس ہم توریت اورانجیل کی صداقت پرعلاوہ اور گواہی کے (جواس رسالہ میں درج کی گئی ہے) قرآن شریف کی گواہی مستزاد کرتے ہیں۔ دیکھو(باب ششم ،) حصہ اول برکت اللہ۔

چنانچہ قرآن بائبل کی صحت کی حفاظت کی نسبت کہتاہے ۔ وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُواْ مِن كِتَابِ اللّهِ وَكَانُواْ عَلَيْهِ شُهَدَاء (مائدہ ۴۴) "اللہ کی کتاب (بائبل)پرعابد اور عالم لوگ نگہبان بنے رہے اور اس کی صداقت پر شاہد رہے۔" حتیٰ کہ دورِاسلام آیا اور وہ پاکی اورحفاظت میں ملیں کہ حضرت محمد نے اور قرآن نے ان کی صداقت پربار بار گواہی دی۔

فصلِ دوم ۔ قرآن مصدقِ بائبل

آیاتِ تصدیق

قرآن کُتبِ مقدسہ سابقہ کے وجود کا مجمل ذکراس طرح تعظیم کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۱۔)إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى ۔ یہ کچھ تولکھا ہواہے پہلے صحیفوں میں (اعلیٰ ۱۷)۔

(۲۔)أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَى آیا ان کو نہیں پہنچ چکیں نشانیاں اگلے صحیفوں کی (طہٰ ع ۸)۔

(۳۔)وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۔ قرآن موجود ہے اگلوں کی کتابوں میں ۔(شعراء ۱۹۶)

ان کتابوں کے الہٰی الاصل ہونے کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا گیا۔

(۴۔)فَبَعَثَ اللّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُواْ فِيهِ ۔ پھر اللہ نے نبیوں کو اٹھایا جوخوشی اور ڈر کے خبر سنانے والے تھے، اور ان کے ساتھ سچی الکتاب(بائبل) اتاری تاکہ وہ فیصلہ چکا دے لوگوں کے درمیان ان باتوں کا جن میں جھگڑا کریں (بقرہ ۲۱۳)۔

(۵۔)لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ہم نے اپنے بھیجے رسول کھلی نشانیاں دے کر اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ الکتاب(بائبل) یعنی میزانِ(حق وباطل) تاکہ لوگ قائم رہیں انصاف پر (حدید ۲۵)۔

مفسرین نے اس بات کو خوب سمجھ لیاہے کہ ان دونوآئتوں میں لفظ الکتاب سے مرادہیں مجموعہ کُتبِ سماوی اورہم اوپر بتلا چکے کہ جس مجموعہ کو الکتاب عربی میں کہا گیاہے اسی کو اصطلاحاً بائبل کہتے ہیں ۔ پس ہم کو الکتاب کا ترجمہ بائبل کرتےہوئے کوئی تامل نہیں ہوسکتا اور نہ ہونا چاہیے۔

دوسری بات غور طلب یہ بھی ہے کہ قرآن شریف نے نہ صرف ان تمام متفرق کتابوں کوجو مختلف اوقات میں مختلف نبیوں کے ہاتھ سے ملیں بمنزلہ ایک کتابِ واحد کے مان لیا، اوران کو الکتاب کہا (بالکل عیسائیوں کے خیال کے موافق) بلکہ ان تمام نبیوں کو جوصدیوں کا بیچ دے کرآگے گئے بمنزلہ شخص واحد کے مانا جن کی بعثت کی ایک ہی غرض تھی یعنی وہ لوگوں کوخوشی اور ڈر کی خبر سنادیں اوراس آسمانی دستور العمل کے مطابق جوان کو دنیا کی ہدایت کے لئے ملا تھا بنی آدم کے درمیان عدل وانصاف قائم کریں۔ پس چونکہ وہ تمام کتابیں خدا نے نازل کیں ۔ اس لئے وہ الہٰی کتابیں ہوئیں اور انبیاء محض قاصد کا کام

دے گئے۔ اب قرآن شریف کے متعلق جو کہا جاتاہے وہ ایک واحد کتاب ہے مگر دفعتہً واحدۃً نہیں بلکہ نجماً نجماً ایک کوڑی برسوں سے زیادہ میں نازل ہوئی ۔ یہ خیال بالکل اسی خیال کا چربا ہے جو بائبل کی نسبت مسیحی رکھتے ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں مدت کم رکھی گئی اور قاصد صرف ایک مانا گیا تاکہ اس لحاظ سے بھی قرآن کو عربی بائبل کہا جاسکے۔ اب مسلمان بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ بائبل مقُدس ایک کتاب واحد ہے جس کے اندر ۶۶ کتابیں ہیں ۔ جو نجماً نجماً ۱۴ سو سال کے اندر النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ کے اوپر اللہ نے نازل فرمائیں۔ اور کہ فیما کنت قیمۃ اسی طرح کا سچا حلیہ ہے جس کو دوسرے الفاظ میں یوں لکھا ہے وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ (آل عمران ۸۴) جو کچھ ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو کچھ ملا نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ۔ یہ ایک ہی مضمون سورہ بقرہ ع ۱۶ میں اور پھر سورہ آل عمران ع ۹ میں آیا ہے اور اس میں کم سے کم کل عہدِ عتیق کی تصدیق ہے (جس کو تورات اور نبیوں کی کتابوں پر تقسیم کرتے تھے جیسا ہم سطور بالا میں دکھا چکے ہیں) اور نیز چاروں اناجیل کی تصدیق ہے جن پر وَمَا أُوتِيَ عِيسَى کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ بائبل شریف کی تصدیق میں اتنی گواہی بھی کافی تھی مگر قرآن نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس مضمون کی تکرار میں اس کو قند مکرر کا مزا ملتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں چند آیات ملاحظہ ہوں:

(۶۔)وَمَا كَانَ هَـذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَى مِن دُونِ اللّهِ وَلَـكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لاَ رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۔ اور یہ قرآن ایسا نہیں جسے خدا کے سوا کوئی اور گھڑے بلکہ وہ اس کی تصدیق ہے جو اس کے سامنے موجود ہے یعنی الکتاب (بائبل) کی تفصیل ہے جس میں شک نہیں کہ وہ پروردگار عالم کی طرف سے ہے (یونس ۳۷)۔

اس جگہ بائبل مقدس کو جیسا عیسائی سمجھتے تھے نہ صرف الْكِتَابِ لاَ رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ فرمایا بلکہ قرآن منجانب اللہ ہونے کا مدارِ تصدیق بائبل پر رکھا۔ گویا اعتراف کیا کہ اگر قرآن پہلی کتابوں کی تصدیق نہ کرتا تو ایسا گمان کرنا بیجا نہ ہوتا کہ سوائے خدا کے وہ کسی اور کی من گھڑت ہے۔

(۷۔)حَدِيثًا يُفْتَرَى وَلَـكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ (یوسف ۱۱۱) یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات تو ہے نہیں بلکہ ان (کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس (کے زمانہ نزول) سے پہلے (موجود) ہیں (ترجمہ نذیر احمد بقرہ ع ۱۲)

(۸۔)وَهَـذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ " یہ (قرآن بھی) کتاب (آسمانی) ہے۔ جس کو ہم نے اتارا ہے۔ برکت والی (کتاب) ہے اور جو (کتابیں) اس (کے زمانہ نزول) سے پہلے کی (موجود) ہیں ان کی تصدیق (بھی) کرتی ہے۔" (ترجمہ نذیر احمد انعام ۹۲)۔

(۹۔)وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ " اور (اے پیغمبر) ہم نے تمہاری طرف (بھی) کتاب برحق اتاری کہ جو کتابیں اس کے اترنے کے وقت پہلے سے (موجود) ہیں ان کی تصدیق کرتی ہے، اور ان کی محافظ (بھی) ہے۔" ترجمہ نذیر احمد ۔ مائدہ ۴۸)۔ ہم جیسا بتلاچکے ہیں کہ ایسے مقام میں الکتاب سے مراد بائبل ہے۔ پس اس کا بھی ترجمہ یہی ہونا چاہیے کہ قرآن تصدیق کرتا ہے " بائبل کی جو اس کے سامنے موجود ہے اور اس کا محافظ ہے۔"

بَيْنَ يَدَيْهِ کے لفظی معنی ہیں۔" درمیان دونو ہاتھوں اس کے " جس سے مراد کسی شے کا سامنے موجود ہونا ہوتا ہے۔ اور اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔ ہم پوری آیت کو اوپر نقل کرچکے ہیں جہاں دکھلایا گیا کہ جس معنی میں حضرت محمد اور قرآن نے کُتُبِ یہود ونصاریٰ کی تصدیق کی تھی اسی معنی میں قرآن کے نزدیک مسیح وانجیل نے کُتُبِ یہود کی تصدیق کی تھی، جس کا ترجمہ مطابق حافظ نذیر احمد صاحب یہ ہے ۔" اور بعد کو انہیں پیغمبروں کے قدم بقدم ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو چلایا کہ وہ توریت کی جو ان کے وقت

ہیں) پہلے سے (موجود) تصدیق کرتے تھے۔" اور ہم بسند سرسید مرحوم کہہ چکے ہیں کہ توریت سے یہاں " کلُ کتابیں عہد عتیق کی " مراد ہیں۔ یعنی حضرت مسیح نے کتُب عہد عتیق کو اپنے روبرو جس حیثیت سے پایا، ان کی تصدیق فرمادی اور اب بجنسہ اسی روش پر حضرت محمد تشریف لائے۔ اورآپ نے عہدِ عتیق وعہد جدید کے مجموعہ یعنی الکتاب(بائبل) کو اپنے سامنے موجود پایا اور جس حیثیت سے پایا بسرد چشم قبول کرکے اس کی تصدیق فرمادی۔ پس بَيْنَ يَدَيْهِ کہہ کر گویا آپ نے یہ کہہ دیا کہ ہم کسی غائب وفرضی کتاب کی نہیں بلکہ اسی کی تصدیق کررہے ہیں جو ہمارے اپنے ملک میں ہمارے عصر میں ہماری آنکھوں کے آگے موجود ہے۔

ہم قرآن کی حق شناسی کی کہاں تک داد دیں۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا، گویہ بہت تھا۔ بلکہ یہ کہتے بھی دریغ نہ کیا کہ جن کتابوں کی میں تصدیق کررہا ہوں وہ وہی ہیں جو یہودیوں اور عیسائیوں دونو کے ہاتھوں میں موجود ہیں اور ان میں سے ہر ایک فرقہ کے پاس الگ الگ بھی ہیں۔

(۱۰)يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ آمِنُواْ بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ اے اہل کتاب (قرآن) ہم نے نازل فرمایا ہے۔ اور وہ اس (کتاب) کی جو تمہارے پاس ہے تصدیق بھی کرتا ہے اور اس پر ایمان لے آؤ۔(نساء ۴۷)۔

(۱۱)اے بنی اسرئیل اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو نازل ہوئی جو تصدیق کرتی ہے اس (کتاب) کی جو تمہارے پاس موجود ہے۔(بقرہ ع ۵)

(۱۲)وَلَمَّا جَاءهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ او رپہنچی ان (یہود) کے پاس ایک کتاب(قرآن) خدا کی طرف سے جو تصدیق کرنے والی ہے اس (کتاب) جو ان کے پاس ہے۔(بقرہ ۸۹)۔

(۱۳)وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَهُمْ حالانکہ وہ (قرآن) حق ہے اور تصدیق کرنے والا ،اس (کتاب) کی جو ان یہودیوں) کے پاس موجود ہے (بقرہ ۹۱)۔

پس پہلی آیت جس میں اہل کتاب عموماً مخاطب ہیں، یعنی یہودی بھی اور عیسائی بھی۔ اس میں دونوں کی کتابوں کی یکجا تصدیق کردی اور دوسری آیتیں جہاں صرف یہودی مخاطب ہیں، ان میں صرف انہیں کتابوں کی جو ان کے پاس موجود ہیں تصدیق کردی۔

جوآیتیں ابھی ہم اوپر نقل کرچکے ہیں، ان پر مولوی صاحب مذکور کا ایک اعتراض ہے۔" قرآن مجید میں لفظ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ اور معکمہ چار جگہ آیا ہے۔ ان چاروں مقام پر خاص یہود مخاطب ہیں اور توریت کی تصدیق مراد ہے۔۔۔۔ فقرہ مذکور کو انجیل کی تصدیق سے کچھ واسطہ نہیں۔"

مولوی صاحب نے نہایت غلط بات کہی، کیونکہ سورہ نساء والی آیت میں جس پر ہم نے نمبر ۱۰ ڈالا ہے۔ جملہ اہل کتاب کو خطاب ہے جس میں عیسائی ضرور شامل ہیں اور مولوی صاحب بھی نہیں کہہ سکتے کہ امنوا بھما انزلنا کے حکم سے ان کو خارج کیا گیا ہے۔ پس اس کوصرف یہودیوں سے مخصوص کرنا خطا ہے۔ اس حکم میں عیسائی اوران کے پاس جو انجیل ہے ضرور داخل ہیں۔

مولوی صاحب کا یہ فرمانا بھی غلط ہے کہ اگر صرف یہود مراد ہوں، تو صرف" توریت کی تصدیق مراد" ہوگی ۔ وہ بھولتے ہیں کہ یہود کے پاس نہ صرف ایک کتاب توریت ہی نہ تھی بلکہ عہدِ عتیق کی جملہ کتابیں اوران کے سوائے کچھ اور بھی ۔ پس تصدیق بہت وسیع ہے اور آپ " معکمہ" کے زور کو تاویلوں سے گھٹا نہیں سکتے۔ مگر معھمہ پر ایسی رقیق حجت اٹھانے کے بعد بھی آپ کو امان نہیں مل سکتی ۔ جبکہ اس کا مترادف کلمہ عندھمہ اسی موقع پر موجود ہے۔ يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيلِ پاتے ہیں اس کولکھا ہوا اپنے پاس توریت کے اندر اورانجیل کے اندر ۔"(اعراف ۱۵۷)۔ اور جب

بین یدیہ کہہ کر قرآن انجیل کی بھی تصدیق کرچکا بلکہ فیہ ھدیً ونور ۔" اس کے اندر ہدایت ونور" کا قائل ہوچکا جس کی ہم بہت جلد تفصیل بیان کرنے والے ہیں۔

اب جو اس قدر روشن ہوگیا کہ قرآن شریف نے کس قسم کی کتابوں کی تصدیق فرمائی ہم چند آیتیں ایسی نقل کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوجائیگا کہ اس تصدیقِ اجمال کی نوعیت کیا ہے اور آیا اس سے بڑھ کر تصدیق ممکن بھی ہے:

(الف) توریت موسیٰ کی شان میں:

(۱۴۔)وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُوْلَـئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُواْ لِلَّذِينَ هَادُواْ وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُواْ مِن كِتَابِ اللّهِ وَكَانُواْ عَلَيْهِ شُهَدَاء " اور (یہ لوگ) کیوں تمہارے پاس جھگڑے فیصلے کو لاتے ہیں جب کہ خود ان کے پاس توریت ہے (اور) اس میں حکم خدا (موجود) ہے۔ پھر اس کے بعد (بھی حکم خدا سے) روگردانی کرتے ہیں۔ اور ان کو (سرے سے) ایمان ہی نہیں بیشک ہم (ہی) نے توریت نازل کی جس میں (ہر طرح کی) ہدایت اور نور (ایمان) ہے (خدا کے) فرمانبردار (بندے) انبیاء کے علاوہ یہودیوں) (یعنی مشائخ اور علماء (بھی) جو کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے۔ اور (وہ) اس کے محافظت کرتے بھی رہے۔" (مائدہ ،۴۳، ۴۴ ترجمہ حافظ نذیر احمد)۔

(۱۵۔)قُلْ مَنْ أَنزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاء بِهِ مُوسَى نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا وَعُلِّمْتُم مَّا لَمْ تَعْلَمُواْ أَنتُمْ وَلاَ آبَاؤُكُمْ قُلِ اللّهُ (انعام ۹۱)(اے محمد۔ یہودیوں سے) پوچھ کس نے اتارا اس کتاب کو جسے موسیٰ لایا جو نور اور ہدایت ہے لوگوں کے لئے جس کو تم نے ورقوں (پے پائرس) پر لکھ رکھا ہے۔ جس کو تم ظاہر بھی کرتے ہو، اور اکثر کو پوشیدہ رکھتے ہو جس کے ذریعہ تم کو وہ کچھ سکھایا جو نہ تم جانتے تھے، اور نہ تمہارے باپ دادا (اے محمد جواب میں) کہو اللہ نے (اس کو اتارا ہے۔) ترجمہ نذیر احمد۔

(۱۶۔)ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيَ أَحْسَنَ وَتَفْصِيلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات عطا فرمائی جس سے نیکوکاروں پر ہماری نعمت پوری ہوئی اور اس میں کلُ باتوں کے تفصیل احکام موجود ہیں اور (لوگوں کے لئے) ہدایت اور رحمت ہے۔ (انعام ۱۵۴ ترجمہ نذیر احمد)

عہد عتیق کی شان:

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَى وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ هُدًى وَذِكْرَى لِأُولِي الْأَلْبَابِ اور بے شک ہم نے موسیٰ کو ہدایت بخشی اور ہم نے وارث بنایا بنی اسرائیل کو اس کتاب کا جو ہدایت ہے اور نصیحت عقلمندوں کے لئے (مومن ۵۳)

ہم نے اس آیت میں لفظ الکتاب سے مراد صرف عہد عتیق لی ہے جو بنی اسرائیل سے مخصوص ہے ۔جس میں توریت بھی داخل ہے اور زبور بھی اور کُتبِ انبیائے بنی اسرائیل اگرچہ صاحب مدارک الکتاب کو اس جگہ بھی اسم جنس قرار دے کر اس میں توریت وانجیل وزبور سب کو شامل کرتے ہیں (ای التوارۃ والانجیل الزبور لان الکتاب جنس) لیکن اس میں انجیل کو اس لئے شامل نہیں کرتے کیونکہ وہ بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں بلکہ اقوام جہان کے ورثہ میں پڑی۔

انجیل جلیل کی شان

(۱۸۔)وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فِيهِ اور ہم نے اس (عیسیٰ) کو انجیل دی اور اس کے اندر ہدایت ہے اور نور اور وہ تصدیق کرتی ہے، توراۃ کی

جواس کے آگے تھی۔ اور وہ ہدایت ہے اور نصیحت ہے، پرہیزگاروں کے لئے اور واجب ہے کہ حکم کریں انجیل والے اسی کے مطابق جو اللہ نے اس کے اندر نازل فرمایا(مائدہ ۴۶)۔

(۱۹۔)يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّىَ تُقِيمُواْ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ اے اہل کتاب (بائبل والو) جب تک تم تورات اور انجیل اوران (صحیفوں) کو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں قائم نہ رکھوگے تو (دین سے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو) تم کو کچھ بہرہ نہیں۔(مائدہ ۶۸)۔

(۲۰۔)وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُواْ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيهِم مِّن رَّبِّهِمْ لأكَلُواْ مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم مِّنْهُمْ اور اگر یہ لوگ توریت اور انجیل اوران (صحیفو) کو جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے اترے ہیں۔ قائم رکھتے تو ضرور (ہم ان کو ایسی برکت دیتے کہ ان کے) اوپر سے (رزق برستا)اور پاؤں کے تلے سے ابلتا اور یہ فراغت سے کھاتے۔" (مائدہ ۶۶ ترجمہ نذیر احمد)۔

ان اخیر دو نو آیتوں میں توریت وانجیل اصطلاحی نام ہے ساری کُتب عہد عتیق وعہد جدید کا یعنی یہود اور عیسائیوں کی جملہ کتبِ مقُدسہ کا ان میں ذکر ہے جیسا ہم سطور بالا میں لکھ آئے ہیں۔

آیات کا مطلب

غور کرنے کا مقام ہے کہ قرآن کی حقانیت کے اقرار کے لئے اس سے بہتر کون الفاظ آسکتے تھے جو ہم آیت نمبر ۱۰ میں نقل کرچکے ہیں ۔ انزلنا الیک الکتب بالحق(اے محمد) اتاری ہم نے تیری طرف یہ کتاب برحق ۔ پھر بجنسہ یہی بائبل شریف کی کتابوں کے حق میں فرمایا گیا۔ انزلنا معھمہ الکتب بالحق (دیکھوآیت نمبر ۴)۔

بڑی سے بڑی تعریف قرآن شریف کی یہ تھی۔ وَتَفْصِيلَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ اس میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان والے ہیں ہر چیز کا تفصیل بیان اور ہدایت اور رحمت ہے۔(یوسف ۱۱۱ ترجمہ نذیر احمد)۔ توریت کی تعریف میں بھی یہی سب کچھ کہا بلکہ اس سے بڑھ کر اس کو تماماً علی الذی احسن کہا جو قرآن کو نہیں کہا گیا (دیکھوآیت نمبر ۱۶) آنحضرت کو قرآن کے حق میں یہی حکم ہوا تھا ۔ احکمہ بما انزل اللہ ۔ جو (کتاب) خدا نے (تم پر) اتاری ہے اسی کے مطابق ان لوگوں میں حکم دو"(مائدہ ع ۷ ترجمہ نذیر احمد) بجنسہ یہی حکم عیسائیوں کو انجیل کے حق میں ہوا اور اسی سورہ کے اسی رکوع میں (دیکھوآیت نمبر ۱۹)۔

اب ان آیات کی شہادت سے جو چند امور مستنبط ہوتے ہیں ، ان کو ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔ مثلاً آیت نمبر ۱۵ سے روشن ہے کہ (۱) ایک کتاب تورات کے نام کی زمان نزول قرآن میں موجود تھی (۲) وہ کتاب یہود کے پاس تھی (۳) اس میں اللہ کے احکام تھے(۴) اس میں ہدایت ونور تھا(۵) اس کی تلقین انبیاء ومشائخ نسلاً بعد نسل برابر کرتے آئے تھے ۔ (۶) اور وہی لوگ اس کی محافظت کرنے پر مقرر کئے گئے تھے (۷) اس کتاب کو اللہ نے اتارا تھا(۸) اوروہ کتاب اس وقت بھی قابل تمسک تھی اور اس سے فتویٰ لیا جاتا ہے ۔ (۹) اور کہ وہ کتاب یہودیوں کے لئے کافی وشافی ہے۔

آیت نمبر ۱۶ سے ثابت ہے کہ (۱) جس کتاب کو یہودی توراۃ کہتے تھے اسی کو حضرت رسول بحکم خدا تعالیٰ کی اتاری ہوئی مانتے تھے(۲) اسی کو موسیٰ کی لائی مانتے تھے(۳) اسی کو نور اور ہدایت مانتے تھے(۴) اسی کو یہودیوں کے ہاتھوں میں موجود مانتے تھے۔

آیت نمبر ۱۹ سے ثابت ہوتا ہے کہ (۱) ایک اور کتاب ہے جس کو انجیل کہتے ہیں (۲) اس میں ہدایت اور نور ہے (۳) وہ توریت کی تصدیق کرتی ہے ۔(۴) تمام پرہیزگاروں کے لئے وہ ہدایت و نصیحت ہے(۵) وہ اہل انجیل یعنی عیسائیوں کے پاس

موجود ہے ۔(٦) وہ کتاب پوری طرح قابل تمسک ہے۔(٧) جو مضمون اس کے اندر ہے، وہ اللہ کا اتارا ہوا ہے۔

آیت نمبر ۲۰، ۲۱ سے ثابت ہوتاہے کہ (۱) جن کتابوں کو تورات وانجیل کہا ہے وہ واجب العمل ہے(۲) وہ اہلِ کتاب کی مقُدس کتابیں ہیں (۳) کہ علاوہ ان کے کچھ اور کتابیں ہیں جویہودیوں اور عیسائیوں کے پاس ہیں وہ بھی واجب العمل ہیں(۴) اور کہ اگر اہل کتاب اپنی ان کتابوں پر عمل نہ کریں توان کی بھلائی نہیں۔

اب جس کو زیادہ تحقیق منظور ہو کہ وہ کون کون کتابیں تھیں ۔وہ جوزمانہ نزول قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس موجود تھیں ۔ وہ مولانا رحمت اللہ صاحب کے اظہار الحق میں ان کی تفصیل دیکھ لے جس کو ہم اوپر نقل کرچکے ہیں ۔ پس ثابت ہوگیا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے پاس والی کتابوں کی تصدیق کرکے قرآن شریف نے کل بائبل کی تصدیق کردی یعنی پرانے عہد نامہ کی اورنئے عہد نامہ کی بلکہ ان کے علاوہ اس نے اور کتابوں کی بھی تصدیق کردی جن کے الہامی ہونے میں اہل کتاب کو اختلاف رہا۔ اس نے اہل کتاب کو مخاطب بنا کے انہیں کی اصطلاح کا استعمال کیا اورجب وہ انجیل کی تصدیق کرتا ہے تو وہ سارے عہدِ جدید کی تصدیق کرتا ہے جس کوعیسائی انجیل کہتے تھے۔ جیسا کہ عہدِ جدید کے سرورق پر لکھاہوا موجود ملتاہے۔ " کتاب عہدِ جدید یعنی سیدنا مسیح کی انجیل"۔ قرآن شریف نے کل کو ایک کتاب سمجھا جیسا عیسائی سمجھتے ہیں اورسب کو سیدنا مسیح سے منسوب کیا اور سب کو برحق اور الہامی مانا اوراس امر کے قطعی ثبوت میں ہم سورہ عبس اوراس کی شان نزول بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

"تیوری چڑھائی اورمنہ موڑا اس سے کہ آیا اس پاس اندھا اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا یا سوچتا تو کام آتا اس کے سمجھانا۔ وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے، اور تجھ پر گناہ نہیں کہ وہ نہیں سنورتا ۔ اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا وہ ڈرتا ہے ۔ سو تو اس سے تغافل کرتاہے۔ یوں انہیں یہ تو سمجھوتی ہے پھر جو کوئی چاہے اس کوپڑھے ۔ لکھی ہے ادب کے ورقوں میں اونچے دھوئے ستھرے ہاتھوں میں لکھنے والوں کے جو سردار ہیں نیک۔"(ترجمہ شاہ عبدالقادر) تفسیر عزیزی میں شان نزول اس سورۃ کی یہ بیان ہوئی کہ بنی صاحب مسجد الحرام میں بیٹھے ہوئے عتبہ وربیعہ وابوجہل وغیرہ روسا اور امراء قریش کو اسلام کا وعظ سنا رہے تھے کہ ہنگام تقریر میں عبداللہ بن ام مکتوم ایک اندھا اور نہایت غریب صحابی دوڑتا ہوا مجلس میں گھس پڑا اور حضرت کے پاس آبیٹھا اورپھر بات کاٹ کر سوال پوچھنے لگا۔ امراء کی موجودگی میں اس اندھے کا اس طرح آپ سے گفتگو کرنے لگنا آپ کو بہت برا معلوم ہوا۔اس کو آپ نے چپ کرادیا اور نہیں پسند فرمایا کہ ان دولتمندوں کو چھوڑ کر آپ اس سے التفات کریں۔ فوراً حضرت جبرائیل یہ آیات لے کر نازل ہوئے اور حضرت کو تنبیہ فرمائی۔

اب غور طلب یہ بات ہے کہ جو نصیحت حضرت جبرائیل لائے اس کی نسبت کھلے الفاظ میں لکھا ہے " جو کوئی اس کوپڑھے ، لکھی ہے ادب کے ورقوں میں ۔" اب کوئی مولوی صاحب ہم کو بتلائے صحفٍ مکرمتہٍ والی وہ کونسی کتاب ہے جس میں اس قسم کی نصیحت لکھی ہوئی مل سکے کہ جو کوئی چاہے اس میں پڑھ لے؟اس کا پتہ ہم بتلائے دیتے ہیں ۔ انجیل مقُدس کے اندر جو ۲۷ کتابیں ہیں ان میں ایک کا نام یعقوب کا خط ہے۔ اس کے باب دوم آیت ۱ سے ٦ تک یہ لکھا ہے:

"اے میرے بھائیو۔ ہمارے خداوند یسوع مسیح کا جو ذوالجلال ہے ایمان ظاہر پرستی کے ساتھ رکھو۔ اس لئے کہ اگر کوئی سونے کی انگوٹھی اور براق کپڑے پہنے تمہاری جماعت میں آئے اورایک غریب بھی میلے کچیلے کپڑے پہنے داخل ہو اور تم اس ستھری پوشاک والے سے متوجہ ہو اور اس سے کہو آپ یہاں بخوبی بیٹھئے اور غریب سے کہو کہ تو وہاں کھڑارہ یا یہاں میرے پاؤں کی چوکی تلے بیٹھ۔ تو کیا تم نے آپس میں طرفداری نہ کی اور بدگمان حاکم نہ بنے ؟ سنو اے میرے پیارے بھائیو۔ کیا خدا نے اس جہان کے غریبوں کو نہیں چنا

کہ ایمان کے دولتمند اوراسی بادشاہت کے جس کا اس نے اپنے محبوں سے وعدہ کیا وارث ہوں۔"

دیکھئے قرآن کی یہ نصیحت اندھے صحابی کے حالات سے کس طرح لفظ بلفظ مطابقت کھاتی ہے۔ اوراس نصیحت کی قرآن شریف نے کس طرح تصدیق فرمادی اور اس کتاب کو جس کے اندر یہ نصیحت لکھی ہے کیسے بزرگ ناموں سے یاد کیا ہے، ایسے ناموں سے کہ دنیا کے اندر اس شان و عظمت کی کوئی کتاب قرآن والوں کو نہیں مل سکتی۔ صحت مکرمہ موقوعۃ مطھرۃ بایدی سفرۃ کرام بررۃ۔ وہ لوگ جواب بھی کہے جائیں کہ انجیل شریف کی تصدیق میں کچھ کسر ہے وہ قرآن کو سمجھیں ورنہ قرآن ان سے سمجھے گا۔ کیا ہمارے لئے یہ بس نہیں کہ ہماری کتابوں کی حمدو ثنا قرآن کے درد زبان ہے؟

ہم ان مولوی صاحبان کو زیادہ شرمانا نہیں چاہتے جو بائبل شریف "کایا پلٹ" کہتے ہیں۔ خدا کی کتابوں کی اسی طرح توہین کرنے والے کبھی سرخرو نہیں ہوسکتے۔ قرآن شریف ان کو عذاب سے ڈراتا ہے۔ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنكُمْ إِلاَّ خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا : توکیا کتاب (الہیٰ) کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے توجولوگ تم میں سے ایسے کریں اس کے سوا ان کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں (ان کی) رسوائی ہو۔" (بقرہ ۸۵ ترجمہ نذیر احمد)۔

اب اس میں کیا شک ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے ہادیوں کی رہبری میں خدا کی کتاب کے کسی ایک حصہ کو نہیں بلکہ کلُ کی کلُ الکتاب کو رد کیا اور اس کے حق میں وہ وہ کفر بکے کہ الاماں۔ توکیاوہ خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا سے بچ سکتے ہیں؟

قرآن شریف سے جن مذکورہ بالاآیات کا اقتباس تصدیق کُتب سابقہ میں ہوچکا ان سے ظاہر ہے کہ یہ تصدیق قطعی وبلا استثنا بھی مثلاً جب توریت کو خدا کی تاری ہوئی کہا تو پھر کون کسر باقی رہ گئی؟ فیھا ھدیً ونور کہہ کرمان لیا کہ جو کچھ اس کے اندر ہے وہ ہدایت و نور ہے۔ ہدایت میں گمراہی اور ضلالت کی گنجائش نہیں۔ نہ نور میں تاریکی کی اور خدا کے پاس سے اتری ہوئی کتاب میں ضلالت وتاریکی کا وہم کرنا خباثت ہے۔ پس یہی تووجہ تھی جو اس کتاب کو تماماً علی الذی احسن بھی فرمایا اسی طرح جب انجیل کو خدا کی نازل کی ہوئی اور خدا کی دی ہوئی بتلایا تو اس کو نہ کہ اس کے کسی جزو کو ھدیً وموعظۃ کہا۔ اور اس کے اندر سوائے ہدایت اور نور کے کچھ اور نہیں مانا۔

فصلِ سوم۔ قرآن اور مسئلہ تحریف

وہ اصحاب بڑے جرات مند ہیں جو قرآن کی مذکورہ بالاآیتوں کو خدا کا کلام بھی مانتے ہیں اوراسکی نازل کردہ الکتاب جس کی شان میں وہ نازل ہوئیں آیات کی باطل تاویل کرکے تصدیق کو تکذیب بنادیتے ہیں۔

ہم کو یقین ہے کہ اگر اہلِ اسلام قرآن وحدیث سے مسیحیوں کی کتابوں کی نسبت فتویٰ لیتے تو کبھی وہ ان کتابوں کی اہانت میں زبان نہ کھولتے۔ اس پر نہایت قوی دلیل یہ ہے کہ متقدمین میں جو سب سے زیادہ قرآن وحدیث جاننے اور سمجھنے والا گزرا جس کو مناظرہ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا یعنی قرآن وحدیث کو فقط قرآن دحدیث سے خالص کرکے سمجھا وہ امام بخاری ہیں۔ جنہوں نے ابن عباس کے ایک غلط خیال کورد کرتے ہوئے اپنی کتاب حدیث میں فرمایا: ولیس احد یزیل لفظ کتاب من کتاب اللہ ولکنھم یحرفونہ علی غیرتاویلہ یعنی کوئی شخص نہیں جو خدا کی کتابوں میں سے کسی کتاب کا کوئی غلط لفظ زائل کرسکے بلکہ اہل کتاب اس میں تحریف کرتے تھے بایں طور کہ اس کی تاویل کرتے خلاف سچی تاویل کرے۔ یعنی معنی بگاڑتے تھے۔ امام بخاری کے اس قول سے سرسید نے بڑی قوی سند پکڑی ہے۔ صحیح بخاری مطبوعہ کرزن گزٹ کے حاشیہ پر بحوالہ فتح الباری لکھا ہے کہ " بخاری کی مراد یہ ہے کہ یہودی تاویلیں کرکے تحریف معنوی کیا کرتے تھے جیسے اگر عبرانی کا کلمہ قریب وبعید زد

معنوں کا احتمال رکھتا اور مراد قریب سے ہوتی تو وہ اسے بعید پر محمول کرتے۔" پس بلاخوف تردید کہا جاسکتاہے کہ اگر قرآن وحدیث کے اندر ایک ذرہ بھر اشارہ ہماری کتابوں کے بےاعتباری کی نسبت موجود ہو تو بخاری علیہ الرحمتہ سے زیادہ اس کو کوئی نہ پاتا۔

ناظرین دیکھ چکے ہیں کہ تصدیقِ کُتب بائبل تو قرآن شریف نے کیسی برملا کردی۔ اب ان تحریف کے مدعیوں سے پوچھئے جو ان مقُدس کتابوں کو محرف ومبدل اور کیا کچھ نہیں کھتے کہ تم کو اپنے دعویٰ کے لئے کون سا سہارا قرآن شریف کے اندملتا ہے؟ سرسید تو تبئین الکلام میں ان تمام آیاتِ قرآن پر مفصل بحث کرچکے جن میں کُتب مقُدسہ پر تو نہیں مگر اہلِ کتاب کے بعض افراد پر الزام لگایا گیا کہ وہ اپنی کتابوں کی نصوص میں تاویل کرکے ان کے سچے مفہوم کو بگاڑتے یا پوشیدہ کرتے ہیں اور اگر ہم بھی اپنی طرف سے کسی قرآنی آیت کو چھانٹ کر اس پر بحث کرنے لگیں تو ہمارے مخالف کہہ دیں گے کہ ہم نے مضبوط آیتوں کو چھوڑ کر کمزوروں کا حوالہ دیا ہوگا۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت ہمارے سامنے مولوی ابو سعید محمد حسین مرحوم بٹالوی کی اس کتاب سے ایک عبارت درج ہے جو انہوں نے بعنوان تعمیل احکام توریت وانجیل۔" اپنے رسالہ اشاعتہ السنتہ میں بجواب سرسید چھاپی تھی۔ آپ نے اس میں اپنی دانست میں کُتبِ مقُدسہ کی بے اعتباری پر قرآن کے مضبوط سے مضبوط پانچ شواہد پیش کئے ہیں، اوریہاں ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ بحث کرکے اس دعویٰ کی قلعی کھولتے ہیں:

(۱۔) آپ فرماتے ہیں "۔ ان کتابوں میں تحریف کے وقوع اوروجوہ سے قرآن مجید نے خود خبردی ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہوا ہے ۔ (مسلمانو) کیا تمہیں یہ امید ہے کہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) تمہاری تصدیق کریں گے؟ ان میں تو ایسے لوگ ہیں جو خدا کا کلام سنتے تھے۔ پھر جان بوجھ کر اس بدل ڈالتے تھے ۔" أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُواْ لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلاَمَ اللّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (بقرہ ۷۵)۔

مولوی صاحب کا ترجمہ اوراس کی تفسیر اس آیت کے اصل الزام کی برجستہ مثال ہے۔ کیا عبرت کامقام نہیں کہ مدعی تحریف خود قرآن کی تحریف کا مرتکب ہو گیا۔

(الف) آیت میں خطاب صرف یہود سے ہے رکوع ۶ بایں الفاظ شروع ہوا۔ یا بنی اسرائیل مولوی صاحب نے آیت کا مخاطب " اہلِ کتاب" کو بنایا اور اس میں " یہود ونصاریٰ
دونوں کو گن لیا۔

(ب) آیت میں حرف قد کو لاکر آیت میں ماضی کو تحقیقی وتاکید ی بنایا گیا ہے۔ پس قد کان فریق منھمہ کا ترجمہ کرنا چاہیے تھا۔" گزرچکا ان کے درمیان ایک گروہ" مگر مولوی صاحب فرماتے ہیں" ان میں تو ایسے لوگ ہیں۔"

ایک ظلم تو کیا کہ جو الزام یہودیوں سے خاص تھا، اس کو مسیحیوں پر بھی عام کردیا۔ دوسرا جو کسی زمانہ گذشتہ پر محدود تھا اس کو زمانہ اسلام میں مروج بتلایا حالانکہ وہ الزام جو کچھ بھی ہو یہودیوں کے ایک گروہ پر تھا جو مدتیں ہوئیں مرمٹا اور یہ باتیں ایسی ہیں جنہیں مفسرین نے بہت قابل توجہ سمجھا ہے۔ مدارک میں ہے۔ طائفة فمن سلت منھمہ" ان لوگوں میں سے کوئی فرقہ گذر چکا۔" اور شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں۔" بودہ است یک فرقہ ازایشاں درزمان گذشتہ کہ ہنوز پیغمبرما مبعوث نہ شدہ بود۔"

(ج) سب سے بڑھ کر یہ ہے ، کہ مولوی صاحب اپنا دعویٰ بھول گئے چلے تو تھے ثابت کرنے کو کہ " ان کتابوں میں تحریف کے وقوع وجود سے قرآن مجید نے خود خبردی۔ مگر ثابت یہ کرنے لگے کہ کسی زمانہ میں یہودیوں میں کوئی لوگ تھے جو خدا کے کلام کو سن سمجھ کر محرف کرڈالتے تھے۔ یعنی تحریف کتابوں میں نہیں کی گئی بلکہ بے ایمانوں کی زبان اور ایسے ناہنجار آدمی عیسائیوں میں تو کوئی ہوئے ہی نہیں۔ عرب کے یہودیوں میں کبھی ہوئے

تھے پس زیادہ سے زیادہ یہ تحریف معنوی کا الزام ہے جو ایک فرقہ دوسرے پر ہمیشہ لگاتا آیا ہے اور جو ہماری دانست میں مولوی صاحب مرحوم پر زیادہ عائد ہوتا ہے۔

(۲۔) ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے" ان کے لئے خرابی ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب (آیات والفاظ کتاب) لکھتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اس پر تھوڑا (دنیاوی) مول لیں۔" فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَـذَا مِنْ عِندِ اللّهِ لِيَشْتَرُواْ بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً (بقرہ ۷۹)۔

اول۔ اس آیت میں ایک کلیہ بیان کیا ہے۔ کسی خاص فرقہ کو نفرین نہیں کی گئی۔کسے باشد، یہودی ۔ مسیحی مسلمان جو دنیاوی طمع کی خاطر اپنی لکھی ہوئی کتاب کو خدا کی کتاب بتادے اس پر افسوس ۔ اور شاہ عبدالقادر صاحب اس آیت کے فائدہ میں فرماتے ہیں" یہ وہ لوگ ہیں جو عوام کو ان کی خوشی کے موافق باتیں جوڑ کر لکھ دیتے ہیں اور نسبت کرتے ہیں جو طرف خدا کے یا رسول کے۔"

دوم۔ عین اس کے قبل یہ عبارت بھی آئی ہے أُمِّيُّونَ لاَ يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلاَّ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلاَّ يَظُنُّونَ۔ اور انہیں میں اُمی لوگ ہیں جو نہیں جانتے کتاب صرف آرزو میں باندھ رکھی ہیں، جو نرے اٹکل پچو چلتے ہیں۔اُمی اصطلاحی لقب ہے غیر اہلِ کتاب کا اور اس کے لغوی معنی ہیں، مادر زاد جاہل اور یہ ان کو اس اعتبار سے کہا گیا کہ وہ علم الہیٰ یعنی خدا کی کتاب پڑھنے والے نہ تھے۔ پس قرینہ چاہتا ہے کہ اس آیت میں اہل عرب کا (جو غیر اہل کتاب تھے) ذکر ہو نہ ہو کہ اہل کتاب کا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں سیلمہ وغیرہ کی طرف قرآن میں اشارہ آیا ہے۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوْحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَن قَالَ سَأُنزِلُ مِثْلَ مَا أَنَزلَ اللّهُ ۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر بہتان باندھے جھوٹ اور کہے میری طرف وحی آئی حالانکہ اس کی طرف کئی وحی نہیں آئی اور جو کہے کہ میں بھی اتارتا ہوں اس کی مانند جو اللہ نے اتارا ۔(انعام ۹۳)۔

بہر کیف اگر اہلِ عرب میں سے کسی نے کسی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر خدا کی طرف منسوب کردیا تھا تو اس کی لعنت اسی بدکار کو اٹھانا چاہیے اور اسی کا فریب کھل بھی گیا۔ اور وہ رسوا بھی ہوچکا ۔ پس کسی بوالفضول کے بیہودہ فعل سے خدا کی اس کتاب پر جو دنیا کی ہدایت اور روشنی کے لئے آسمان سے نازل ہوئی کوئی حرف نہیں آسکتا اور آپ کو چاہیے کہ آپ ثابت کریں کہ جو کتابیں ہمارے پاس ہیں ۔" ان کتابوں میں تحریف کے وقوع وجود سے قرآن مجید نے خود خبر دی ہے۔"

(۳۔) ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔" یہودیوں میں ایسے لوگوں ہیں جو خدا کے بول (یعنی آیات کلمات) کو اپنے ٹھکانے سے بدل دیتے ہیں اور منہ سے کہتے ہیں ہم نے سنا اور دل میں کہتے ہیں، ہم نے نہیں مانا ۔"(نساء ع ۷)۔

چونکہ اسی رکوع میں لاَ تَقْرَبُواْ الصَّلاَةَ بھی ہے اس لئے مولوی صاحب نے دعویٰ تحریف میں پوری آیت نہیں نقل کی! ہم اسے مع ترجمہ حافظ نذیر احمد درج کرکے مطلب کو صاف کئے دیتے ہیں ۔ مِّنَ الَّذِينَ هَادُواْ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُواْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا ل َكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ (اے پیغمبر) یہود میں کچھ (لوگ ایسے بھی) ہیں جو الفاظ کو ان کی جگہ (یعنی اصل معنوں) سے پھیرتے ہیں ، اور اپنی زبانوں کو مروڑ (توڑ) کر اور دین (اسلام) میں طعنے کی راہ سے سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع اور راعنا کہہ کر تم سے خطاب کرتے ہیں کہ اگر وہ سمعنا واطعنا اور (فقط) اسمع اور انظرنا کہہ کر خطاب کرتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات بھی سیدھی (سیدھی) ہوتی۔"

اس کے فائدہ میں حافظ صاحب لکھتے ہیں کہ یہود" حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر پیچدار اور ذومعنی باتیں کہہ کر گستاخی کرتے۔ یہاں تین باتوں کا مذکور ہے سمعنا وعصینا

جس کے معنی ہیں ہم نے آپ کا فرمانا سنا مگر تسلیم نہیں کیا۔ دوسری بات اسمع غیر مسمع ہے۔ اسمع کے معنی ہیں کہ ہم جو عرض کرتے ہیں،آپ اس کو بھی تو سنئیے ۔ یہاں تک مضائقہ کی بات نہیں مگر اس کے ساتھ وہ غیر مسمع بھی بڑھاتے جو کلمہ دعائیہ ہے اور کو سنا بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں کہ خدا تم کو نہ سنوائے ۔مگر کیا نہ سنوائے ؟ دوست ہو تو اس کی یہ مراد ہوگی کہ تم کو کسی سے سخن بد سننے کا اتفاق نہ ہو۔اور دشمن ہوگا تو یہ نیت رکھے گا کہ خدا کرے تم بہرے ہوجاؤ۔ تیسرا لفظ راعنا اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ہم تمہیں سمجھے ہماری خاطر سے پھر فرمائیے اور دوسرے معنی ہوتے ہیں ، اے احمق ، شیخی باز، اور اگر عین کو ذرا کھینچ کر کہہ دیا تو معنی ہوگئے اے ہمارے گڈریئے یا چرواہے۔ خدا نے فرمایا اگر یہ شریر لوگ اپنی شرارت سے باز آتے اور عصینا کی جگہ اطعنا(جس کے معنی ہیں ہم نے مانا اور تسلیم کیا) اور اسمع غیر مسمع کی جگہ صرف اسمع اور راعنا ک جگہ انظرنا (اس کے بھی وہی معنی ہیں ہماری خاطر سے ذرا پھر فرمائیے) کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔"

اب معلوم ہوگیا کہ اس آیت کو تحریف کُتب مقُدسہ کے دعوےٰ سے کچھ بھی لگاؤ نہ تھا۔ مگر علامہ بٹالوی مرحوم نے بیدھڑک تحریف کا بازار گرم کردیا۔ لفظ کلمہ جس کے معنی محض" بول " ہیں خواہ انسان کے خواہ شیطان کے خواہ رحمان کے۔ اس کا ترجمہ آپ نے "خدا کا بول" کردیا۔اوراس کی تفسیر میں "آیات وکلمات" فرمادیا تاکہ کسی طرح توریت وزبور وانجیل پرآپ کو زبان کھولنے کا موقع مل جائے، حالانکہ وہاں یہودیوں کے بعض افراد کی شرارت کا ذکر ہے جو رسولِ عربی کی بات کو ٹھکانے سے بے ٹھکانے کیا کرتے تھے۔ اس الکتاب سے کیا تعلق ؟

(۴۔) ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔" یہودیوں کی عہد شکنی کے سبب ہم نے ان کو پھٹکارا اوران کے دلوں کو سخت کردیا ہے وہ خدا کے بول اپنے ٹھکانے سے بدلتے ہیں، اور نصیحت سے فائدہ لینا بھول گئے ہیں۔ توہمیشہ ان کی خیانت (یعنی کتاب میں ادل بدل) دیکھتا رہے گا۔ بجز تھوڑے لوگوں کے ان میں سے۔

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَنَسُواْ حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُواْ بِهِ وَلاَ تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىَ خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلاَّ قَلِيلاً مِّنْهُمُ" مائدہ ع ۱۳)

جس الزام کی صراحت اس سے پہلی آیات میں آچکی اس جگہ تکرار ہے۔ مولوی صاحب یہاں بھی تحریف معنوی کرکے الکلمہ کے معنی" خدا کے بول" لگاتے ہیں، اور جس بات کا بار ثبوت آپ پر ہے یعنی" کتاب میں ادل بدل"اس کو لفظ خیانت کی تاویل میں فرض کرلیتے ہیں ۔ جس سے عیاں ہے کہ تصدیق کُتب پر تو نصوص قرآنیہ شاہد ہیں۔ مگر تحریف کُتب پر معترضین کی تاویل باطلہ۔

(۵۔)ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔" یہودیوں میں بعض جاسوسی کرتے ہیں۔جھوٹ بولنے کو وہ جاسوس ہیں۔ دوسروں کو جو تیرے پاس نہیں آئے وہ خدا کے بول بدل ڈالتے ہیں اس کی جگہ مقرر ہونے کے بعد " وَمِنَ الَّذِينَ هِادُواْ سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِن بَعْدِ مَوَاضِعِهِ (مائدہ ۴۱)

مولوی صاحب الزام تو اہل کتاب کو تحریف کا دیتے تھے، مگر دراصل کلام اللہ میں تحریف خود کرتے ہیں۔ الکلمہ کوالکلمہ اللہ ہر جگہ بتاتے ہیں۔ شاہ عبد القادر صاحب اس فقرہ کا ترجمہ فرماتے ہیں ۔" بے اسلوب کرتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانا چھوڑ کر" اور اس کے فائدہ میں لکھتے ہیں۔" بعض منافق تھے، کہ دل میں یہود سے ملتے تھے اور بعضے یہود تھے کہ حضرت پاس آمدورفت کرتے تھے۔ اللہ نے فرمایا، کہ یہ لوگ جاسوسی کو آتے ہیں کہ تمہارے دین میں

کچھ عیب چن کرلے جاویں اپنے سرداروں پاس جو یہاں نہیں آتے اور فی الحقیقت عیب کہاں ہے لیکن بات کو غلط تقریر کرکے ہنر عیب کرتے ہیں۔"

صاحب مدارک فرماتے ہیں۔ ومعنی سمعون الکذب یسمعون منک لیکذ بوعلیک بان مسخوا ما سمعوا بالزیادۃ والنقصان والتبدیل والتفسیر ۔ یعنی جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کی خاطر، اس کے معنی یہ ہیں۔ وہ تیری باتیں سنتے ہیں تاکہ تیرے اوپر باندھیں بایں طور کہ بدل ڈالیں جو کچھ تجھ سے سن گئے یعنی اس کے اندر زیادتی کریں اور کمی اور تبدل اور تغیر کریں۔" اور یہ معنی تفسیر حسینی میں بیان کئے گئے ۔" یہودی لوگ آنحضرت کے کلام کو سن کر باہر نکلتے اور لوگوں سے کہتے کہ ہم نے محمد سے یہ کچھ سنا حالانکہ انہوں نے وہ نہیں سنا ہوتا۔"

علامہ بٹالوی کے شواہد خمسہ کے ضعف کو دیکھ کر اب ذرا بھی شک نہیں رہا کہ قرآن شریف کے اندر ایک لفظ نہیں جس سے اس کی اُن آیاتِ بینات میں سرموفرق پیدا ہوسکے جو تصدیق کُتُبِ مقُدسہ پر ہم لکھ چکے ہیں۔ دعویٰ تحریف تو دراصل تکذیب قرآن ہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب بعض معترضین جو زیادہ باخبر بننا چاہتے ہیں، اس قسم کی آیات کو جن پر ہمارے مولوی صاحب زور دیتے تھے پیش کرتے شرمانے لگے ہیں۔ بلکہ ان کو تو یہ فکر دامنگیر ہوگئی ہے کہ اس کی کوئی وجہ سوچ نکالیں کہ اگر کُتُب مقُدسہ محرف ناقابل اعتبار تھیں تو پھر قرآن نے ان کی اس قسم کی بے اعتباری کا اعلان کیوں نہ کیا۔ اور الٹا تصدیق کا نقارہ کیوں بجادیا۔

مولوی صاحب پیغام محمدی میں لکھتے ہیں۔" اگر یہ کہے کہ قرآن مجید میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ ان کتابوں میں غلط ملط ہے اور اگر یہ امر واقعی تھا، تو جس طرح ان کتابوں کی تعریف کی تھی اسی طرح ان کا مخلوط ہونا بھی بیان کرتا تاکہ خلقت ان سے پرہیز کرتی ۔ یہ شبہ بھی محض ناواقفی کی وجہ سے ہے کیونکہ اول تو یہ ضروری نہیں کہ جو امر واقعی ہو اسے بیان ہی کردیا جائے ۔ دیکھئے حضرت مسیح اور حواریوں نے سامریوں کو کہیں تحریف کا الزام نہیں دیا[1] حالانکہ انہوں نے عیبال کو گرزم بنالیا۔ پھر اگر اس کا قول صحیح ہو تو سامری کہہ سکتے ہیں کہ ہماری کتاب صحیح ہے کیونکہ مسیح نے ان کی کتاب کو غلط نہیں بتایا اور لطف یہ کہ حضرت مسیح کا سکوت ایسے محل پر ہے جہاں بیان کرنا ضرور تھا، کیونکہ سامر یہ عورت نے آکر دریافت کیا کہ ہمارے باپ دادوں نے اس پہاڑ پر سجدہ کیا اور تم کہتے ہو کہ وہ مقام جہاں چاہیے کہ لوگ سجدہ کریں یروشلیم میں ہے۔ اس کے جواب میں سیدنا مسیح نے یہ نہ کہا کہ تمہارے نسخہ میں تحریف کی گئی ہے صحیح یہی ہے کہ وہ مقام یروشلیم میں ہے بلکہ یہ کہا کہ اے عورت میری بات کو سچ جان کہ وقت آتا ہے کہ تم نہ تو اس پہاڑ پر اور نہ یروشلیم میں سجدہ کروگے (دیکھو یوحنا باب ۴ آیت ۲۰، ۲۱) پھر جب ایسے بھاری سکوت سے سامریوں کے نسخہ کی صحت ثابت نہیں ہوئی تو قرآن مجید کے سکوت سے کُتُب سابقہ کا غیر مخلوط ہونا کس وجہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔" صفحہ ۵۶۔

اعتراض تو نہایت ہی معقول اور پختہ ہے اور ایسا لاجواب کہ مولوی صاحب نے جان بچانے کو چند غیر متعلق باتیں سنا کر قارئین کو بہلادیا۔ لیکن بہر حال یہ امر مسلمہ رہا کہ عیسائیوں کی کتابوں کی تعریف میں قرآن نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھار کھا اور ان کا مخلوط ہونا ہر گز بیان نہیں کیا اور ہماری کلُ بحث کی بنیاد یہی حقیقت ہے جو تسلیم کرلی گئی۔

ہم معترض کے الزامی جواب کو کچھ تفصیل کے ساتھ پرکھیں گے کیونکہ یہ آخری حیلہ ہے ہم نہیں چاہتے کہ اب ان کے لئے کوئی بہانہ چھوڑدیں۔

ایک حد تک تو یہ قول بجائے کہ " یہ ضرور نہیں کہ جو امر واقعی ہو اسے بیان ہی کردیا جائے ۔" لیکن اگر کسی شے کی تعریف میں صداقت کے ساتھ زبان کھولی جائے اور بار

---

[1] ہم نے اس کتاب کے حصہ اول کے باب چہارم کی فصل دوم میں سامری تورات کا مفصل ذکر کرکے بتلایا ہے کہ اس نسخہ میں اور مروجہ عبرانی توریت میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے ۔ سامری توریت میں کوئی تحریف واقع نہیں ہوئی ۔ (برکت اللہ)۔

بار تعریف کی جائے تو ممکن نہیں کہ اسی موقع پر اس کا عیب ظاہر کردینے میں قصور کیا جائے ورنہ

اگر بینم کہ نابیناوچاہ است
اگر خاموش بنشیم گناہ است

کا معاملہ ہوجائے گا اور ہم بلا پس وپیش کہتے ہیں کہ اگر سیدنا مسیح نے کبھی سامریوں کی توریت کا ذکر کے اس کی نسبت اس قسم کی تعریفی شہادت دی ہے :
فیہا ھدیً و نور یا مصدقاً لما معکمہ یا ما انزل الیکمہ وغیرہ تو ہم کو وہ کتاب سرتا پا برحق ماننا پڑے گی اوران باتوں کو جو اس کے خلاف مشہور ہیں رد کرنا ہوگا۔ لیکن اگر ہم پر یہ کھل جائے کہ توریت سامری واقعی ناقابلِ اعتبار تھی تو پھر ہم کو خواہ ہزار افسوس وحسرت ہی سے سہی یہ کہتے بھی تامل نہ ہوگا کہ سیدنا مسیح نے اس کتاب کی بے جا تعریف کی۔ ان سے حقیقت الامر پوشیدہ رہی ۔یعنی ہم آپ کے قول کو خلاف تحقیق پاکر نامقبول کریں گے اور ہر گز اس کے حق ماننے پر اصرار نہ کریں گے اور یہی روش حق پژدہی کی ہے جس کی ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے بھی سفارش کرتے ہیں۔

اب معترضین ہی ہم کو بتلائیں کہ سیدنا مسیح نے سامریوں کی توریت کا ذکر ہی کب کیا؟ اوراس کی تصدیق یا تعریف میں کب زبان کھولی؟ پھر جس کے وجود ہی سے آپ نے اصلا اعتنا نہ کی اس کی تعریف یا تکذیب سے سکوت بجا تھا۔ آپ نے جہان کی اور کتابوں مثلاً وید، ژندواوستا وغیرہ کی نسبت بھی کبھی کچھ نہیں فرمایا۔ پس آپ کے سکوت سے تو کوئی نتیجہ موافق یا مخالف امر واقعی کے نہیں پیدا ہوتا۔ پس مولوی صاحب کا الزامی جواب محض ردی ہے۔ یہ سچ ہے کہ حضرت مسیح نے اور حواریوں نے سامریوں کو کہیں تحریف کا الزام نہیں دیا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ سامری تورات میں کوئی حقیقی فرق رونما نہ ہوا تھا۔

ہم کو معترض کی یہ توقع بھی نہایت سادہ لوحی کی معلوم ہوتی ہے کہ جب ایک سامری عورت نے (جس نے بالیقین نہ سامری توریت دیکھی تھی اور نہ یہودی توریت اور جو کتابی اختلاف کو نہ سمجھی تھی اور نہ سمجھنے کی قابلیت رکھتی تھی، آپ سے ایک سادہ سوال کیا کہ پرستش اس پہاڑ پر واجب ہے یا اس پہاڑ پر تو سیدنا مسیح کو اس کے سامنے توریتیں پر خطبہ سننا چاہیے تھا ، خاص کر ایسے وقت جب آپ تمام پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کو اٹھانے آئے تھے یعنی ان ظاہری رسوم سے لوگوں کی گردنیں چھڑانے اور روح اور راستی کی پرستش قائم کرنے آئے تھے۔ پس آپ نے ایسی الجھن دوسروں کے لئے چھوڑ کر عورت کو اپنے دین کا اصل الاصول بتلادیا جس سے یہودیوں اور سامریوں دونو کی غلطی اوران کے بعد ان کے روحانی جانشینوں کی غلطی بھی فاش ہوجاتی ہے۔" اے عورت مجھ پر یقین لاکہ وہ گھڑی آتی ہے کہ تم نہ تو اس پہاڑ پر اور نہ یروشلیم میں باپ کی پرستش کروگے۔ تم اس کی جسے نہیں۔۔۔ جانتے ہو پرستش کرتے ہو ہم اس کی جسے جانتے ہیں پرستش کرتے ہیں ، کیونکہ نجات یہودیوں میں سے ہے۔ پر وہ گھڑی آتی ہے بلکہ ابھی ہے کہ سچے پرستار روح اور راستی سے باپ کی پرستش کریں گے۔ کیونکہ باپ ایسے پرستاروں کو چاہتا ہے۔"

جس عبارت کو جلی حروف میں لکھاہے اور جس کو معترض نے ترک کردیا جان بوجھ کر یا نا سمجھی سے اس میں سیدنا مسیح نے صاف صاف اعلان کردیا کہ سامریوں کی پرستش نادانی یعنی جہل و تعصب اور عناد پر مبنی تھی۔ اور یہودیوں کی پرستش ان کے آباواجداد کے دستور اور قومی جذبات پر ۔ اوراس کا اشارہ صریحاً اختلافِ سجدہ گاہ کی طرف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ روح اور راستی سے حقیقی پرستش نہ غرزیم پہاڑ پر اور نہ یروشلیم پر ہو گی کیونکہ حقیقی پرستش کا تعلق زمان ومکان کے ساتھ نہیں ہے۔

اب ہم پھر معترضین سے اسی سوال کا معقول جواب مانگتے ہیں کہ قرآن مجید نے کُتبِ یہود و نصاریٰ کی ثنا اور صفت بدرجہ کمال خوب جی کھول کر بیان کردی۔ اگران میں

کوئی عیب تھا، اور وہ عیب بھی ایسا جس کے تم لوگ مدعی ہو جس سے وہ کتابیں بالکل ردی ہوجاتی ہیں تو اس کو بھی کیوں کھول کر نہ بیان کردیا؟

اسی کا جواب ایمان سے یہی دیا جاسکتا ہے کہ ان کُتُب مقُدسہ سابقہ میں کوئی عیب نہ تھا یا اگر تھا تو اس سے خدا جو مصنف قرآن ہے بالکل بے خبر تھا اور اس کا رسول بھی جو ان کتبِ سماوی یعنی مجموعہ بائبل کو سرتا پا برحق جانتا تھا اور اسی پر اس نے گواہی دی۔

List of Books

The Following Books have been consulted in the Preparation of this Edition.

---

1. Albright, F. The Archaeology of Palestine. (Penguin Books) 1956.
2. Albright. Recent Discoveries in Bible Lands.1955
3. Allegro, J.M. The Dead Sea Scrolls. 1961
4. Burrows. The Dead Sea Scrolls. 1955
5. Burrows, M. More Light on The Dead Sea Scrolls.1955
6. Bruce. F.F"Qumran & Early Christianity" in New Testament Studies. II (1955-56)
7. The New Bible Dictionary.
8. Bruce.F.F The Books and the Parchments. 1950.
9. Bruce.F.F Second Thoughts on the Dead Sea Scrolls.1956
10. Bruce. F.F. The Teacher of Righteousness in the Qumran Texts. 1957.
11. Bruce. F.F Biblical Exegesis in the Qumran Texts.1960.
12. Bruce.F.F The New Testament Documents.1963
13. Black. M.The Scrolls & Christian Origins.1961
14. Bell. Skeat. Fragments of an Unknown Gospel and other Early Christian Papyri.
15. Beginnings of Christianity.Vols 1-4
16. Bell. Recent Discoveries of Biblical Papyri.1937
17. Bowman, Verse Omissions from the Revised Urdu New Testament .1929
18. Burrows. What mean these Stones?
19. Criticism of the New Testament .(Lec.1,2,3)
20. Cambridge Bible Essays.(Essays6,14,15)
21. Cross,F.M.The Ancient Library of Qumran & Modern Studies.(1958)
22. Driver, Introduction to the Literature of the New Testament.
23. Dodd.C.H. The Bible & the Greeks.1934
24. Encyclopedia. Biblica.
25. Filson, The Origin of the Gospels.

58. Sweet.L.M. New Testament Quotations. (International Standard Bible Encyclopedia(1949)
59. Stendahl.K…The Scrolls and the New Testament 1957
60. Sommer Dupont, The Dead Sea Scrolls A Preliminary Survey.
61. Smyth Paterson, The Old Documents and the New Bible.
62. Smyth Paterson, How we got Our Bible.
63. Smyth Paterson. Our Bible and Ancient Documents.
64. Smyth Paterson. Our Bible in the making.
65. Smith. Dictionary of the Bible.
66. Streeter, B.H.The four Gospels.1924
67. Stanton, H.U.W, The Urdu New Testament.
68. Thompson,J.A The Bible & Archaeology.1962
69. Tasker,R.V.G Our Lord's Use of the Old Testament 1953
70. Tasker. R.V.G The Old Testament in the New Testament 1954.
71. The Talmud.
72. Tischendorf, Codex Sinaiticus.
73. Wilkgren. A.P. New Testament Manuscript Studies.1950
74. Wilson, E,, The Scrolls from the Dead Sea .1960
75. Wade, New Testament History.

Barakat Ullah.

Wayside Cottage.
Mussoorie.

August.16.1964

26. Gregory, The Canon and Text of the New Testament.
27. Gore, Commentary on the Holy Scriptures.
28. Gaster. H. The Scriptures of the Dead Sea Sect.1957.
29. Henry, C.F.H. Our Lord's Use of Scripture.1959
30. Henry, Revelation and the Bible, (Bruce's Art." Archeological Confirmation of the New Testament.)
31. Hastings. Encyclopedia of Religion & Ethics.
32. Hastings, Dictionary of the Bible (One Vol)
33. Hastings, Dictionary of the Christ and the Gospels.
34. Hastings, Dictionary of the Bible (5 Vol)
35. Johnson, F. Quotations. Of New Testament from the Old Considered in the Light of General Literature.
36. Josephus. Against Apion.
37. Kenyon, The Bible and Modern Scholarship.
38. Kenyon, The Story of the Bible.
39. Kenyon, The Textual Criticism of the New Testament.
40. Kenyon, The Bible & Archaeology.
41. Kenyon. Our Bible and Ancient Manuscripts.1958
42. Kirk Patrick. The Divine Library of the Old Testament.
43. Kemmerer. W.A Coptic Bibliography.1950
44. Lake,K.The Text of the New Testament.(6th Edition 1933)
45. Mount Sinai Manuscript of the Bible.
46. Me Neal. Introduction of the Study of the New Testament.
47. Marston, The Bible is True.
48. New Testament in the Apostolic Father.1905
49. Peake, Commentary of the Bible.
50. Peake's Revised Commentary of the Bible.
51. Peake, The Bible, Its Origin, Significance & Abiding worth.
52. Petrie, Palestine & Israel.
53. Ramsay, W. The Bearings of Recent Discovery on the Trustworthiness of the New Testament 1915
54. Roberts. B.J. The Old Text and versions.1951
55. Roberts.C.H.An Unpublished Fragment of the Fourth Gospel.1935
56. Rowley.H.H. The Dead Sea Scrolls & The New Testament 1957
57. Robinson, Introduction to the Textual Criticism of the New Testament,1928